بلیک ورڈس
سلسلۂ
روز و شب
ڈاکٹر سلیم خان
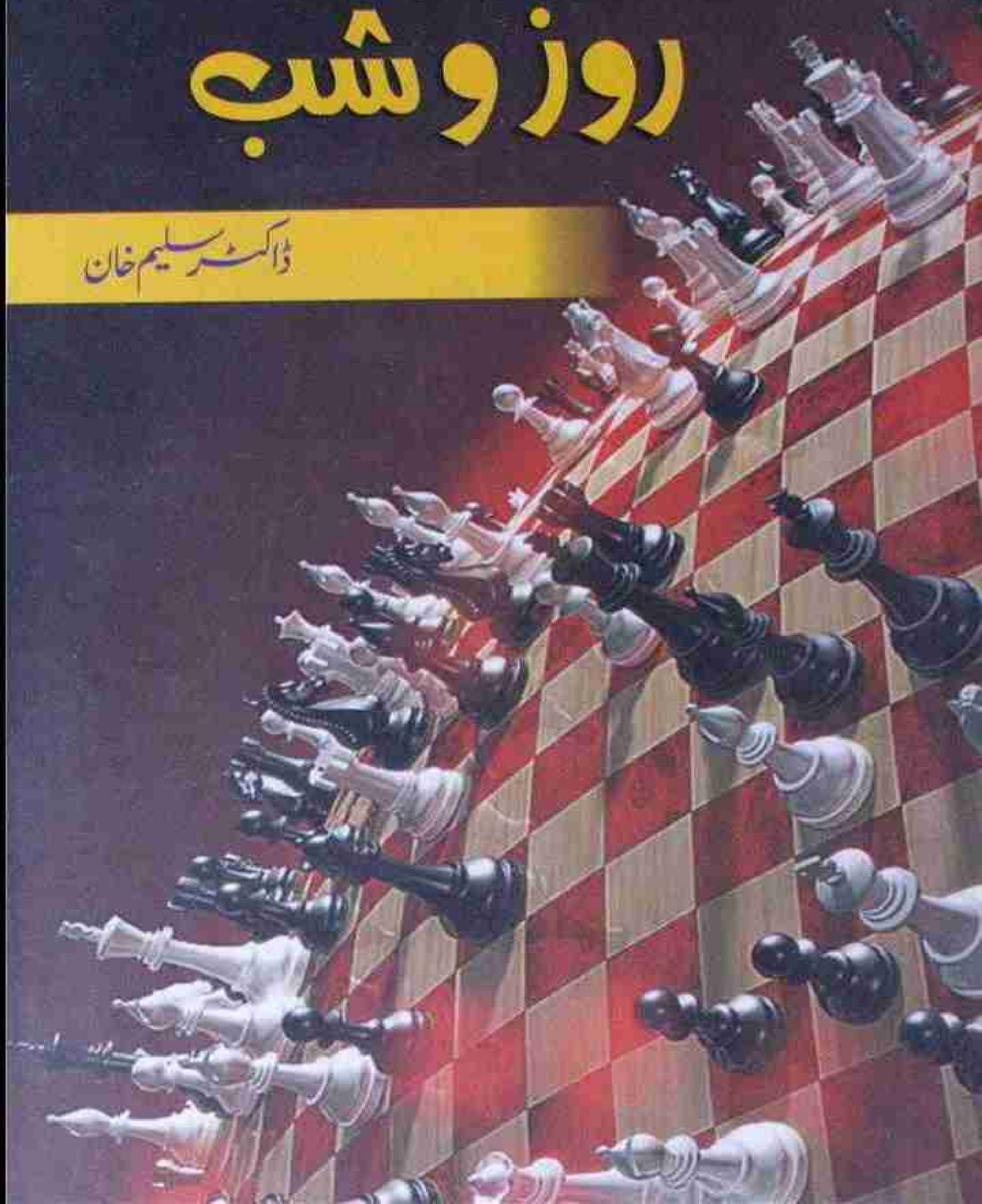
## افسانوی مجموعہ "حصار" پر ایک نظر

ڈاکٹر سلیم خان کے افسانوں کا بنیادی وصف ان کی دلچسپی کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہونے میں ہے۔ ہر افسانے میں کسی نہ کسی حد تک قصے کا سا چٹخارہ ہم آمیز کر دیا گیا ہے۔ افسانہ شروع ہی کسی واقعے کا تصویری پس منظر بیان کرنے سے ہوا ہے۔ واقعے کی باطنی کیفیت کے مطابق فضا سازی کی گئی ہے اور جو ماحول تخلیق کیا گیا ہے، اس میں سکوت نہیں بلکہ حرکت اور عمل کی کارفرمائی ہے۔

- انور قمر

"حصار" کے بیشتر افسانے انطباعاتی اور تاثراتی اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ افسانہ نگار کا بیانیہ تجریدیت کی ژولیدگی اور ابہام کی پیچیدگی سے پاک ہے۔ بعض کہانیوں میں تمثیل نگاری سے کام لیا گیا ہے، جو کہانی کو تہہ دار بنا دیتی ہے۔ ان کہانیوں میں پلاٹ، کردار اور مکالمے یعنی روایتی کہانی کے سارے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

- سلام بن رزاق

"بالِ جبریل، بانگِ درا" اور "کارِ جہاں دراز ہے" سے "حصار" تک ہر کتاب میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ہم اب تک قدرت اللہ شہاب، سردار جوہر، انجم فوقی بدایونی، ممتاز مفتی، مختار مسعود، ادا جعفری اور شاہنواز فاروقی کی نثر کے معترف تھے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ ڈاکٹر سلیم خان بھی اسی میدان کے شہسواروں میں سے ہیں۔

[عالم نقوی، مدیر اعلیٰ اردو ٹائمز]

# سلسلۂ روز و شب

ڈاکٹر سلیم خان

بلیک ورڈس پبلیکیشنز

یہ کتاب اردو سافٹ ویئر ان پیج پروفیشنل کے اوریجنل ورژن میں ٹائپ کی گئی ہے۔

نام کتاب : سلسلۂ روز و شب (مجموعۂ مضامین)

مصنف : ڈاکٹر سلیم خان

پتہ : سیکنڈ حسن آباد لین، اے ٹسر کوئین۔ ۳، سانتا کروز، ممبئی۔ ۵۴

فون: 00971504453768 (ابوظبی)

91-9820992162 (ممبئی)

ای میل: drsalimkhan@gmail.com

دیگر تصانیف : حصار، سکندر کا مقدر، گھر سنسار، گردشِ ایام

ناشر : بلیک ورڈس پبلی کیشنز

G-03، اقصیٰ اپارٹمنٹ، نزد سن رائز ٹاور، شیل، پوسٹ: ڈاولہ،

تھانے۔ ۴۰۰۶۱۲، فون: 09768340782

اشاعت : اپریل ۲۰۱۲ء

سرِورق : جاوید یوسف

کمپیوگرافی وطباعت : غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس، ممبئی

contact.ghazali@gmail.com

قیمت : ۲۵۰/روپے

ملنے کے پتے بلیک ورڈس پبلی کیشنز، تھانے

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، علی گڑھ اور ممبئی

سیفی بک ایجنسی، امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔ ۳

کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر محلہ، ممبئی۔ ۸

صدیقیہ بک ڈپو، محمد علی روڈ، ممبئی۔ ۳

# انتساب

میرے محسن و کرم فرما

## عالم نقوی صاحب

کے نام

عصرِ حاضر میں ان کو دیکھنے پر قرآن مجید کی یہ آیت یاد آتی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَسَوْفَ يَأْتِى ٱللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ أَذِلَّةٍ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ يُجَٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ (المائدہ ۵۴)

# فہرست

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| ۱۵ | لال چوک پر ترنگا اور لال قلعہ پر بھگوا | ۱۰۶ |
| ۱۶ | ہندوتوا کی نفسیات اور اسلام کی دعوت | ۱۱۲ |
| ۱۷ | اختلافات کے چکرویوہ میں نام نہاد مختلف پارٹی | ۱۱۹ |
| ۱۸ | بی جے پی کی رامائن سے مہابھارت کی جانب رتھ یاترا | ۱۲۵ |

## عالمِ اسلام

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| ۱۹ | جب تاج اچھالے جائیں گے، جب تخت گرائے جائیں گے | ۱۳۱ |
| ۲۰ | بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے | ۱۳۸ |
| ۲۱ | سنگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری قدرت کیا | ۱۴۴ |
| ۲۲ | میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب | ۱۵۲ |
| ۲۳ | نگاہِ انساں کو آج فطرت نئے مناظر دکھا رہی ہے | ۱۵۷ |
| ۲۴ | کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے | ۱۶۳ |
| ۲۵ | تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینیوا | ۱۶۹ |
| ۲۶ | ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی | ۱۷۶ |
| ۲۷ | پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا | ۱۸۱ |
| ۲۸ | جمہوریت کی سفاک سیاست | ۱۸۶ |

## عالمِ شرق و غرب

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| ۲۹ | گرد چہرے پر جمی تھی آئینہ دھوتے رہے | ۱۹۵ |
| ۳۰ | وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے | ۱۹۹ |
| ۳۱ | یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں | ۲۰۶ |
| ۳۲ | مری وفا پہ کبھی انحصار مت کرنا | ۲۱۳ |
| ۳۳ | جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا | ۲۲۱ |

خراج عقیدت: مولانا محمود عالم

# روتا چھوڑ کے ہنستا کھیلتا جانے والا ایک مسافر

مولانا محمود عالم جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ شہر ریاض سے کئی دوستوں نے یکے بعد دیگرے ۲۴ مارچ ۲۰۰۷ء کو فون پر موصوف کی موت کی اطلاع دی۔ ایک نے پوچھا 'سلیم! تم ریاض کب آؤ گے؟' میں نے کہا 'اب میں ریاض نہیں آؤں گا۔' اب کیوں آیا جائے۔ جس سے ملنے کا اشتیاق ریاض لاتا تھا وہ وہاں سے کوچ کر گیا اور اُس مقام محمود پر فائز ہو گیا جو خالق کائنات نے اپنے خاص بندوں کے لیے مختص کر کے رکھا ہوا ہے۔ مولانا محمود عالم سے پہلے بھی میرے کچھ دوستوں کو وادیٔ اجل سے بلاوہ آیا لیکن اُس وقت اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ بے وقت کی موت ہے۔ حالانکہ ایسا کہنا احکم الحاکمین کے فیصلے میں مداخلت کے مترادف ہے۔ اس بار ایسا کم لوگوں نے کہا۔ گویا مولانا جاتے جاتے یہ احساس دلا گئے کہ میاں اب اس دارِ فانی میں بچھڑنے اور بسنے کی مدت ختم ہوا چاہتی ہے۔ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ تیاری کرو، دفتر باندھو اور انتظار شروع کرو۔ اپنے محبوبِ حقیقی سے ملاقات کا انتظار۔ رفیقِ اعلیٰ کی رفاقت کیسی ہوتی ہے؟ انتظارِ وصل کسے کہتے ہیں؟ اس کا درس مولانا محمود عالم جاتے جاتے دے گئے۔ وطن واپسی کا اشتیاق کیسا ہوتا ہے یہ ہم جیسے پردیسیوں سے زیادہ کون جانتا ہے۔ جب دیس بلاتا ہے تو انسان پر لگا کر ہوا کے دوش پر سوار ہو جاتا ہے۔ پردیس کی ہر شئے اجنبی ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ خود ان سب سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور دیوانہ وار نکل پڑتا ہے۔ مولانا محمود عالم صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو شعوری طور پر واپسی کا ٹکٹ ہمیشہ ہی اپنی جیب میں رکھتے تھے۔ دمِ واپسی سے ایک دن قبل انہوں نے میرے اور اپنے ایک مشترکہ دوست نذیر رومانے کو بتلا دیا تھا کہ میں نے بورڈنگ کارڈ لے لیا ہے، کلمہ پڑھ لیا ہے۔ بچے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اب کسی معالج کی حاجت نہیں کہ موت کسی بیماری کا

نام ہے۔ کسی دوست کو نہ بتاؤ کہ مجھے اُس دوست نے بلایا ہے جس نے بھیجا تھا اور جس کی دید کو آنکھیں ترپتی ہیں۔ یہ کائنات اللہ رب العزت نے فرشتوں اور جنوں کے لئے بنائی اور اس کے نظام اور انصرام پر انہیں مامور فرمایا۔ لیکن جنت انسانوں کے لئے اور انسان کو جنت میں رہنے و بسنے کے لئے، اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے، اس دنیا میں بھیجنے سے قبل وہاں رکھا۔ جس طرح دنیا صدیوں کی رہائش بے وطن کو مواطن نہیں بناتی اسی طرح لمحوں کی دنیاوی زندگی، سانسوں کا یہ بندھن، دل کی یہ دھڑکن کسی کو ثبات نہیں اور اس بے ثباتی کا خاتمہ دراصل اختتام نہیں بلکہ افتتاح دل پذیر ہے۔ بقول اقبالؔ۔

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

مولانا محمود عالم ان لوگوں میں سے تھے جن کا ذکر اس شعر میں ہے۔ ان پر اسرار بندوں میں سے جنہیں معرفتِ حق کا شرف حاصل ہوتا ہے، جو جان لیتے ہیں کہ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے، موت محض ایک پردہ ہے، اس دنیا میں زندگی سے تو ہر کس و ناکس آنکھیں چار کرتا ہے لیکن دور رس نگاہیں پسِ چلمن مناظر دیکھتی ہیں۔ موت سے آنکھیں ملا کر آگے نکل جاتی ہیں اور مالک کے پوشیدہ منصوبے سے واقفیت حاصل کر لیتی ہیں گویا حق آشنا ہو جاتی ہیں۔ یہی معرفت انہیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ بقول اقبالؔ۔

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

دلِ آشنا کو دستِ حق پرست سے وہ استغنا عطا ہوتا ہے جو اس جہانِ فانی کو متاعِ غرور بنا دیتا ہے۔ اس بے وقعت شئے کے چھوٹ جانے کا اسے قطعی ملال نہیں ہوتا اس لئے اس کی نظر پیچھے رہ جانے والے راستے پر نہیں بلکہ آگے آنے والی منزل پر ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ سماعت ان استقبالیہ کلمات سے لطف اندوز ہونے لگتی ہے جس کے بارے میں فرمایا "اے نفسِ مطمئنہ! چل اپنے رب کی جانب، اس حال میں تُو اس سے راضی اور وہ تجھ سے رضامند۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا جنت میں۔" اپنی تخلیق کے لحاظ سے تو ہر کوئی ایک ہی ذات بے ہمتا کا بندہ اور غلام ہے لیکن ہر کسی کو اس کا بندہ کہلانے کا شرفِ عظیم حاصل نہیں ہوتا۔ جو نفس کا بندہ بن جائے، مال و زر کی بندگی کرنے لگے یا بندوں کی بندگی اختیار کر لے اسے اسفل السافلین کے درجے میں ڈال دیا جاتا ہے لیکن وہ سعید روحیں جو رب سے ملاقات کا یقین رکھتی ہیں، شرفِ ملاقات کی کی متمنی ہوتی ہیں، پل پل اس کا انتظار کرتی ہیں، ان کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ مولانا محمود عالم صاحب انتظار کی

ان حسین گھڑیوں کو معالجین کے کڑوے کسیلے نسخوں اور دوست واحباب کے اندیشوں اور مشوروں کی نذر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان بے فائدہ چیزوں کے احتیاج سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ اسی لئے انہوں نے نذیر صاحب کو منع کر دیا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ انہوں نے کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ انہیں لذت نظارہ سے محروم کرے۔

یوسف رحیم نے فون کیا اور بس روتے رہے دیر تک، پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر آنسوؤں کی طرح گرتے اور ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ میں نے فون بند کر دیا اور اداسی میں ڈوب گیا۔ سارا عالم سوگوار تھا لیکن محمود عالم نہیں۔ وہ سوگوار نہ تھے۔ ہم اس لئے رو رہے تھے کہ ہم نے انہیں کھو دیا تھا اور سارے ہاتھ خالی تھے۔ انسان اگر کسی چیز کو کھو دے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے یہ فطری عمل ہے۔ لیکن محمود عالم نے جو کھویا تھا اس سے بڑھ کر بدلہ پالیا تھا۔ 'داخل ہو جا میری جنت میں'، جن کانوں سے یہ اعلان ٹکرائے اسے رشتہ و پیوند کے بکھرنے کا غم کیونکر ہو۔ بقول اقبال ؎

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گمان لا الٰہ الا اللہ

محمود عالم صاحب وہم و گمان سے نکل کر خراماں خراماں، ایمان و یقین کی منزل میں داخل ہو گئے۔ وادیٔ اجل کے اس مسافر نے ابدی لباس زیب تن کیا اور کاغذی پیرہن کو نکال پھینکا۔ اس نقش فریادی کو ہم نے مٹی تلے دفن کر دیا کہ اس کا یہ حق تھا۔ مٹی کو مٹی میں ملنا تھا، سو جا ملی اور وہ روح جو رب نے پھونکی تھی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ہمارے ہاتھ مٹی بھی نہ آئی۔ آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اسے بھی وقت کی تپش نے ختم کر دیا۔

قرآن مجید میں حیات و ممات کی تخلیق کا ذکر کیا گیا تو ترتیب میں پہلے موت اور پھر حیات کو رکھا گیا اس لئے کہ حیات جاودانی موت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس پر موت غالب ہو جائے۔ اس دنیا کی فانی زندگی تو ابدی حیات کا معمولی سا مظہر ہے جس میں انسان کو خوشی و غم کا مزہ چکھایا جاتا ہے۔ بتلایا جاتا کہ یہ دیکھو جب دوزخ میں ٹیس اٹھے گی تو کیسا لگے گا۔ جب جنت میں عیش ملے گا تو کیا محسوس ہوگا۔ اس مدت قلیل کو حکماء اذان و نماز کے درمیان کے وقفے سے تعبیر کرتے ہیں کہ اذان بھی دوسرے دیتے ہیں اور نماز بھی دوسرے ہی پڑھتے ہیں۔ درمیان کی مہلت عمل نہ جانے کب شروع ہوتی ہے اور کیسے ختم ہو جاتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس دنیا میں جینا اور اس دنیا سے جانا ان دونوں میں صرف 'الف' اور 'ی' کا فرق ہے۔ دنیوی زندگی کی ابتداء اور انتہا ہے لیکن

اس کے بعد آنے والی زندگی بے انتہا ہے۔ وہاں موت نہیں، موت کو موت ہے۔ زندگی موت پر غالب ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو اس مختصر سے مہلتِ عمل کو ابدی کامیابی وکامرانی کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے مولانا محمود عالم ان لوگوں میں سے ایک تھے۔ دنیا کا معاملہ تو یوں ہے کہ جیسے ایک ماں اپنے بچے کو بہلانے اور ٹہلانے کی خاطر باغ میں اٹھا کر لائے اور وہاں پہنچتے ہی بچہ اپنی ماں کی گود سے نکل کر ادھر اُدھر بھاگنے دوڑنے، دوسرے بچوں سے ملنے جلنے لگے، ان کے ساتھ کھیلنے کودنے لگے اور ہارنے جیتنے لگے، ہنسنے رونے لگے۔ ایسا کرتے ہوئے اکثر بچے اپنی ماں کی ہدایات تو بھول جاتے ہیں اور کئی اسے بھی یاد رکھتے ہیں، ان کا پاس لحاظ بھی کرتے ہیں لیکن کھیل کا وقفہ لا متناہی نہیں ہوتا۔ سورج ڈھلنے لگتا ہے، شام کے سائے طویل سے طویل تر ہو جاتے ہیں۔ اب ہر بچے کو اپنی ماں کا خیال آتا ہے۔ باغ کے ساتھی، کھیل کود سب کچھ بیکار لگنے لگتا ہے۔ ایسے میں نافرمان بچہ نظریں جھکائے احساسِ ندامت لئے بوجھل قدموں کے ساتھ اپنی ماں کی جانب بڑھنے لگتا ہے کہ وہ مجبور ہے۔ لیکن فرمانبردار اور اطاعت گذار شوقِ ملاقات میں دوڑتا ہوا آتا ہے اور اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ ماں اسے سینے سے لگا لیتی ہے، تھکا ماندہ ہے، اپنے زانوں پر سلا دیتی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

حدیث میں نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میر تقی میر کہتے ہیں۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جس طرح اس دنیا میں ہنسنا رونا ہر بشر کا مقدر ہے اسی طرح جاگنا سونا بھی مقدر ہے۔ مولانا محمود عالم صاحب اپنے وقت پر سو گئے اور ہم میں سے ہر شخص، چاہے یا نہ چاہے، اپنی گھڑی کا منتظر ہے۔ ہماری آنکھوں کے بند ہونے کے اوقات مختلف ضرور ہیں لیکن روزِ محشر بیدار ہونے کا وقت یکساں ہے۔ صورِ اسرافیل سب کے لئے ایک ہی وقت پھونکا جائے گا اور ہم سب اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہونگے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس روز تم نے جس سے محبت کی ہوگی، تم اس کے ساتھ ہوگے۔ حضور پاک ﷺ کی اس بشارت میں ہم جیسے گناہگار بندوں کے لئے خاص بڑی خوش خبری ہے۔ اللہ رب العزت ہمارے دلوں کو اپنے رسولؐ کی اور اپنے خاص بندوں کی محبت سے بھر دے اور ہم سب کو حوضِ کوثر پر ایک دوسرے سے ملائے کہ ہم ایسی محبتوں سے سیراب ہوں جو کبھی ختم نہ ہوں۔ ہمیں اس طرح ملائے کہ پھر جدائی حائل نہ ہو۔ اس وقت تک اللہ رب العزت مولانا محمود عالم کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

# سلسلۂ روز و شب نقش گرِ کائنات

لیل و نہار کا سلسلہ گردشِ شمس و قمر کی مرہونِ منت ہے۔ سورج اور چاند کا نہ محور بدلتا ہے اور نہ رفتار ہی بدلتی ہے اس کے باوجود ان کی گردش سے عالمِ وجود میں آنے والا ہر دن اپنے گذشتہ اور پیوستہ سے کمیت اور کیفیت دونوں میں مختلف ہوتا ہے۔ ہر نیا روز اپنا جداگانہ وجود رکھتا ہے۔ اس کا دورانیہ اور موسم دونوں منفرد و مختلف ہوتے ہیں۔ مزید طرّہ یہ کہ چاند سورج اور زمین کی گردش سارے عالم پر یکساں اثرات مرتب نہیں کرتی۔ کسی کیلئے سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے تو کسی کا سورج روبہ زوال ہوتا ہے۔ اگر کہیں اندھیرا پھیل رہا ہوتا ہے تو کہیں پر روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ کسی علاقے میں گرمی کی تمازت لوگوں کو جھلسا رہی ہوتی ہے تو کہیں برف باری عذاب جان بن جاتی ہے اور تو اور کسی کے لئے موسم گرما نعمت بن کر آتا ہے تو کسی کیلئے زحمت۔ کوئی موسم سرما کے آنے کا انتظار کرتا ہے تو کوئی اس کے جانے کا، حالانکہ موسم کی یہ تبدیلی بھی اسی سورج اور زمین کی گردش کے سبب سے ہے جو سب کے لئے مشترک ہے۔ کائنات کے اس الٹ پھیر میں عقل رکھنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں ارشاد ربانی ہے۔

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقلِ سلیم والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (آل عمران ۱۹۰)

اللہ بزرگ و برتر نے کائناتِ ہستی میں حضرتِ انسان کی تخلیق احسن تقویم پر کی اور دیگر مخلوقات کو اس کے آگے مسخر کر دیا۔ گویا نباتات و جمادات سے لیکر چرند و پرند بلکہ ستارے اور سیارے، سورج و چاند بھی کو انسانوں کی خدمت پر معمور فرما دیا اور انسانوں کو ایک قلیل متاعِ حیات دے کر اس دنیا میں مختصر سی مدت کیلئے بھیج دیا نیز اس کے لئے مختلف حالات مقدر کر دیئے۔

روز وشب کا نہایت انوکھا نظام تشکیل فرما کر اس کے بطن سے نت نئے حادثات رونما کرنے کا انتظام کیا جن سے انسان آئے دن دو چار ہوتا رہتا ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

سلسلۂ روز وشب، نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روز وشب، اصلِ حیات وممات

انسانی زندگی کے اس سہانے سفر کو دلچسپ بنانے کی خاطر خالق کون ومکاں نے پیش آنے والے سارے مراحل کو طے فرما کر ان پر غیب کا پر جائے گا دہ ڈال دیا اور خود بھی عالمِ غیب چھپ گیا اور اپنی نشانیاں جا بجا بکھیر دیں جن کی مدد سے انسان از خود اپنے مالک وآقا کی معرفت حاصل کر سکتا تھا لیکن اس مہم میں آسانی کیلئے رحمٰن ورحیم نے انسانی نفس کو ہموار فرمایا اس کا تقویٰ اور فجور اس کے اندر الہام فرما دیا۔ اس کو علم وعرفان کی نعمت سے سرفراز کیا اور اپنے برگزیدہ پیغمبروں کا سلسلہ جاری فرما کر اپنے احسانات کا اہتمام فرما دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سارا کھیل کیوں رچایا گیا؟ اقبال اس کی دو وجوہات بیان فرماتے ہیں ؎

سلسلۂ روز وشب، تارِ حریرِ دو رنگ

جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز وشب، سازِ ازل کی فغاں

جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

اولاً دن اور رات کے ان سیاہ وسفید دھاگوں سے انسان اپنی صفات کا لباس بنتا ہے۔ اُسے آزادی ہے جیسا چاہے لباس زیب تن کر لے جو صفات چاہے اختیار کر لے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس روز وشب کی کشمکش انسانوں کو اس کے اندر پوشیدہ قوت عمل سے بھی آگاہ کرتی ہے جن کی مدد سے انسان ناممکن کو ممکن کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور ثقافتی وسائنسی ارتقاء پر رواں دواں ہے۔ اس مرحلہ میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ارتقاء کی غرض وغایت کیا ہے؟

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ

سلسلۂ روز وشب، صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار

موت ہے تیری برأت، موت ہے میری برأت

اللہ رب العزت کا فرمان ہے "ہم نے موت وحیات کو اس لئے تخلیق کیا تا کہ یہ دیکھیں تم میں

سے کون اچھے اعمال کرتا ہے' آزمائش کی خاطر یہ سب کیا گیا۔ انسانوں کو پرکھا جارہا تا کہ خود اسے اس بات کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جاسکے کہ وہ اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنانا چاہتا ہے یا جہنم رسید کرنا چاہتا ہے۔ ہادیٔ برحق رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے، ہر روز سارے نفوس اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور پھر اس سودے کے عوض کوئی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا لیتا ہے تو کوئی اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا دیتا ہے۔ گویا انسان اپنے نفس کو بیچ کر جو مہلتِ عمل حاصل کرتا وہی اس کی متاعِ حیات ہے۔ اس بیش بہا خزانے کی اگر وہ ناقدری کرتا ہے اور اسے ضائع کر دیتا ہے تو گویا اپنے آپ کو مٹا دیتا ہے اور اگر اس کا بیجا استعمال کرتا ہے تب تو گویا وہ اپنے آپ کو غضب کا مستحق بنا لیتا ہے۔ انسانی زندگی کو دینار و درہم میں نہیں ناپا جاتا اس کا سکہ رائج الوقت کچھ اور نہیں وقت ہے اسی اکائی میں اس کا حساب رکھا جاتا ہے اور اسی کسوٹی پر اسے پرکھا جاتا ہے کہ اس نے اپنے وقت کا استعمال کیسے کیا۔ اس صیرفیٔ کائنات پر اس کے فلاح و خسران کا دارومدار ہے۔

اور وہی خدا ہے جو تمہیں رات میں گویا کہ ایک طرح کی موت دے دیتا ہے اور دن میں تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے اور پھر دن میں تمہیں اٹھا دیتا ہے تا کہ مقررہ مدت حیات پوری کی جاسکے۔ اس کے بعد تم سب کی حاضری اسی کی بارگاہ میں ہے اور پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں باخبر کرے گا۔ (انعام ۶۰)

انسانی زندگی کو عام طور پر ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں تقسیم کر کے دیکھا جاتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان تینوں کی سرحدیں ایک دوسرے کے اندر اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو جدا کرنا ایک امرِ محال ہے۔ انسان دو پہیوں کی سواری ہے اس کا اٹھنے والا قدم جب زندگی کے ایک پرانے لمحے کو ماضی کے نہاں خانے میں پھینک رہا ہوتا ہے اسی وقت دوسرا قدم مستقبل کے خزانے سے ایک نیا لمحہ اچک رہا ہوتا ہے۔ گویا انسان بیک وقت ماضی اور مستقبل سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اس کے درمیان اس کا حال نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک وقت خاص تک جاری رہتا ہے اور اسے اچانک پتہ چلتا ہے کہ اس کے مستقبل کا خزانہ خالی ہو چکا ہے اور ماضی کا گوشوارہ بند کیا جا چکا ہے۔

وہ خدا وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر ایک مدت کا فیصلہ کیا ہے اور ایک مقررہ مدت اس کے پاس اور بھی ہے لیکن اس کے بعد بھی تم شک کرتے ہو۔ (انعام ۲)

اس آیت میں دو عدد مقررہ مدت کا ذکر کیا گیا ہے جب پہلی گھڑی آن کھڑی ہوتی ہے تو

انسانی زندگی کی بساط وقتی طور پر لپیٹ دی جاتی ہے ایسے میں اس کے احباب واقارب بادلِ ناخواستہ اسے کفن میں لپیٹ کر بڑے احترام کے ساتھ قبر کے حوالے کردیتے ہیں اور اس دارِ فانی میں آخری گھر کا دروازہ ایک اور وقتِ مقررہ کیلئے بند کر دیا جاتا ہے اس پر تختی تو لگتی ہے لیکن قفل نہیں لگایا جاتا اس لئے کہ نہ لوٹنے کا امکان ہوتا ہے اور نہ لٹنے کا اندیشہ۔ اس کے شب و روز بے حقیقت قرار پاتے ہیں اور اس کے کارہائے نمایاں دارِ فانی میں بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات!

گردشِ لیل و نہار ہی کی مانند زمانے کی رفتار بھی ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ اکثر و بیشتر وقت کا پہیہ اس قدر سست رفتار ہوتا ہے کہ لوگوں کو گمان ہونے لگتا ہے گویا سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے۔ لیکن پھر یہ کال چکر اچانک تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔ اس دور کی نسلوں کو بہت کم وقت میں بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ مثلاً ٹوینٹی ۔ ٹوینٹی کرکٹ کے زمانے میں ہوش سنبھالنے والے بچوں کا مشاہدہ ان بزرگوں سے خاصہ مختلف ہے جبکہ وہ صبر و سکون کے ساتھ پانچ دنوں کا ٹسٹ میچ دیکھتے تھے اور جو اکثر بلا نتیجہ برابری پر چھوٹ جاتا تھا۔

ہماری نسل جب ہوشمند ہوئی تو دیکھا عالمِ انسانیت دائیں اور بائیں بازو والوں میں منقسم ہے۔ ان کے علاوہ درمیان میں کئی بے دست و پا حکمراں، بادشاہ اور فوجی آمر ہیں جن کی تمام طمطراق بے سود ہے۔ حقیر فقیر اسرائیل، فلسطین کی آڑ میں پوری ملتِ اسلامیہ کو آنکھیں دکھلاتا ہے۔ لیکن پھر حالات نے ایک کروٹ بدلی اور اسرائیل و امریکہ کے سب سے بڑے ہمنوا شاہِ ایران کا تختِ طاؤس اہلِ ایمان نے الٹ دیا اور ساری دنیا ہکا بکا رہ گئی۔ اس نوزائیدہ چراغ نور کو پھونکوں سے بجھانے کی خاطر عالمی اتحاد وجود میں آیا سرخ و سفید کی تفریق کو مٹا دیا گیا لیکن اس کی روشنی قائم و دائم ہی رہی پھر اس کے بعد چشمِ فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ افغانستان سے روسی بھالو اپنے زخموں کو چاٹتا ہوا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا اور جلد ہی سوویت یونین نامی استعمار نے دم توڑ دیا۔ ناٹو کی عظیم فوجی طاقت جس کا بال بیکا نہ کرسکی مجاہدینِ اسلام نے اس کا جنازہ اٹھادیا۔ اشتراکیت کو ماسکو کے اسٹالن چوک پر دفن کر دیا گیا۔

انور سادات اور صدام حسین جیسے دائیں بازو والوں کو بائیں جانب کا سایہ عافیت بھی کوئی فائدہ نہ پہونچا سکا اور دونوں عبرت کا سامان بنا دیئے گئے۔ اس کے برعکس نہتے فلسطینیوں نے انتفادہ کے نام پر مزاحمت کی ایسی تاریخ رقم کی کہ ان کے آگے یہودی بھیڑیئے بے دست و پا ہوگئے۔ لبنان میں حزب اللہ کے شیروں نے اسرائیلی درندوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ عراق میں امریکی غاصبانہ فوج کے خلاف ایسی مزاحمت سامنے آئی کہ جارج بش کو جوتا کھا کر رسوا ہونا پڑا اور امریکی فوج بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دی گئی۔ افغانستان میں ماضی کے دوستوں نے جب اپنے عہد و پیمان کو پامال کر کے آنکھیں دکھانے کی کوشش کی تو ان کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ فی الحال سرمایہ دارانہ گدھ اپنے بین الاقوامی غلبہ کی آخری فیصلہ کن جنگ افغانستان کی سرزمین پر لڑ رہا ہے۔ زندہ یا مردہ گرفتار کرنے والے خود زندگی اور موت کے درمیان سسک رہے ہیں۔ دس سال بعد بھی ناکامیوں کے علاوہ کوئی اور شئے ان کے ہاتھ نہیں آسکی ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ اپنی خورد و نوش کے لئے جو رقم جزیہ کے طور پر ناٹو کی افواج ادا کرتی ہیں اسی سے ان کو قلع قمع کرنے کے لئے مجاہدین اسلحہ خریدتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب کابل کی کمین گاہوں سے یہ لوگ اپنے پٹھو کرزئی کے ساتھ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح نابود ہو جائیں گے اور پھر دوبارہ اہل ایمان کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

سرمایہ داری کا حریص گدھ اس صدی کے ابتداء میں ساری دنیا کے وسائل کو نگل جانے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن اب عالمی کساد بازاری کا ایک ایسا اژدہا نمودار ہوا جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا اور یہ دیو ہیکل بھسما سر انکل سام کی معیشت کو دیکھتے دیکھتے سالم نگل گیا۔ یوروپ کے ممالک یکے بعد دیگرے دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ برطانیہ قلاش ہو چکا ہے۔ امریکہ فاقہ کشی کا شکار ہے۔ فرانس نے عالم بیزاری میں اپنے چہرے سے اخلاق و رواداری کی نقاب کو اتار کر پھینک دیا ہے۔ جبکہ ترکی میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ ہو رہی ہے۔ اسلام پسندوں نے نہایت مہذب انداز میں پہلے عوام کا اعتماد حاصل کر کے سیاسی اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی اور اولاً عدلیہ کا کوڑا کرکٹ صاف کیا وہاں سے الحاد و بے دینی کا خاتمہ کیا اور بالآخر استصواب کے ذریعہ فوجی دستور کو کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اسلام پسندوں کے لئے ترکی میں تین خطرات تھے ایک عوام کا عدم اعتماد دوسرے عدالتوں کی دین بیزاری اور تیسرے فوج کو حاصل دستوری تحفظ۔ ان تینوں محاذ پر جس انداز میں اہل ایمان نے فتح کا پرچم لہرایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گویا ایک جانب جہاں

کتابِ ملت کی پھر ایک بار شیرازہ بندی ہو رہی ہے وہیں دوسری جانب 'انا ربکم الاعلیٰ' کا مصنوعی نعرہ لگانے والوں کا قافلہ پھر ایک بار موجِ ہستی میں غرقابی کی کگار پر ڈوبنے کا انتظار کر رہا ہے۔ افسوس کہ لوگ ہیں اب بھی عبرت نہیں پکڑتے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں کانوں میں انگلیاں ٹھوس لی ہیں اور اس ڈوبتے جہاز کو تنکے کا سہارا سمجھ کر اس پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس شکستہ سفینے کو اب اپنے سارے حواریوں سمیت ڈوبنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ یہ مشیت کا فیصلہ ہے جو اٹل ہے۔

ہر قوم کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجائے گا تو ایک گھڑی کے لئے نہ پیچھے ٹل سکتا ہے اور نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ (اعراف ۳۴)

افراد کی طرح اقوام کی مدت عمل بھی مقرر ہوتی ہے ان کو عطا ہونے والا غلبہ اور اقتدار بھی محدود مدت کے لئے ہوتا ہے اور جب اس کے اختتام کا وقت آدھمکتا ہے اس میں ذرہ برابر تعجیل و تاخیر نہیں ہوتی اور دیکھتے دیکھتے اچھے اچھوں کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار بنا دیئے جاتے ہیں۔ گزشتہ قوموں کے کھنڈرات کو نشانِ عبرت بنا کر پاک پروردگار نے بعد والوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے تا کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور اپنی باغیانہ روش کی اصلاح کریں۔ لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب اس قصہ کو تمام کر دیا جائے گا اور سارے نشان مٹا دیئے جائیں گے۔

کیا انہوں نے اپنے مَن میں کبھی غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے پیدا نہیں فرمایا مگر (نظام) حق اور مقررہ مدت (کے دورانیے) کے ساتھ، اور بیشک بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے مُنکر ہیں، کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی تا کہ وہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے، وہ لوگ ان سے زیادہ طاقتور تھے، اور انہوں نے زمین میں زراعت کی تھی اور اسے آباد کیا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر جس قدر انہوں نے زمین کو آباد کیا ہے، پھر ان کے پاس ان کے پیغمبر واضح نشانیاں لے کر آئے تھے، سو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ (روم ۸،۹)

یقیناً وہ دن آ کر رہے گا جب اس جہانِ فانی کو تہس نہس کر دیا جائیگا تو کیا اس روز سب کچھ ختم ہو جائیگا؟ جی ہاں ساری چیزیں مٹا دی جائیں گی سوائے ایک کے باقی رہ جائیگی۔ انسان کا وہ عمل جو اس نے آگے بھیجا ہوگا۔ اور اس کے بعد قائم ہونے والے دائمی جہان میں عمل خیر ہی انسان کا واحد سرمایہ ہوگا وہی اس کے نجات کی واحد سبیل ہوگی بقول اقبال۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

علامہ اقبال کے یہ بصیرت افروز اشعار ان کی دینی بصارت کا راز کھولتے ہیں حالانکہ انہیں کسی روایتی درسگاہ سے دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اس کے باوجود عالم الغیب والشہادہ نے جہانِ ہستی کے سربستہ راز ان پر آشکار کردیئے۔ اس لئے انہوں نے زندگی کا سفر کچھ اس طرح کیا کہ ان کے داہنے ہاتھ میں ماضی کا چراغ تو تھا بائیں ہاتھ میں مستقبل کی امید۔ لیکن قدم زمانہ حال میں جمے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہ میں ایک طرف برہان حق پایا جاتا تھا تو دوسری جانب ان کی نظر باطل کی فتنہ سامانیوں پر ہوتی تھی۔ وہ ایک کان سے الہام خوش بیان سے استفادہ کرتے تھے اور دوسرا کان مغرب کے فلسفہ پر دھرتے تھے۔ ان کا ذہن انسانیت کے دکھ درد کا مداوا تلاش کرنے میں مصروف عمل ہوتا تھا اور معرفت خداوندی سے معمور قلب دیدار الٰہی کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ اقبال کے آہنگ و بیان میں پائی جانے والی آفاقیت کی وجہ یہی فطری توازن تھا۔ وہ کبھی اپنے آپ سے خود کلام ہوتے تو کبھی اپنے رب سے ہم کلام دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی امت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں مصروف ہوتے تو کبھی عالم انسانیت کو انجام بد سے خبردار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور حاضر کے حالات کو سمجھنے اور بدلنے کے لئے اسی نور بصیرت کی ضرورت ہے ایسے میں حکیم الامت کی دعا بے ساختہ زبان پر آجاتی ہے۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

# ہندوستانی سیاست

# پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اردو زبان کا حال بھی عجیب ہے کہ پیدا تو دہلی میں ہوئی لیکن دہلی کے اجڑتے ہی یتیم سی ہوگئی۔ لڑکپن مشرق کی جانب کوچ کرکے لکھنؤ میں گذارا اور جوان ہوئی تو جنوب میں حیدرآباد اور مغرب میں لاہور کا رخ کیا۔ اس وقت کسے پتہ تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب یہ زبان مہاراشٹر جیسی سنگلاخ زمین میں پھولے پھلے گی، بہار میں اس پر پھر سے بہار کا موسم چھائے گا اور بنگال کے مختلف ضلعوں میں اسے دوسری ریاستی زبان کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عالم غیب کا حال عالم الغیب کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ مستقبل کے بارے میں انسانی قیاس آرائیاں ہمیشہ ہی غلط ثابت ہوتی رہی ہیں۔ گردش زمانہ کی زنبیل میں وہ کچھ موجود ہوتا ہے جس کا اندازہ لگانا حضرت انسان کے تخیل پرواز سے پرے ہے ورنہ کس کے خواب وخیال میں یہ بات تھی کہ جن مدرسوں کو کبھی آئی ایس آئی کے اڈے اور دہشت گردی کی آماجگاہ قرار دیا جارہا تھا ان کی اس طرح پذیرائی ہوگی کہ انہیں نہ صرف حکومت تسلیم کرے گی بلکہ ان کی سرپرستی بھی کرے گی اور ایسا کرنے والی سرکاروں میں فسطائی جماعت بی جے پی کا بھی شمار ہوگا۔ ان مدرسوں سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو طلباء وطالبات بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر نکلیں گے۔ ایک ایسے سنگین دور میں جبکہ خوشحال مسلمان خود اپنے بچوں کو کانونٹ اسکولوں میں روانہ کرکے اردو کا چراغ اپنے ہی گھروں میں گل کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان مدرسوں سے نکلنے والے مسلم وغیر مسلم نوجوان اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے آگے آئیں گے۔ ہم لوگ خالق کائنات کی اس یقین دہانی سے مایوس ہو رہے تھے کہ ''بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔'' (سورۃ الانشراح اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ ۶) ایسے میں چرخ نیلی فام کا پھر رنگ بدلا اور ایسا لگنے لگا گویا۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے	پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

انتخابی سیاست میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کرنے بعد رہنماؤں کو اپنے وعدے یاد رہتے ہوں لیکن کم از کم ممتا بنرجی کو ابھی تک اپنے وعدے یاد ہیں اور وہ انہیں نبھانے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے مدرسہ عالیہ کا اصلی نام بحال کر دیا ہے اس مدرسے کے نام سے لفظ عالیہ کو یونیورسٹی کا درجہ عطا کرنے سے قبل ہذف کر دیا گیا تھا اور یہ گھناؤنی کارروائی اپنے آپ کو سیکولرزم کا سرخیل قرار دینے والی کمیونسٹ پارٹی نے کیا تھا۔ اردو زبان میں ترقی پسندی کی تحریک جس نظریہ کے حامیوں نے چلائی تھی اسی اشتراکیت کی علمبردار حکومت کا مسلمانوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک حیرت انگیز تھا۔ اس کے علاوہ ممتا بنرجی نے ۶ ضلعوں میں اعلیٰ تعلیم کے مدرسے قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ریاست بھر کے ۱۰۵۰۰ مدرسوں کو سرکاری منظوری دینے کے بعد ان کو مرکزی حکومت کی امداد کا مستحق بنانے کے قابل بنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور جن ضلعوں میں اردو داں افراد کی تعداد ۱۰ فی صد یا اس سے زیادہ ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ یاد رہے مغربی بنگال میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۷ فی صد ہے اور فی الحال ریاستی حکومت کے تعاون سے چلنے والے مدرسوں کی تعداد ۵۲۸ رہے۔

ممتا بنرجی کے ان فیصلوں کی مخالفت نہ تو کانگریس کے بس میں ہے اور نہ کمیونسٹ ایسا کر سکتے ہیں اس لئے بی جے پی حسب توقع خم ٹھونک کر میدان میں کود پڑی۔ بھاجپ کے ریاستی صدر راہل سنہا نے ان فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی خفیہ ایجنسی کے مطابق بنگلہ دیش کی سرحد کے ساتھ پائے جانے والے مدرسے ہندمخالف ہیں اس کے باوجود مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ممتا بنرجی قومی مفاد سے کھلواڑ کر رہی ہیں۔

راہل سنہا کے مطابق مرکزی وزیر داخلہ نے اپنے حالیہ بیان میں الزام لگایا ہے کہ بنگلہ دیش سرحد سے متصل مدرسے حرکت المجاہدین کے ذریعہ چلائے جا رہے ہیں اور ان میں سے اکثر قوم دشمن ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک طرف تو کانگریس کی ہر بات پر شک ہوتا ہے اور دوسری جانب وہ کانگریس ہی کی ہر ایسی بات پر یقین کر لیتی ہے جو مسلمانوں کے خلاف ہوتی ہے۔ ایسا کیوں؟ وزیر داخلہ نے اگر یہ بات کہی ہے تو ان سے یہ پوچھا جانا چاہئے کہ انہیں ان مدرسوں کے خلاف کارروائی کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ ویسے اگر بی جے پی کو مدرسوں کی سیاست سے پریشانی لاحق ہوئی ہے تو انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی اپنی پارٹی کے چشم و چراغ نریندر مودی نے دیوبند کے

مہتمم مولانا وستانوی کو محض گجرات کے فسادات کو بھول جانے کا مشورہ دینے کے عوض یوم جمہوریہ کی سرکاری تقریب میں شرکت کی دعوت دے ڈالی تھی لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی مولانا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے مودی کی دعوت کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔

ہندوستان کی سب سے بڑی حزب اختلاف بی جے پی کا حال فی الحال بہت خراب ہے ایک تو وہ لوگ کچھ بولتے نہیں اور اگر کچھ بولتے بھی ہیں تو اس قدر اوٹ پٹانگ کہ کوئی اس پر کان نہیں دھرتا۔ میڈیا ان کی سن کر بھی ان سنی کر دیتا ہے اور نشر و اشاعت کی زحمت گوارہ نہیں کرتا۔ ایسا ہی کچھ ہوا جب بھارتیہ جنتا پارٹی نے ممتا کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کے مدرسوں سے متعلق فیصلے پر برس پڑے حالانکہ وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ مغربی بنگال سے زیادہ مدرسوں کی پذیرائی بہار میں کی جاتی ہے اور بہار کی ریاستی حکومت میں بی جے پی برابر کی شریک ہے۔ بہار میں تسلیم شدہ مدرسوں کی تعداد ۴۰۰۰ ہزار ہے جن میں سے ۱۱۱۸ کو ریاستی حکومت چلاتی ہے گویا یہ تعداد مغربی بنگال کے سرکاری مدرسوں سے دوگنی ہے۔ اس معاملے میں ایک دلچسپ اعداد و شمار یہ بھی ہے کہ خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کا دم بھرنے والی سرکار صرف ۳۲ طالبات کے مدرسوں کا تعاون کرتی ہے جبکہ ملت اپنے تئیں ۵۷۶ طالبات کے مدرسوں کا (سرکاری امداد کے بغیر) اہتمام کرتی ہے۔ ویسے ایک حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہمدرد سمجھے جانے والے لالو یادو کو ان مدرسوں کو جدید سہولیات سے آراستہ کرنے کا خیال نہیں آیا بلکہ بی جے پی کی مدد سے لالو کو ہرانے والے نتیش نے اس کار خیر کا آغاز کیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے شدت پسند حامیوں کو تو مسلمانوں کے مخالف بیان سے خوش کر دیا مگر ان احمقوں کو کون بتلائے کہ جن مدرسوں کی ان کے رہنما مخالفت کر رہے ہیں ان میں القاعدہ کا تو کہیں نام و نشان نہیں ہے ہاں مسلمانوں کے ہمراہ ہندو بچے ضرور تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بنگال میں اوسطاً مدرسوں کے اندر ۲۰ فی صد طلباء غیر مسلم ہیں لیکن چند ایک ایسے مدارس بھی موجود ہیں جن میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت غیر مسلم ہے مثلاً اورو گرام گاؤں کا چاتو سلیبی مدرسہ جہاں تعلیم حاصل کرنے والے ایک ہزار طلبہ میں سے ۶۴ فی صد غیر مسلم ہیں اور جملہ اساتذہ کی تعداد ۱۲ ہے جن میں سے ۴ ہندو ہیں۔ غیر مسلمین کے اندر مدرسے کی مقبولیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے صدر مدرس انور حسین فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی وہی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو دوسرے اسکولوں میں ہوتے ہیں۔ عربی اور اسلامیات کے علاوہ سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی ہے اسی کے ساتھ ہم تمام مذاہب کے طلباء کا یکساں خیال رکھتے ہیں۔ یہاں سے تعلیم ختم کرنے کے بعد طلبہ کو اعلیٰ

تعلیم حاصل کرنے یا سرکاری ونجی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اس لحاظ سے دوسرے اسکولوں اور ہمارے مدرسے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انور حسین کے دعوی کی تائید یہاں پڑھنے والی ۱۲ ر سالہ شبنمی خاتون نے بھی کی جو ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ مدرسے کا معیارِ تعلیم اسے داخلے کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار کردے گا۔

کولکتہ (جو شہرۂ آفاق کلکتہ کا نیا نام ہے) میں زیر ملازمت ہمایوں کبیر کا کہنا ہے کہ انہوں ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی پھر ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا اور اب بچوں کے امراض کے ماہر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور وگرام مدرسے کے ایک استاد نظام الدین احمد فنی و مادی فائدوں کے علاوہ سماجی و معاشرتی افادیت کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مدرسوں میں ہندو مسلم طلبا کا ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنا فرقہ وارانہ امن وخیر سگالی کے لئے بھی معاون ثابت ہوتا ہے اور آپسی غلط فہمیوں اور عدم اعتماد کے ازالہ کا سبب بنتا ہے۔ ۱۶ ر سالہ تانوشری بسو اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ان کے خیالات میں مدرسے کی تعلیم کے دوران زبردست فرق واقع ہوا۔ مغربی بنگال کے اندر ابھی حال میں انگریزی میڈیم کے مدرسوں کا رجحان بھی پروان چڑھ رہا ہے۔

بہار کے مدرسے نہ صرف دسویں جسے فوقانیہ کہا جاتا ہے بلکہ بارہویں یعنی مولوی کے درجے تک کی تعلیم فراہم کرتے ہیں اس سال بغیر کسی نقل کے مدرسوں کے نتائج ۹۰ ر فی صدر ہے۔ وہاں امتحان کے نتائج کا اعلان ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے جدا جدا زمروں میں ہوتا ہے۔ اس سال فوقانیہ کے امتحان میں انجلی ۸۰۵ ر نمبر حاصل کر کے ہندو طالب علموں میں اول نمبر پر آئی جبکہ اسکے مقابلے ناصرہ خاتون کو اول آنے کے لئے ۸۹۶ نمبر حاصل کرنے پڑے۔ اسی طرح مولوی کے امتحان میں جہاں محمد ملک ۹۶۳ ر نمبر حاصل کر کے اول آیا وہیں سنجے نے ۸۹۳ ر اور بالا کرشنن نے ۸۸۴ ر نمبرات حاصل کئے۔ سنجے کا کہنا ہے کہ وہ دوسرے غیر مسلمین کو مدرسے میں آنے کی ترغیب دے گا اس لئے کہ یہاں تعلیم نہ صرف مفت ہے بلکہ معیاری ہے۔ غیر مسلمین اپنے بچوں کو عربی، فارسی اور اسلامی تہذیب سے اس لئے مانوس کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ خلیج کے ممالک میں موجود مواقع سے استفادہ کر سکیں اور مسلم ممالک کے سفارتخانوں میں ملازمت حاصل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسوں کی جانب نہ صرف پسماندہ بلکہ خوشحال ہندوؤں کا بھی رجحان بڑھ رہا ہے۔ تیس غیر مسلم طلبا نے فوقانیہ میں ٹاپ کیا ہے جبکہ ۱۶ ر مولوی کے کورس میں اول پوزیشن پر آئے ہیں اور ان سب نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ حقیقت بھی چونکانے والی ہے کہ سب سے زیادہ نمبرات حاصل

کرنے والے ۱۲ر غیر مسلم طالب علموں میں سے ۱۰ ر طالبات ہیں۔

ایک دلت طالبہ صنم کماری جس نے مولوی کے امتحان میں تیسرا نمبر حاصل کیا اردو ٹیچر بننا چاہتی ہے۔ حکومت کی تعلیم کے فروغ کی خاطر چلائی جانے والی مہم میں ہر ۴۰ ر طلبا پر ایک استاد اور ہر دس طالب علم پر ایک اردو ٹیچر کا اہتمام ہے جس کے باعث بہت ساری اسامیاں اساتذہ کی خاطر معرض وجود میں آئی ہیں ان میں سے ۱۰ ر فی صد اردو والوں کے لیے مختص ہے۔ گذشتہ دو سالوں کے اندر نتیش سرکار نے دو لاکھ اساتذہ کا تقرر کیا جس میں سے اچھی خاصی تعداد اردو اساتذہ کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب بی جے پی کی شریک کار حکومت کی جانب سے کیا جارہا ہے جس کے بنیادی عقائد میں سے ایک مسلمانوں کو دہشت گرد اور غدار وطن سمجھنا ہے اور جن کا واحد ہدف اسلام اور مسلمانوں کی ایذا رسانی ہے۔

دہشت گردی کی بابت تو یوں ہوا کہ اس کو امریکہ اور اس کے حواریوں نے جن میں ہندوستان بھی پیش پیش ہے اس قدر پھلایا کہ وہ اپنے دباؤ سے آپ ہی پھٹ گیا اور اس کی ساری ہوا نکل گئی اب سرکار کی سرپرستی میں آئے دن برپا ہونے والی دہشت گردی عوام کے معمولات زندگی میں شامل ہوگئی ہے اور اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوتی بلکہ جو حیرت کا اظہار کرتا ہے اسے لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں مدرسوں کے خلاف رہے گا بڑے پیمانے پر محاذ آرائی کا آغاز اس وقت ہوا جب بھارتیہ جنتا پارٹی کو مرکز میں اقتدار حاصل ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ ۱۱ر ستمبر کے بعد کا زمانہ تھا اور عالمی سطح پر امریکہ کی سربراہی میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ معاملہ محض بی جے پی تک محدود رہا بلکہ اس حمام میں کانگریس، کمیونسٹ اور ملایم سنگھ یادو تک بھی برہنہ پائے گئے اور ان سب کے زیر نگرانی میں چلنے والی ریاستی حکومتوں کی پولس نے مدرسوں پر چھاپہ بلکہ شب خون مارنے کی گھناؤنی کارروائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

ممبئی میں مدرسہ دارالعلوم امدادیہ پر تیاگی کی قیادت میں پولس نے ۱۹۹۳ء کے فسادات کے دوران بلہ بول کر ۸ ر معصوم طلبا کو شہید کر دیا۔ اس وقت مرکز اور ریاست دونوں مقامات پر کانگریس کی حکومتیں تھیں اس کے باوجود آر ڈی تیاگی کی ترقی ہوتی رہی اور بالآخر اسے پولس کمشنر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ حکومت اس کی اور دیگر مجرم پولس اہلکاروں کی پشت پناہی کرتی رہی ان کے خلاف مقدمات کو ہر عدالت میں کمزور کیا جاتا رہا یہاں تک کہ ۱۸ ر سال بعد وہ لوگ سپریم کورٹ سے بھی بری ہو گئے اور یہ سب کانگریس کے آشیرواد سے ہوا۔ آندھرا پردیش میں مولانا عاقل حسامی کے زیر اہتمام چلائے جانے والے دارالعلوم پر حیدرآباد میں پولس نے آدھی رات میں چھاپہ

مارا۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کے باوجود پولس نے اگلے ہی دن نہ صرف کشن باغ میں واقع دارالعلوم انوارالہدیٰ کونشانہ بنایا بلکہ مصری گنج کے جامعہ عائشہ صدیقہ برائے طالبات پر بھی دہشت گردی کا لیبل چسپاں کردیا اور یہ ساری کارروائی مسلم دوست سمجھے جانے والے کانگریسی وزیراعلیٰ وائی ایس راج شیکھر ریڈی کے دور اقتدار میں ہوئی۔

مغربی بنگال جہاں مدرسوں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ان کا جال پھیلا ہوا ہے امریکی سفارتخانے پر حملے کے بعد خود وزیراعلیٰ بدھودیو بھٹا چاریہ نے نہ صرف کلکتہ کے مدرسے پر چھاپہ مروایا بلکہ سنگھ پریوار کے لہجے میں مدرسوں کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا۔ اس سلسلے کا سب سے حیرت انگیز چھاپہ پھلت ضلع مظفرنگر میں واقع جامعہ رحمانیہ پر اس وقت پڑا جب ملا ملائم کہلانے والے ملائم سنگھ اترپردیش کے وزیراعلیٰ تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مقام پیدائش پر ان کے نام سے چلایا جانے والا یہ مدرسہ ہمیشہ ہی حکومت کا وفادار رہا اس کے باوجود اپنے آپ کو سرکاری عتاب سے نہیں بچا سکا۔ اس طرح کے مظالم کا آغاز اترپردیش میں ویسے تو بی جے پی کی زیر سرپرستی ہوا جب ندوۃ العلوم کے چند طلبا ۱۹۹۴ء میں رات گئے گرفتار کئے گئے۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ساتھ قائم ہونے والے سہارنپور کے مظاہرالعلوم کے ایک استاذ مولانا اسرار کو دہلی میں گرفتار کرنے کے بعد مدرسے پر چھاپہ مارا گیا۔

سرزمین ہند کے مسلمانوں نے ایک ایسا پرآشوب دور بھی دیکھا کہ جب سنگھ پریوار والے چندرا چندرا کر یہ کہتے پھرتے تھے کہ "ہر مسلمان دہشت گرد تو نہیں مگر ہر دہشت گرد مسلمان ضرور ہے۔" لیکن آج حالت یہ ہے کہ آر ایس ایس کے بارے میں یار دوست کہنے لگے ہیں کہ "ہر ہندو سنگھی تو نہیں مگر ہر سنگھی (کسی نہ کسی درجے میں) دہشت گرد ضرور ہے۔" اس زمانے میں مندروں اور بازاروں میں تو کجا مسجدوں، درگاہوں اور قبرستانوں میں ہونے والے دھماکوں کی بھی ذمہ داری بھی بلا چون وچرا مسلمان معصوم نوجوانوں کے سر منڈھ دی جاتی تھی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب ممبئی دھماکے میں گرفتار کئے جانے والے سبھی مسلمان ملزم باعزت بری کردیے گئے سوائے اجمل قصاب کے جس کا تعلق پاکستان سے بتلایا جاتا ہے ویسے اس کا حقیقی تعلق کس سے ہے یہ پتہ لگانا ایک ایسی تحقیق کا موضوع ہے جس کی فرصت یا ضرورت کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی کسی میں اس کی جسارت ہے کہ وہ امریکی ایجنٹ ریچرڈ ہیڈلی کے دست راست کی تفصیل میں جائے۔ اس لئے کہ بقول غالب ؎

داورِ حشر! میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

# شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

(قسط دوم)

بابری مسجد کے نام نہاد عدالتی فیصلے پر عام مسلمانوں کے ردعمل کی نمائندگی کا حق اسلم بھورے نے ادا کیا۔ یہ وہی اسلم بھورے ہے جس نے ۱۹۹۱ء میں مسلمانوں کی جانب سے آواز بلند کرتے ہوئے بابری مسجد کی اراضی محکمہ سیاحت کو دیئے جانے کے خلاف عرضداشت داخل کی تھی اور عدالت نے اس کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلے پر روک لگائی تھی۔ اس نے ۲۰۰۲ء میں وی ایچ پی کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کا آغاز کروانے کے لئے سپریم کورٹ میں گہار لگائی تھی اور اس کو عدالت کی جانب سے مثبت جواب ملا تھا یہ اور بات ہے کہ سنگھ پریوار وقتاً فوقتاً بدعہدی کرتے ہوئے قانون کو پامال کرتا رہا نیز کانگریس پارٹی خاموش تماشائی بنی رہی۔ اسلم بھورے کا سیاسی جماعتوں پر سے اعتماد تو برسوں قبل ختم ہوگیا تھا لیکن عدلیہ پر ہنوز باقی تھا۔ اپنے جرأت مندانہ اقدامات وہ کسی اور کے کہنے پر یا کسی مفاد کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر کرتا تھا۔ اتفاق سے اسلم نہ تو کوئی عالم دین تھا اور نہ دانشور۔ وہ نہ ہی سیاسی سربراہ تھا اور نہ ہی سماجی رہنما۔ وہ ایک عام مسلمان تھا جسے اپنے دین اور شعائر دین سے محبت تھی۔ وہ ان کی حفاظت کے لئے عملی جدوجہد کا قائل تھا چونکہ اسے ملک کے عدالتی نظام پر مکمل اعتماد تھا۔ اس اسلم بھورے نے بابری مسجد کے فیصلے سے پہلے یا بعد کوئی بیان جاری نہیں کیا لیکن فیصلے کے بعد عام مسلمانوں کی طرح وہ بھی غمگین ہوگیا۔ صدمہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی لیکن آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ دو دنوں تک وہ سب سے کٹ کر جاگتا رہا۔ خلاؤں میں جھانکتا رہا اور جب دور تک اسے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تو مایوسی کی کالی چادر تان کر ابدی نیند سو گیا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسلم بھورے کی قبر کو اپنے نور سے منور کر دے۔ اس کی

مغفرت فرمائے۔ اس کے درجات کو بلند فرمائے۔ قوم کا عام آدمی بجا طور پر اسلم بھورے کے جذبات واحساسات کی قدر کرتا ہے اور اس کے اقدامات وخدمات کو سلام کرتا ہے لیکن خاص لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ قوم کے کئی دانشور صلح صفائی پر آمادہ ہیں اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر آگے کی جانب دیکھنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ جو اقوام اپنے اوپر ہونے والے مظالم کو بھلا دیتی ہیں تو وہ گویا پھر ایک بار اپنے آپ کو ظلم کا شکار بنانے کے لئے پیش کر دیتی ہیں۔ ظالم کا حوصلہ بڑھاتی ہیں اور انہیں زبانِ حال سے یہ کہتی ہیں کہ ہم تمہارے لئے تر نوالہ ہیں جب موڈ بنے ہم پر ہاتھ صاف کرلو ہم زبان سے اُف نہ کہیں گے بلکہ بے غیرتی کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوئے سر جھکا کر شکریہ ادا کرنے میں اپنے لئے عافیت جانیں گے اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیں گے اور عفو درگذر کا معاملہ کریں گے۔

کسی زیادتی کے جواب میں ایک انتہا پسندی یہ ہے کہ تلخی کا اظہار کیا جائے اور دوسرے اس سے بدتر انتہا یہ ہے کہ ظلم کو یکسر بھلا دیا جائے۔ اہل ایمان ان دونوں رویوں کو ترک کر کے درمیان کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مسلمان مکی دور میں مظالم کو برداشت کرتے رہے لیکن انہیں بھولے نہیں۔ وہ مناسب موقع کا نہ صرف انتظار کرتے رہے بلکہ اس کی تیاری میں بھی لگے رہے۔ انہوں نے نہ جلد بازی دکھلائی اور نہ تساہلی کا مظاہرہ کیا۔ جب بدر کے میدان میں حق و باطل کا معرکہ بپا ہوا تو دو نو جوانوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے پوچھا چچا جان ابوجہل کون ہے ذرا ہمیں بتا دیجئے۔ انہوں نے پوچھا تم اس کو پہچان کر کیا کرو گے؟ جواب ملا ہم نے سنا ہے کہ وہ نبی کریمؐ کو گالیاں دیتا ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ نظر آجائے میں اس سے جدا نہیں ہوؤں گا یہاں تک کہ اس کو موت آجائے یا ہماری جان چلی جائے۔ ان دونوں نوجوانوں کا نام اتفاق سے معاذؓ تھا۔ یہ مکہ کے مظالم کا شکار نہیں ہوئے تھے انہوں نے ظلم سہا نہ تھا بلکہ سنا تھا وہ ابوجہل کو پہچانتے تک نہ تھے لیکن اس کی حرکات کو جانتے تھے۔ اگر ان کے والدین اپنے ماضی کو بھلا دیتے اور ابوجہل کے مظالم سے اپنی اولاد کو واقف نہیں کرواتے تو اس فرعونِ وقت کو کیفرِ کردار تک پہونچانے کی سعادت ان نوجوانوں کو حاصل نہیں ہوتی اور وہ فرقانِ عظیم ظاہر نہیں ہوتی جس نے انسانی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔

بابری مسجد مقدمہ کے ایک جج ایس یو خان نے اپنے فیصلے میں مسلمانوں کی توجہ صلح حدیبیہ کی جانب مبذول کروانے کے بعد فتح مکہ کی عظیم نعمت کا حوالہ دیا لیکن وہ اس بات کو بھول گئے کہ آخر کفار مکہ صلح کے لئے راضی کیوں ہوئے؟ ایسا نہیں ہوا کہ جس طرح انہوں نے ہندوؤں کو تیاگ یعنی

قربانی دینے کا مشورہ دیا اس طرح کی کوئی تلقین کسی قاضیٔ وقت نے مشرکینِ مکہ کو کی تھی اور وہ صلح حدیبیہ کے لئے تیار ہو گئے تھے بلکہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی اور غزوۂ احد میں ناکامی کے باوجود مسلمانوں کی پے در پے مہمات ایک سال بعد وعدے کے مطابق بدر کے میدان میں پہونچ جانا۔ مشرکینِ مکہ اور یہودیوں کا متحد ہو کر غزوۂ احزاب میں مسلمانوں پر بلہ بول دینے کے باوجود ناکام و نامراد ہو کر لوٹنے پر مجبور ہو جانا وہ وجوہات تھیں جن کے باعث مشرکینِ مکہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ پھونکوں سے اس چراغ کو بجھایا نہیں جا سکتا اس لئے بھلائی اس میں ہے کہ ان سے مصالحت کر لی جائے۔ باوقار مصالحت اپنے سے کمتر کے ساتھ نہیں بلکہ برابر کے فریق سے کی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان اگر ہندوؤں کے ساتھ صلح صفائی بھی کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے انہیں اپنی پوزیشن کو بہتر بنا کر ان کی صف میں لانا ہوگا۔ لیکن اگر ہندوستان کے مسلمان ان تمام مراحل سے گذرے بغیر اس بات کی توقع کر رہے ہیں کہ صلح حدیبیہ ہو جائیگی اور پھر فتح مکہ بھی نصیب ہو جائیگی تو اس عافیت پسندانہ خود فریبی کا کوئی علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں ہے۔

عفو و درگذر ایک عظیم انفرادی و اجتماعی صفت ہے۔ اس کا مظاہرہ انفرادی سطح پر مکی زندگی میں اور اجتماعی طور پر فتح مکہ کے موقع پر کیا گیا۔ لیکن جس طرح فتح مکہ کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے اس طرح کا معاملہ مکی زندگی میں دیکھنے کو نہیں آیا اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر معاف کرنا انسان کی مجبوری ہو تو اس کے اثرات محدود ہوتے ہیں لیکن اختیاری ہو تو اس کا تاثر لامحدود ہوتا ہے۔ ابتداء میں مکہ کے لوگ یہ سمجھتے رہے مسلمان چونکہ بدلہ نہیں لے سکتے اس لئے صبر کرنا ان کی مجبوری ہے۔ اس لئے ظالموں کے حوصلے میں اضافہ ہی ہوتا رہا یہاں تک مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا لیکن فتح مکہ کے بعد بدلہ لینا نہ صرف ان کے اختیار میں تھا بلکہ انہیں اس کا حق بھی حاصل تھا اس کے باوجود عفو و درگذر کے مظاہرے نے مخاطبین کے دلوں کو مسخر کیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان پہلے فتح کی پوزیشن میں آئیں اور پھر درگذر کریں تا کہ عفو اپنا رنگ دکھائے اسی کے ساتھ ساتھ عام معافی کے حدود کا تعین بھی ضروری ہے۔ مسلمان اپنے خلاف ہونے والی انفرادی زیادتیوں کو معاف کر سکتے ہیں بلکہ یہ پسندیدہ ہے اسی لئے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے والی ہندہ کی جان بخشی بھی ہوگئی لیکن مشرکینِ مکہ کا دل جیتنے کی خاطر حرم پاک کا کوئی گوشہ ان کو ہبہ کر کے وہاں وہ لات و منات کی عبادت جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بہت ہی سہل اصول ہے کہ انسان اپنے حق سے دستبردار ہو سکتا ہے لیکن کسی اور کے حق کو معاف نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو خو

اپنا ذاتی مکان صدقہ کرنے کی اجازت ہے لیکن وہ کسی اور کی امانت کو خیرات نہیں کر سکتا۔ بابری مسجد نہ تو سنی وقف بورڈ کی ذاتی ملکیت ہے اور نہ ان نام نہاد رہنماؤں کی جو بلا واسطہ اسے خیرات کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ امانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اپنی تمام تر مخلصانہ جدوجہد کے باوجود اگر ہم ناکام ہو جاتے ہیں تو ممکن ہے اللہ رب العزت ہماری مجبوریوں کا خیال کر کے ہمارے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ فرمائے لیکن اگر ہم نے بہ رضا و رغبت اسے طلائی طشتری پر سجا کر اللہ کے دشمنوں کو حوالے کر دیا تو یقیناً اس کی بارگاہ میں جوابدہی سے نہیں بچ پائیں گے۔ ہمارے لئے بابری مسجد تو درکنار اسلم بھورے کو بھلانا بھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسلم کا خونِ ناحق معاف کر دیں لیکن یہ ممکن نہیں بابری مسجد کا خراج وصول نہ کریں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر آدمی کی طرح اسلم بھورے کو بھی صدمہ ہوا لیکن اس کے جو اثرات اسلم پر پڑے وہ عام لوگوں سے مختلف کیوں تھے؟ دراصل اس کی وجہ اسلم کا ہندوستان کے عدالتی نظام پر زبردست اعتماد اور اس سے بیجا توقعات تھیں۔ باطل نظام کے تحت چلنے والے سارے شعبہ جات بشمول عدلیہ مکڑی کے جال کی مانند ہیں۔ جو ان سے کام چلاؤ تعلق رکھتا ہے اس کے ساتھ اگر دھوکہ اور فریب بھی ہو جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ اسے پتہ ہوتا ہے جب ہوا کا تیز جھونکا آئے گا تو یہ تار تار ہو جائیگا۔ لیکن جو لوگ اس پر مکمل اعتماد کر لیتے ہیں اور اس کمزور بنیاد پر مضبوط قلعہ تعمیر کرتے ہیں ان کے ہاتھ آنے والی مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہمارے دانشوروں کا یہی حال ہے انہیں اپنی نحیف ذات پر اور اس ناقص نظام پر مکمل اعتماد ہے لیکن خدا کی ذات پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے ہائی کورٹ کے فریب سے ان کا نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ عدالتِ عالیہ پر سے اعتماد بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ کامیابی کا تعلق بالکلیہ طاقت پر نہیں ہوتا حضور اکرمؐ نے مکہ کی عظیم فتح کو خدائے بزرگ و برتر سے منسوب کر کے فرمایا تھا تمام تعریف اس اللہ رب العزت کے لئے ہے جو خود اکیلا ہی کافی ہو گیا۔ گویا یہ ساری کامیابی محض اسی کی مرہونِ منت ہے اور پھر ان الفاظ کی عملی تفسیر غزوۂ حنین میں سامنے آئی جہاں مسلمانوں کو اپنی تعداد کا ناز تھا لیکن اللہ ربّ العزت نے پہلے ان کی ہوا اکھاڑ دی اور پھر فتح سے ہمکنار کر کے بتلا دیا کہ کامیابی و ناکامی ہماری جانب سے آتی ہے۔ ہم اگر مکہ میں تمہیں کامیاب کر سکتے ہیں تو حنین میں شکست سے بھی دوچار کر سکتے ہیں اور پھر اسی شکست کو فتح میں بھی بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا فرضِ منصبی تو یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کر کے جدوجہد کرتے رہیں، نہ تو کامیابی پر فخر جتائیں اور نہ ناکامی پر مایوس ہوں۔

بابری مسجد کی بازیابی کے لئے ان تمام وسائل کو استعمال کرنا جو موجود ہیں اور بات ہے لیکن اللہ کی ذات کے بجائے ان وسائل و ذرائع پر تکیہ کر لینا اور بات ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اتر پردیش اور مرکز ہر دو جگہ بی جے پی کی حکومت تھی اس وقت اس طرح کا کوئی فیصلہ کروالینا اور اس کو بزورِ قوت نافذ کر دینا نہایت آسان تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اگر ہو جاتا تو مسلمان سوچتے کہ یہ ہماری غلطی ہے جو ہم نے اپنے ووٹ کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے سنگھ پریوار اقتدار میں آ گیا اس لئے آئندہ اس طرح کی صورتحال سے بچنے کی واحد شکل یہ ہے کہ سیکولر جماعتوں کے ذریعہ بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکا جائے۔ لیکن اللہ رب العزت نے یہ تمام فیصلے ایسے وقت میں کروائے جب نہ یوپی میں بی جے پی کی حکومت ہے اور نہ مرکز میں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس نام نہاد سیکولر جماعتوں کے تارِ عنکبوت کو بھی نیست و نابود کر دیا اور ہماری آنکھیں کھول دیں کہ ہم ان سے بے جا توقعات وابستہ کرنے کے بجائے دینِ حنیف کی جانب یکسو ہو کر پلٹیں اور اور سیاسی جوڑ توڑ کے بجائے بے کم و کاست اس نظامِ عدل کو قائم کرنے کی جد و جہد میں لگ جائیں جو نہ صرف ہمارے بلکہ ساری انسانیت کے درد کا درماں ہے۔

اسلام ایک نہایت ہی فطری دین ہے۔ اس میں فتح و شکست کو حقائق زندگی کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں جہاں جنگِ بدر کی کامیابی کا ذکر ہے وہیں غزوۂ احد کی ناکامی کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ کسی بھی معرکہ میں ہاتھ آنے والی شکست کا لازمی نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ مستقبل کا کوئی موثر منصوبہ مایوسی کی حالت میں نہیں بنایا جا سکتا اس لئے اہلِ ایمان کے اندر پیدا ہونے والے حزن و ملال کو دور کرنے کی خاطر اللہ رب العزت دشمنوں کی مثال دے کر اہل ایمان کی ترغیب کا سامان فرماتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اِس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ (آل عمران ۱۳۹۔ ۱۴۰)

گویا اگر اس بار ہمیں شکست ہوئی تو اس سے پہلے ہمارے دشمن بھی تو شکست سے دوچار ہو چکے ہیں۔ یہ ایام رنج و ملال لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں تا کہ آزمائش کا سامان ہو۔

یہاں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ مشرکین مکہ اپنی گزشتہ ناکامی کے بعد مایوس نہیں ہوئے بلکہ دوبارہ اپنے آپ کو مجتمع کر کے حملہ آور ہوئے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تم تھک ہار کر بیٹھ جاو۔ ہندوستان میں سنگھ پریوار کا حال دیکھئے کہ عدالتی شواہد، اقتدار وقت، ذرائع ابلاغ اور ہندو دانشوروں کے ایک بڑے گروہ کی مخالفت کے باوجود انہوں نے برسوں تک اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور طویل لڑائی لڑتے رہے اور بالآخر انہیں کلی نہ صحیح تو جزوی کامیابی حاصل ہوگئی۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ تو محض ایک معرکہ ہے جنگ ابھی جاری ہے اور اس بات کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ اگر خدانا خواستہ عدالت عالیہ کا فیصلہ ہمارے خلاف چلا جاتا ہے تو اس صورت میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ اس متبادل منصوبے کو بنانے کا مناسب وقت فیصلے سے قبل ہے اس لئے کہ ناحق فیصلے کے بعد پیدا ہونے والی مایوسی مناسب تر فیصلہ کرنے میں مانع ہوگی۔ اُس وقت کے حالات کا اندازہ قائم کر کے ابھی سے مناسب منصوبہ تیار کر کے رکھنا چاہئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احد کی شکست کے بعد واپس جانے والی مکی فوج کو اپنے اور مسلمانوں کے لئے عافیت نہیں جانا بلکہ اس بات کا اندازہ قائم کیا کہ مشرکین جاتو رہے ہیں لیکن راستہ سے اپنا ارادہ بدل کر واپس آسکتے ہیں اور اس وقت غافل اور منتشر فوج کو مجتمع کرنا مشکل ہو جائے گا اس لئے بہتر یہ کہ ابھی اسی حال میں دشمن کا پیچھا کیا جائے۔ آگے چل کر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا لیکن جب مشرکین اپنا ارادہ بدل رہے تھے تو انہیں پتہ چلا کہ مسلمان اس شکست کے باوجود شکست خوردگی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں وہ لڑنے کا عزم و حوصلہ اپنے اندر ہنوز رکھتے ہیں اس لئے ان پر فی الحال ہاتھ ڈالنے کے بجائے آئندہ سال کے لئے اپنے ارادے کو موخر کرنا چاہئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکمتِ عملی میں ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ مصالحت کا موقع شکست کے بعد نہیں بلکہ فتح حاصل کر کے اپنی حیثیت منوانے کے بعد آتا ہے۔ کسی ایک مرحلہ میں شکست سے دوچار ہو جانے کے بعد مایوس ہو کر سپر ڈال دینا مومن کو زیب نہیں دیتا۔ وہ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے دشمن سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ہر حال میں اپنا حوصلہ بلند رکھتا ہے اللہ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ اہل ایمان کا یہی رویہ آگے چل کر انہیں غیب سے حاصل ہونے والی نصرتِ خداوندی کا مستحق بناتا ہے اور بامراد کرتا ہے۔

آپ اُن لوگوں کو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں کبھی اس شخص سے دوستی کرتے ہوئے نہ پائیں گے جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھتا ہے خواہ وہ اُن کے باپ (اور

دادا) ہوں یا بیٹے (اور پوتے) ہوں یا اُن کے بھائی ہوں یا اُن کے قریبی رشتہ دار ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اُس (اللہ) نے ایمان ثبت فرما دیا ہے اور انھیں اپنی روح (یعنی فیض خاص) سے تقویت بخشی ہے، اور انہیں (ایسی) جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ اُن سے راضی ہو گیا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں، یہی اللہ (والوں) کی جماعت ہے، یاد رکھو! بیشک اللہ (والوں) کی جماعت ہی مراد پانے والی ہے۔ (مجادلہ ۲۲)

بابری مسجد کے پس پردہ سیاسی بازی گری میں بدقسمتی سے مسلمان اصل فریق نہیں ہیں۔ ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں فی الحال ہندو سماج کو خوش کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔ بدقسمتی سے یہ قضیہ سیاسی اکھاڑے میں ہندو ووٹ بنک پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمانے کا ذریعہ بن گیا۔ شمالی ہندوستان کے ہندو عوام بہرحال رام سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان کا جذباتی استحصال کرنے کی خاطر کانگریس اور بی جے پی دونوں ہی رام مندر کا کریڈٹ لینا چاہتی ہیں تاکہ اقتدار حاصل ہو سکے یا مضبوط ہو سکے۔ مسلمان اس معاملہ میں حاشیہ پر ہیں اور رہیں گے اس لئے کہ وہ اقلیت میں ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کر کے اقتدار پر اثر انداز ہو سکتے ہیں وہ دراصل احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ ہاں اگر ہندو عوام کو یہ باور کرا دیا جائے کہ تمہارے بنیادی مسائل کو حل کرنے بجائے یہ سیاسی جماعتیں تمہیں رام کے نام پر بے وقوف بنا رہی ہیں اور ان کی نظروں میں رام مندر کا مسئلہ غیر اہم ہو جائے بلکہ وہ اس کے نام سے چڑنے لگیں تبھی یہ سیاسی جماعتیں اس سے دستبردار ہوں گی اور انصاف کا امکان پیدا ہوگا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ جمہوریت میں ہمیشہ ہی رائے عامہ کو عدل و انصاف پر فوقیت حاصل رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی جماعتیں انصاف کے بجائے رائے عامہ کی بنیاد پر اپنا رویہ طے کرتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس فاسد نظام کو بدلنے کی سنجیدہ تگ و دو کی جائے۔ اور جب تک کہ یہ کارِ خیر اپنے انجام کو نہیں پہونچتا اس وقت تک اصحابِ اقتدار کو عدل و انصاف کی ضرورت و اہمیت سمجھانے کے بجائے رائے عامہ کی مدد سے ان پر دباؤ بنانے کی کوشش کی جائے۔ سنگھ پریوار کی کامیابی کا راز عدالت میں نہیں عوامی تحریک کے ذریعہ ہندو عوام کے جذبات کو رام مندر سے جوڑ دینے میں پنہاں ہے۔ اگر سنگھ پریوار صرف قانونی چارہ جوئی پر انحصار کرتا تو اسے یہ کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی اس لئے مسلمانوں کو بھی محض عدالت پر تکیہ کرنے کے بجائے رائے عامہ کو اس مسئلے کے خلاف کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اگر وہ اس میں

کامیاب ہو جاتے ہیں تو حکومت کا مزاج اور عدالت کے فیصلے خود اپنے آپ بدل جائیں گے۔

بابری مسجد کے اس ناعاقبت فیصلے پر جہاں بہت سارے مسلم دانشوروں کی جانب سے مایوسی کا اظہار ہوا ہے وہیں بہت سارے غیر مسلم صحافیوں نے بھی اس کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اس میں پائی جانے والی قانونی پیچیدگیوں اور تضادات کی نشاندہی کی۔ اسی کے ساتھ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے نہایت ظریفانہ انداز میں اس فیصلے کے فکری و سماجی اثرات پر تبصرہ کیا مثلاً انترہ دیو سین کا مضمون ہے جو انڈین ایج میں شائع ہوا۔ اُس میں فاضل صحافی نے الہ بادہائی کورٹ کے فیصلے کو رام کی توہین قرار دیا۔ سین کے مطابق اس فیصلے نے شری رام کی آفاقیت کو ختم کر کے انھیں اتر پردیش کا عام شہری بنا دیا گویا بھگوان کو ان کے بھکتوں نے انسان بنا دیا۔ رام للاّ کے صدیوں سے طفولیت کے عالم رہنے پر حیرت جتانے کے بعد سیتا کی رسوئی کا حوالہ دے کر بیک وقت رام کے بچپ اور جوان ہونے کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ انترہ کے مطابق اب چونکہ رام جی کی جائے پیدائش کا سرٹیفکٹ عدالت نے فراہم کر دیا ہے اور ان کا پتہ بھی موجود ہے اس لئے نہ صرف ان کا شناختی کارڈ بنایا جاسکتا ہے بلکہ رائے دہندگان کی فہرست میں بھی انہیں شامل کیا جاسکتا ہے اور اگر اس بات کو آگے بڑھایا جائے تو یہ بھی ہوسکتا ہے ان کا کوئی سرپرست کل کو انتخاب میں ان کی جانب سے کاغذات نامزدگی داخل کر دے۔ ایسے میں کون مریادہ پرشوتم رام کے خلاف انتخاب لڑنے کی جرأت کرے گا اور کیا عدالت میں اس انتخاب کو کالعدم قرار دیا جاسکے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر کوئی رام بھکت رام کے نام حکومت کی تشکیل کا دعویٰ پیش کر دے اور یہ اعلان کرے کہ وہ بھرت کی طرح رام کے کھڑاؤں گدی پر رکھ کر حکومت کرنا چاہتا ہے تو کیا حالات رونما ہوں گے؟ اسکے علاوہ کاؤنٹر کرنٹ نامی سائٹ پر ایم کارتک کا ایک دلچسپ مضمون بھی شائع ہوا، جس میں وشنو کے اوتار وامنا کے خلاف کیرالہ کے دلت راجہ مہابلی کی اولاد کے ذریعہ مقدمہ دائر کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے تاکہ وامنا کی جانب سے کی جانے والی صدیوں قدیم زیادتی کا حساب چکایا جاسکے اور ان تمام مندروں کو جنھیں مسمار کر کے براہمنوں نے اپنی عبادتگاہوں میں تبدیل کر دیا دوبارہ بحال کیا جاسکے نیز کیرالہ کو تقسیم کر کے نصف دلتوں کو دے دیا جائے۔ گویا اس فیصلے کے بعد رزمیہ کہانیوں کے خیالی کرداروں کے اوصاف عوامی بحث کا موضوع بننے لگے اور ان کے ذریعہ ماضی میں کئے جانے والے مظالم کا پردہ فاش ہونے لگا۔ اس بحث کو اگر حکمت کے ساتھ آگے بڑھایا جائے تو شرک کی نفی اور توحید کی دعوت کو عام کرنے کے مواقع پیدا کئے جاسکتے ہیں اور اس کے دوررس نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے ذریعہ مخاطب

کے جذبات کوٹھیس پہونچائے بغیر باطل عقائد کی بیخ کنی اور رائے عامہ کی ہمواری کوممکن بنایا جاسکتا ہے۔ ہندوسماج میں پائے جانے والے اسلم بھورے جیسے سیدھے سادے لوگ جب مکڑی کے اس جال کی حقیقت سے واقف ہو جائیں گے اور کلمہ خبیثہ کے اس شجر کو اکھاڑ پھینکنے میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو جائیں گے تو ملک کا نقشہ بدل جائیگا۔ بظاہر یہ مشکل اور ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن فتح مکہ جس کا حوالہ جسٹس ایس یوخان نے اپنے فیصلے میں کیا ہے عرصہ دراز تک ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ انسانی عقل ونظر محدود ہے لیکن قدرت کے فیصلے کسی حدود و قیود کے پابند نہیں ہیں، ہجرت نبویؑ مشکل ترین حالات میں اٹھایا ہوا بظاہر ایک مدافعانہ اقدام تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بطن سے برپا ہونے والے عظیم انقلاب کا ثانی پیش کرنا تاریخ انسانی کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن چشمِ فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ مغلوبیت کی گھٹا ٹوپ رات کے بطن سے عظمت وسربلندی والا دن نمودار ہوتا ہے۔

کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کردے بھلائی تیرے اختیار میں ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲۶) رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔ (آل عمران۔ ۲۷)

معجزات کا ظہور ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اہلِ ایمان کی ذمہ داری اللہ کے بھروسے حکمت اور موعظت کے ساتھ اپنے فرضِ منصبی کو ادا کرنا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے کی جانے والی جدوجہد کے نتیجہ میں باطل عقائد پوری طرح بے نقاب ہو جائیں اور وطنِ عزیز توحید کی کرنوں سے جگمگا اُٹھے۔ بقول حکیم الامت علامہ اقبال۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

# وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

بابری مسجد کے قضیہ میں الہ بادہائی کورٹ کا فیصلہ سن کر بے ساختہ گاندھی جی کے تین بندر یاد آگئے جو کبھی بھی ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ایک کا ہاتھ منہ پر ہوتا ہے تو دوسرے کا کانوں پر اور تیسرا بیچارہ آنکھیں موند کر بیٹھا رہتا ہے۔ ہائی کورٹ کے جس فیصلے پر تین جج حضرات آپس میں اتفاق نہ کر سکے اس سے بھلا ہندو اور مسلم عوام کے درمیان اتحاد و اتفاق کیوں کر بحال ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود سیاستداں اس کی تلقین کر رہے ہیں میڈیا اسے نہ صرف دوہرا رہا ہے بلکہ توقع بھی کر رہا ہے کہ ایسا ہوگا۔ اگر سیاست سے عدل کا خاتمہ ہو جائے اور عدالت گھٹیا سیاست کی بھینٹ چڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے اگر کوئی جاننا چاہتا ہو تو بابری مسجد کی سیاست اور عدالت کے فیصلوں کو دیکھ لے۔ حالیہ فیصلے نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کو بھی چونکا دیا ہے۔ مسجد گرا کر مندر بنانے والے جو عدالت میں پیش ہونے والے دلائل اور ثبوت سے گھبرا کر یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے خلاف ہونے والے کسی فیصلے کو تسلیم نہ کریں گے۔ اگر عدالت مندر کے حق میں فیصلہ نہیں کرتی تو دستوری ترمیم کی مدد سے اس کی راہ ہموار کی جائیگی۔ جو خوف کے مارے فیصلے کو ٹالنے کی گہار لگا رہے تھے اور عدالت کے باہر سمجھوتے کی تجویز رکھ رہے تھے وہ سب اس فیصلے سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ اور عدلیہ پر مکمل اعتماد کا اظہار کرنے والے مغموم و مایوس ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو اس عدالتی قلابازی کی توقع نہیں تھی سب جانتے تھے کہ اگر فیصلہ ثبوت و برہان کی بنیاد پر ہوا تو یقیناً اس سے مختلف ہوگا۔ مسلمان بیچارے بہت خوش تھے کہ اس بار اتر پردیش میں ان کی بہن مایاوتی کا راج ہے۔ مرکز میں سیکولرزم کی سرغنہ کانگریس کی حکومت ہے جسے بڑے ارمانوں کے ساتھ وہ اقتدار میں لائے ہیں۔ ملک کے ہندو عوام کی دلچسپی رام مندر میں ختم ہو چکی ہے اور ماحول سنگھ پریوار کے خلاف

ہو گیا ہے۔ آئے دن وہشت گردی کے معاملات میں سنگھی رہنماؤں کا ملوث ہونا منظر عام پر آرہا ہے جس سے ان کے حوصلے پست ہوتے جارہے ہیں۔ وشوہندو پریشد کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ برسوں سے ان لوگوں نے دھرم سنسد کا ڈرامہ تک نہیں کیا ہے۔ بی جے پی شدید قحط الرجال کا شکار ہے پرانے رہنماؤں کی ہوا اکھڑ چکی ہے نئے لوگوں میں دم خم نظر نہیں آتا۔ پارٹی کے اندر اختلاف کا بول بالا ہے۔ بی جے پی کو اس بات کا خوف بھی لاحق ہے کہ کہیں خود کانگریس ایسی ریاستوں میں جہاں ان کی حکومت ہے فرقہ وارانہ فساد کروا کر حفظ وامان کا مسئلہ نہ پیدا کر دیں اور مرکز کو ۱۹۹۲ء کی طرح ان کی حکومت برخواست کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اس لئے بی جے پی والے بھی فساد کے بجائے امن کی بولی بولنے لگے ہیں۔ بابری مسجد کا قضیہ عدل وانصاف کے ساتھ چکانے کے لئے اس سے زیادہ سازگار ماحول پھر کبھی میسر آجاتا یہ شاید ہی ممکن تھا اس لئے اس بار انصاف کی توقع میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن جو لوگ کانگریس کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کانگریس کے لئے عدل وانصاف کی کوئی اہمیت ووقعت کبھی بھی نہیں رہی ہے۔ عدل کو قائم کرنے کے لئے جو ہمت و حوصلہ درکار ہوتا ہے اس جماعت کے اندر اس کا ہمیشہ ہی فقدان رہا۔ کانگریس کی تمام تر دلچسپیاں اقتدار کے دائرے میں محصور ہوتی ہیں۔ اس کے دور میں تمام فیصلے سیاسی مفاد کے پیش نظر کئے جاتے ہیں اور کانگریس اس بات سے واقف ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں انصاف کرنے سے زیادہ اہمیت اکثریتی فرقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کو حاصل ہے اس لئے اس نے ماضی میں بھی انصاف کو اپنے قدموں تلے روندا اور اس بار بھی یہی کیا۔ یہ عدالت کا نہیں بلکہ سیاست کا فیصلہ ہے۔ سونیا گاندھی کو ایسا لگ رہا ہے کہ اس سے راہل گاندھی کے وزیر اعظم بننے کا راستہ صاف ہو گیا لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ راجیو گاندھی کے اقتدار سے محرومی کا ایک سبب بابری مسجد کا تالہ کھلوانا بھی تھا۔

کانگریس پارٹی کے پرچم کے تین رنگ ہیں اسی طرح اس مقدمہ کے تین قاضی تھے۔ شرما جی نے زعفرانی دھوتی باندھ رکھی تھی اور اگروال صاحب نے سفیدی مائل کرتا پہن رکھا تھا۔ خان صاحب نے ہرے رنگ کی ٹوپی اپنے سر پر سجا رکھی تھی اس ڈرامے میں ان تینوں کو مختلف کردار نبھانا تھا اس حساب سے انہیں مختلف ملبوسات میں نوازا گیا تھا اور فیصلہ دیکھنے کے بعد اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتی کہ ان تینوں حضرات نے مقدمہ کے ساتھ تو نہیں لیکن اپنے اپنے کردار کے ساتھ ضرور انصاف کیا۔ ان لوگوں نے مشترک فیصلہ سنانے کے بجائے منفرد فیصلے سنائے تاکہ اپنی انفرادیت کو باقی رکھا جاسکے اور عوام کو اس حوالے سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ کون سی

رائے کس شخص کی ہے۔ یہ منظر نامہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ ہندو معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہے ایک سیکولر یعنی بے دین اور دوسرا دیندار یعنی سنگھ پریوار۔ اور ان تینوں کو ہندوستانی سیاست میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس بندر بانٹ کا فائدہ بالآخر ہندوؤں کو ہی ہوتا ہے اس لئے کہ اگر تقسیم برابر بھی ہو جائے تب بھی دو تہائی ان کے حصہ میں چلا جاتا ہے اور مسلمانوں کے حصہ میں ایک تہائی آتا ہے۔ اس پر جمہوری نظام کی قہر سامانی اپنی جگہ ہے، جو ۵۱ رفی صد کو صد فی صد اقتدار سے نوازتا ہے اور ۴۹ رفی صد کو پوری طرح بے اختیار کر دیتا ہے۔

کانگریس کی پرمپرا کا جنھیں علم ہے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر کانگریس چاہتی تو یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انگریزی سامراج کے دوران ایک ہندو اور دو انگریز جج جو ناانصافی نہ کر سکے اور ہندوؤں کی عرضداشت کو تین مرتبہ خارج کر دیا وہ کام کانگریسیوں نے مسلسل کیا۔ مورتیوں کو جب رکھا گیا اس وقت مرکز میں اور ریاست میں کانگریس کی حکومت تھی۔ سنگھ پریوار نہایت کمزور اور لاغر تھا اگر پنڈت نہرو، گووند ولبھ پنت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مورتیاں ہٹا دیتے تو معاملہ بڑی آسانی سے رفع دفع ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ مورتیوں کو ہٹانے کے بجائے مسلمانوں کو عبادت سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد غیر قانونی مندر کا تالہ راجیو گاندی نے اپنے وزیر اعلیٰ این ڈی تیواری کے زمانے میں کھلوایا اور شیلا نیاس کروا کر اعلان کیا مندر وہ (مراد بی جے پی) نہیں بلکہ ہم بنائیں گے۔ بلکہ رام راجیہ کے قیام کا اعلان بھی کر گذرے۔ ان کے بعد جب نرسمہا راؤ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے جان بوجھ کر بی جے پی کو مسجد شہید کرنے کا موقع دیا تا کہ اس سلگتے ہوئے مسئلہ کو ٹھنڈا کر دیا جائے جس کی مدد سے بی جے پی اقتدار میں آنا چاہتی ہے۔ اور مسجد کی شہادت کے دوران گم سم مونی بابا بنے رہے۔ جب مسجد ڈھیر ہو گئی تو غیر قانونی طور پر بنائے گئے کارگذار مندر کو ہٹانے کے بجائے جس کا مشورہ جیوتی باسو نے انہیں دیا تھا نیز اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا تھا، بی جے پی کی چار ریاستی حکومتوں کو برخواست کر کے اپنی سیاسی ابن الوقتی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے لال قلعہ سے مسجد کی تعمیر کا وعدہ کیا بعد میں جب ان سے پوچھا گیا مندر کا کیا ہوگا؟ تو وہ بولے مندر بھی رہے گا۔ اس کے بعد جب پوچھا گیا پھر مسجد کیسے بنے گی؟ تو بولے میں نے یہ کب کہا مسجد وہیں بنے گی۔ ان کے بعد آنے والے سونیا کے کٹھ پتلی منموہن سنگھ نے وہی کیا جو راؤ نے کہا تھا۔ بابری مسجد کی زمین کو عدالت کے ذریعہ تقسیم کروا کر بالآخر وہاں مندر کی تعمیر کا راستہ صاف کر دیا۔ وقت کے ساتھ افراد و کردار بدلتے رہے لیکن افکار و طریقہ کار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اس

لئے کہ اغراض و مقاصد ہمیشہ ہی اقتدار کو حاصل کرنا اور اسے باقی رکھنا ہے۔ ایسے میں مسلمانوں کی حالت پر فیض کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

کانگریس کی یہ روایت بہت پرانی ہے۔ آزادی سے قبل بھی اس کے پاس گاندھی جی کے تین بندروں کی مانند تین رہنما تھے جن کی مدد سے سیاست کھیلی جاتی تھی۔ جج اگروال سے مشابہت رکھنے والے پنڈت نہرو۔ شرما جی کی طرح دکھائی دینے والے سردار پٹیل اور خان صاحب کی جگہ مولانا آزاد براجمان تھے اور ان تینوں کی مدد سے ملک کو اسی طرح تقسیم کیا گیا تھا جیسے آج بابری مسجد کی زمین کو تقسیم کر دیا گیا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے حصہ میں تقریباً ایک تہائی اور ہندوؤں کو دو تہائی حصہ ملا تھا۔ وجوہات پر غور کیا جائے تو زبردست مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائد اعظم کا اپنا وقار تھا اسی کے ساتھ وہ پکے کانگریسی بھی تھے لیکن ایک خاص مرحلے میں انہوں نے بادل ناخواستہ کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کی اس کی جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ناگپور میں منعقد ہونے والے کانگریس کے ایک اجلاس میں انہوں نے گاندھی جی کو مہاتما گاندھی کہنے کے بجائے مسٹر گاندھی کہہ کر مخاطب کیا۔ اس پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا لوگ ان سے مہاتما کا استعمال کرنے پر اصرار کرنے لگے۔ ایسا کرنے والوں کے پاس گاندھی جی کے مہا آتما ہونے کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں تھا۔ یہ آستھا کا پرشن (سوال) تھا۔ اب یہ تو ہوسکتا تھا کہ جو گاندھی جی کو مہاتما سمجھتا ہے وہ انہیں مہاتما کہہ کر پکارے اور جو نہیں سمجھتا اس کے مسٹر کہہ کر پکارنے کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس رواداری کا مظاہرہ نہیں ہوا خود گاندھی جی نے بھی ان ہنگامہ کرنے والوں کی ترسمہاراؤ کی مانند خاموش تائید کر دی۔ جناح سمجھ گئے کہ اگر یہ لوگ مجھے برداشت نہیں کر سکتے جبکہ میں انکی اپنی پارٹی کا ایک معتبر رہنما ہوں تو عام مسلمان آدمی کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ یہ واقعہ آنے والے دور کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس کے بعد پارٹی اور پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ کانگریس نے اس کے لئے راہیں ہموار کیں اور اب آستھا کی بنیاد پر بغیر ثبوت اور دلیل کے بابری مسجد کی زمین تقسیم ہو گئی اس میں بھی کانگریس نے اہم کردار ادا کیا۔

تین جج حضرات کی بیچ کے فیصلوں کا گاندھی جی کے تین بندروں کے رویہ سے موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ خان صاحب نے برائی کو دیکھا اور سنا لیکن بولنے سے کسی قدر گریز کیا اور برامت

بولو کی نصیحت پر عمل کیا۔ یہ تو کہا کہ بابری مسجد کو بنانے کے لئے کسی مندر کو توڑا نہیں گیا۔ وہاں پر اس وقت کوئی مندر نہیں تھا۔ یہ بھی کہہ گئے کہ ۲۲ردسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں وہاں مورتیاں لاکر رکھی گئیں ۔لیکن یہ نہ کہہ سکے کہ مورتیوں کو وہاں لاکر نصب کرنا اولین غلطی تھی اور دوسری غلطی ۱۹۸۹ء میں اس وقت ہوئی جب عدالت کی مدد سے مسجد کا تالہ کھلوا کر وہاں پوجا کی اجازت دی گئی اور تیسری غلطی کے طور پر سپریم کورٹ میں کی گئی یقین دہانی کو بالائے طاق رکھ کر ۶ردسمبر ۱۹۹۲ء کے منحوس دن بابری مسجد کو شہید کر دیا گیا اور وہاں رام جی کا غیر قانونی مندر بنا دیا گیا۔ اب چوتھی غلطی خود انہوں نے کی اور اپنے فیصلے میں یہ لکھ دیا کہ متنازعہ زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جس میں سے ایک حصہ مسلمانوں کو دے دیا جائے اسی کے ساتھ مورتیوں کو اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جائے۔ یہ مورتیاں دوسرے دو ججوں کے لئے آستھا کا معاملہ تھیں لیکن خان صاحب کے لئے محض ملازمت کا سوال کا تھا اور وہ اسے قربان نہیں کر سکے۔ ان کے منہ پر ترنگی سیاست کا تالہ پڑا ہوا تھا۔ شریمان اگروال نے برا مت دیکھو پر عمل کرتے ہوئے برائی کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں صرف برا بھلا سنا اور اور وہی کچھ بول گئے۔ انہوں نے کہا کہ رام کی جائے پیدائش وہی ہے جہاں مورتیاں نصب کی گئی ہیں اس لئے کہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ و ایمان ہے۔ دراصل اگروال صاحب یہ بھول گئے کہ ان سے یہ بات پوچھی ہی نہیں گئی تھی کہ ہندوؤں کا عقیدہ کیا ہے؟ اور اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ الہ آباد کی عدالت لکھنؤ کے بجائے نیویارک میں بیٹھ کر فیصلہ سنا رہی ہے تو اس سے لکھنؤ، نیویارک نہیں بن جاتا۔ آستھا کی بنیاد پر زمین کا مالکانہ حق طے نہیں ہوتا۔ اس لئے انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے بجائے دودھ میں اس قدر پانی ملا دیا کہ انصاف کی دیوی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ انہوں نے چونکہ حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لئے یہ بول گئے کہ متنازعہ عمارت (مراد بابری مسجد) کے اندر دونوں مذاہب کے ماننے والے عبادت کیا کرتے تھے لیکن باہر کے حصہ کو جسے صرف ہندو استعمال کرتے تھے نرموہی اکھاڑے کو دان کر دیا جائے۔ اگروال صاحب کا یہ قیاس سراسر زمینی حقائق سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ عدالت کے گزشتہ مقدمات کو بھی دیکھ لیتے تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوجاتی کہ مسجد کے اندر ۱۹۴۹ء تک صرف اور صرف مسلمان عبادت کرتے رہے۔ اس کے بعد عدالت نے رام کی مورتی کو بھوگ لگانے کا حکم دیا اس سے قبل وہاں کبھی بھی ہندوؤں نے عبادت نہیں کی۔ لیکن عدالت کے فیصلوں کو بھلا وہ شخص کیسے پڑھ سکتا ہے جس کے آنکھ پر سفید پٹی بندھی ہو۔ شرما جی کے کانوں میں کانگریس نے سیسا گھول کر پلا دیا تھا اس لئے ان کو کوئی گواہی سنائی نہیں دیتی تھی ان کی آنکھوں پر اس

قدر گہری زعفرانی عینک چڑھی ہوئی تھی کہ ان کو ہر شئے میں زعفرانی رنگ نظر آتا تھا اور ان کے ہر لفظ سے گیروا کذب ٹپکتا تھا۔ شرما جی نے بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ دیا کہ بابر نے رام مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنائی تھی اس لئے اسلامی شریعت کے مطابق وہاں مسجد کی تعمیر ہی غلط تھی گویا مسلم پرسنل لا بورڈ سے بہتر اسلام کی ترجمانی کرنے کا حق ادا کرنے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے لی۔ ان کی اندھی عقیدت کا یہ مظہر بھی قابل ذکر ہے کہ ایک طرف تو یہ مانا ۱۹۴۹ء میں رام کی مورتی کو مسجد میں رکھا گیا لیکن یہ بھی کہا کہ رام کی پوتر آتما اس جگہ ہمیشہ ہی موجود تھی ہے۔ اس لئے شرما جی نے اس پورے خطہ اراضی کو بلاشرکت غیرے رام مندر کی تعمیر کے لئے وقف کرتے ہوئے سنی وقف بورڈ کا دعویٰ سرے سے خارج ہی کر دیا۔ وہ شرما جی کی ملازمت کا آخری دن تھا اس لئے انہوں نے حکومت کی مرضی سے انحراف کرنے کی جرأت رندانہ کر ڈالی۔ حکومت نے اسے برداشت کر لیا اس لئے کہ اس سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا تھا یا ممکن ہے ان کے لئے حکومت نے اسی طرح کی کردار نگاری کی ہو۔ گویا کہ تینوں ججوں کا صرف ایک بات پر اتفاق تھا کہ رام کی مورتی کو اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جائے اس طرح گاندھی جی کے ان تینوں بندروں نے اپنے اپنے طریقہ سے متفقہ طور پر انصاف کی دیوی کو آستھا کی سولی پر لٹکا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الہ باد بنچ کا یہ فیصلہ عدالتی نہیں بلکہ سیاسی تھا اور اس سے انہیں لوگوں کو مایوسی ہوئی جو کانگریس پارٹی کی تاریخ کو بھلا کر اس سے غلط توقعات باندھے ہوئے تھے۔ اس فیصلے سے جو پیغام جاتا ہے وہ اس طرح ہے کہ جمہوری ہندوستان میں آپ کسی کی عبادت گاہ میں منہ اندھیرے مورتیاں ڈال دیں پھر عدالت میں جا کر اس کو قفل لگوا دیں اور پھر تالہ کھلوانے کے لئے تحریک چلائیں۔ اس کے بعد رتھ یاترا نکال کر اس عمارت کو مسمار کر دیں۔ فسادات کروا کر لوگوں کو دہشت کردیں۔ حکومت مجرمین کو سزا دینے کے بجائے مخالفین کی حکومت برخواست کر کے اپنا سیاسی مقصد حاصل کر لے گی۔ حقائق کی تفتیش کے لئے جسے ساری دنیا نے ٹیلی ویژن پر دیکھا ہو کمیشن قائم کر دیا جائے گا اور برسوں کی تحقیقات کے بعد کوئی وظیفہ یافتہ جج مجرمین کی نشاندہی کرے گا سرکاران کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی بلکہ اس کی آنچ پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکے گی اور جب مناسب سمجھے گی انصاف کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کی لاش کو تقسیم کر دیا جائیگا۔

گاندھی یونیورسٹی کا کوئی ریسرچ اسکالر اگر گاندھی جی کے تین بندروں پر اپنی تحقیق کا موضوع بنائے تو نہایت دلچسپ حقائق اسکے سامنے آئیں گے۔ خود ڈارون بھی ان انکشافات سے حیران رہ جائے گا۔ اس کے مفروضے کی زنجیر کا غائب چھلا اس تحقیق کے نتیجے میں اس کو حاصل ہو

جائے گا۔ مثلاً اس تحقیق کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ آخر گاندھی جی کو ان تین کاموں کے لئے تین بندروں کی ضرورت کیوں پڑی؟ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کوئی ایک ہی بندر یہ تینوں کام کر دیتا؟ اور پھر اس کو کرنا تو کچھ تھا نہیں۔ گاندھی جی نے انہیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ اچھا بولو یا اچھا سنو اور اچھا دیکھو بلکہ تین بری باتوں سے رکنے کا اپدیش دیا تھا بس۔ سو کیا ملک کی اس عظیم آبادی میں انہیں کوئی ایک بندر بھی ایسا میسر نہ آیا جو ان تینوں برائیوں سے اپنے آپ کو روک پاتا؟ تاکہ وہ اسے علامت کے طور پر پیش کر سکتے؟ وہ محقق اگر اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی خاطر کانگریس پارٹی دانشوروں سے رابطہ قائم کرے تو اسے بتلایا جائے گا کہ مہاتما جی نہایت حقیقت پسند آدمی تھے انہوں نے یہ نصیحت کانگریس پارٹی کے کارکنان کو کی تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس کل یگ کے سیاستداں سر سے پیر تک برائیوں میں لت پت ہیں اگر ایسے میں وہ ان کی کوششوں سے کسی ایک آسان سی برائی سے بھی بچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ گاندھی جی جیسے بھی تھے لیکن تھے نہایت دور اندیش آدمی۔ آزادی سے قبل انہوں نے جمہوری نظام کے اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ آج اگر وہ اپنی پیشین گوئی کو الہ آباد عدالت کے اندر حقیقت میں بدلتے دیکھتے تو یقیناً ان کی آتما کو بڑی شانتی ملتی۔ گاندھی جی شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ انسان کے پاس آنکھ کان اور زبان کے علاوہ ہاتھ، پیر اور سر بھی ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ سے بھی لوگ برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور پھر دل، دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ ان کا کیا کہنا وہ تو بڑی بڑی برائیوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں لیکن کانگریس کی شریعت میں ان عظیم برائیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کانگریس کی پراچین سنسکرتی کو جب جمہوری لباس میسر آ جاتا ہے اس کے مضرات میں سیکڑوں گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ بھی گاندھی جی کے تین بندروں کی طرح اپنا اپنا کردار نبھانے لگتے ہیں۔ ان میں سے عدلیہ کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوتی ہے وہ برائی کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن جھوٹے گواہوں کی باتوں کو سن کر غلط سلط فیصلے سنانے سے گریز نہیں کرتا۔ انتظامیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ برائی کو دیکھتا ضرور ہے اور بری باتیں سنتا بھی ہے لیکن اپنی زبان کو اس کے خلاف کوئی جنبش نہیں دیتا اس کے منہ پر تالہ پڑا ہوتا ہے۔ اور مقننہ کی دنیا ہی نرالی ہوتی ہے وہ کسی کی ایک نہیں سنتا اس کے کانوں میں روئی پھنسی ہوتی ہے وہ برائیوں کو چشم زدن سے دیکھتا ہے اور بے تکان اول فول بکتا رہتا ہے۔ اس نظام حکومت میں کسی کو بھی گاندھی جی کے بندروں کی طرح برائی کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہر کوئی برائیوں کا استحصال کرنے میں جٹا رہتا ہے اور حسب ضرورت انہیں فروغ دینے سے بھی نہیں کتراتا۔ اس باب میں ایک اہم اضافہ

اس وقت ہوا جب گروگولوالکر کے شاگردوں نے وقتی طور پر گاندھیائی سوشلزم کا چولہ پہنا۔ انہوں نے یہ کیا کہ ایک ہی بندر کیلئے تین مکھوٹے بناد ئے جو وقت ضرورت انہیں اپنے چہرے پر چڑھا لیتا تھا اس لئے کبھی تو ایسا دکھائی دیتا تھا اس کا ہاتھ منہ پر رکھا ہوا ہے اور کبھی لگتا تھا وہ کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے اور کبھی کبھار اس کے ہاتھ آنکھوں پر بھی نظر آجاتے تھے حالانکہ ان کے حواس خمسہ ہمیشہ ہی اقتدار کی جانب متوجہ رہتے۔ اس معاملے میں ساری سیاسی جماعتیں یکساں ہیں کسی کو کسی پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے اسی لئے بابری مسجد کے فیصلے پر تمام لوگوں کا ردعمل تقریباً یکساں ہے۔ مسئلہ افراد یا جماعتوں کا نہیں نظام کا ہے۔ اس نمک کی کان میں جو بھی جاتا ہے نمک بن جاتا ہے۔ اور اسی لئے شہید گنج گردوارے کی طرح کا دوٹوک فیصلہ پاکستان جیسے مذہبی ملک میں تو ہو جاتا ہے۔ مسجد کو عدالت چند ماہ کے اندر دلائل کی بنیاد پر سکھوں کے حوالے کر دیتی ہے اس پر نہ سیاست ہوتی ہے اور نہ فساد رونما ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں آزادی، جمہوریت، مذہبی رواداری اور سیکولرزم کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ایسا نہیں ہو پاتا۔ جمہوری نظام کے اندر سیاسی رہنماؤں کی جو مجبوری ہوتی ہے وہ چار سو سال قبل پرانے شاہی نظام میں نہیں تھی اس کے باوجود بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ ہندو عوام کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا لیکن عدالت کے حالیہ فیصلے کے بعد کیا آج کا بابر بھی اپنے بیٹے کو وہی تلقین کر سکے گا۔ وہ تمام لوگ جن میں ڈاکٹر موہن بھاگوت سے لیکر شاعر جاوید اختر شامل ہیں اور جو ماضی کو بھلا کر مستقبل کی طرف دیکھنے کی بات کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ چار سو سال پرانے بابر نے تو کسی مندر کو توڑ کر وہاں مسجد تعمیر نہیں کی تھی لیکن کیا چار سو سال بعد آنے والا بابر اس مسجد کو بھول جائے گا جسے توڑ کر اس کی جگہ مندر کی تعمیر کی گئی ہو؟ یہ سوال کسی تحقیق کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا جواب سب جانتے ہیں۔ سنی وقف بورڈ نے مجبوراً سپریم کورٹ میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ممکن ہے ہندو فریق بھی وہاں پہونچ جائے اور پھر ایک بارئی مہا بھارت چھڑ جائے لیکن سپریم کورٹ کے بعد اس دنیا کے تمام عدالتی دروازے بند ہو جائیں گے لیکن مسجد کی بازیابی کی تحریک ختم نہ ہوگی وہ تحریک مسجد کی تعمیر تو تک جاری رہے گی لیکن سپریم کورٹ کے ناموافق فیصلے کے بعد کا مرحلہ خاصہ تلخ ہوگا بقول شاعر

یہ شاخ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصل گل کے آنے تک
ضمیر ارض میں اک زہر گھول جائے گی

# روحِ امم کی ممات کشمکشِ انتخاب

ہندوستان میں منعقد ہونے والے حالیہ ریاستی وضمنی انتخابات میں ہر سیاسی گروہ کیلئے کوئی نہ کوئی اطمینان کا پہلو موجود ہے اور وہ اس پر شادمان ہے۔ گویا کہ ایک ''فیل گڈ'' کی سی صورتحال ہے۔ اس لئے کہ انتخابی سیاست میں لوگ نہ صرف اپنی فتح سے خوش ہوتے ہیں بلکہ اپنے دشمن کی ناکامی پر بھی بغلیں بجاتے ہیں اس سے قطع نظر کہ اسے شکست سے کس نے دوچار کیا ہے۔ ان انتخابات میں چونکہ سب کچھ توقع کے مطابق ہوگیا اس لئے مبصرین کیلئے بھی کچھ زیادہ سمجھنے سمجھانے کا موقع نہیں رہا۔ بظاہر کانگریس پارٹی کو پانچ میں سے دو ریاستوں میں راست کامیابی ہوئی اور ایک میں اس کی حلیف ترنمول جیت گئی اس طرح کل ملا کر تین کامیابیاں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کانگریس پانچوں ریاستوں میں کامیاب ہوگئی ہے۔ پڈوچیری کے رنگا سوامی فروری تک کانگریس میں تھے اور اس سے قبل کانگریس کی بدولت کئی مرتبہ مختلف وزارتیں بشمول وزارت اعلیٰ پر براجمان رہ چکے ہیں دو سال قبل ان کو کانگریس نے ہٹایا اور دو ماہ قبل انہوں نے بغاوت کر کے اپنی علیحدہ پارٹی بنائی تاکہ کانگریس کو سبق سکھلایا جاسکے۔ کانگریس کو انہوں نے دھول چٹادی اور انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب کانگریس والے ان سے پھر پینگیں بڑھائیں گے اور جلد ہی وہ سسرال سے میکے لوٹ آئیں گے۔ جئے للیتا کے معاملے میں بھی یہی ہوگا۔ سب سے پہلے کانگریس پارٹی ڈی ایم کے سے خلع حاصل کرے گی اور پھر اے آئی ڈی ایم کے سے بیاہ رچالے گی۔ یہ شادی خانہ آبادی دونوں کے لئے فائدے کا سودہ ہے۔ تمل ناڈو میں کانگریس کا اپنا تو یہ حال ہے کہ فلمی اداکار وجئے کانتا کی نو زائیدہ ڈی ایم ڈی کے نے بھی اس سے پانچ گنا زیادہ نشستیں حاصل کی ہیں ایسے میں کرونا ندھی کے خزاں رسیدہ درخت سے امربیل کی مانند لپٹے رہنے بہتر ہے کہ اماں کی چھتر چھایا میں پناہ لی جائے۔

ویسے ملک کے وزیرداخلہ چندمبرم کی اپنی ریاست میں ان کی پارٹی کا یہ حال برسراقتدار جماعت کے لئے شرمناک ہے۔ لیکن سیاست کے گلشن میں شرم نام کی چڑیا پر نہیں مارتی۔

آئی پی ایل کرکٹ سرکس اور ہندوستانی سیاست میں بڑی زبردست مشابہت ہے۔ کرکٹ کے موسم کا آغاز کھلاڑیوں کی نیلامی سے ہوتا ہے۔ بولیاں لگتی ہیں اور اونچی اونچی قیمت پر اپنے آپ کو فروخت کر کے نامور کھلاڑی مختلف ٹیموں سے جڑ جاتے ہیں اور پھر ان ٹیموں کے درمیان جیت ہار کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی سیاست میں انتخاب سے قبل بولیاں لگتی ہیں، ایمان بکتے ہیں اور مادی مفاد کی بنیاد پر نت نئے رشتے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ سیاسی اکھاڑے میں بھانت بھانت کی ٹیمیں خم ٹھونک کر اتر جاتی ہیں اور موسمی مینڈک کی مانند ٹرانے لگتی ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں میں سر فہرست قدیم ترین فرقہ پرست کانگریس اور پھر دوسرے نمبر پر فسطائیت نواز بی جے پی۔ ان دونوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ قومی جماعتیں ہیں لیکن اصل میں ان کی حیثیت بھی علاقائی ہو گئی ہے فرق صرف یہ ہے کہ دیگر علاقائی جماعتوں کے بالمقابل جن کا وجود کسی ایک ریاست تک محدود ہو یہ ایک سے زائد ریاستوں کی علاقائی جماعتیں ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسی بھی کئی ریاستیں ہیں جن میں ان کی حیثیت علاقائی جماعت کے بغل بچہ کی سی ہے مثلاً تمل ناڈو، بہار یا بنگال۔ نظریاتی سطح پر ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہاں طریقہ کار کچھ تھوڑا سا مختلف ہے۔ ایک اقلیتوں کے خلاف علی الاعلان تشدد کو بھڑکاتی ہے اور دوسری پس پردہ اس کو ہوا دیتی ہے گویا ایک گرم شعلوں سے جلاتی ہے اور دوسری ٹھنڈی آنچ سے جھلساتی ہے۔ احساس کا فرق ضرور ہے لیکن نتائج یکساں برآمد ہوتے ہیں۔ بابری مسجد ہو مسلم نوجوانوں کا انکاؤنٹر ہر دو صورت میں بی جے پی اور کانگریس کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایک ممبئی کے فسادات سے متعلق شری کرشنا کمیشن کی رپورٹ کو ڈنکے کی چوٹ پر کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہے اور دوسری عدالت عالیہ میں اس کی خاطر خواہ پیروی سے صرف نظر کر کے اس پر عملدرآمد میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ نہ تو بابری مسجد کی اراضی مسلمانوں کو ملتی ہے اور نہ ہی ممبئی میں فساد برپا کرنے والے ہندوؤں کو سزا ہی ملتی ہے۔ ہاں ممبئی بم بلاسٹ میں معصوموں کو برسوں تک جیل میں رکھنے پر دونوں کا اتفاق ہے اور اس معاملے میں وہ ایک دوسرے کا بھرپور تعاون کرتی ہیں۔

ان دو جماعتوں کے علاوہ مختلف علاقائی موقع پرست جماعتیں ہیں جن کا نظریہ حیات ہے ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ ان کا کام کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرنا یا اس میں حصہ دار بن کر

رہنا ہے۔ اس لئے یہ کبھی بی جے پی تو کبھی کانگریس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔ اب اس امر کی پیشن گوئی کرنے کے لئے کسی نجومی کی ضرورت نہیں کہ آئندہ قومی انتخابات میں جے للیتا کانگریس اور کرونا ندھی بی جے پی کے ساتھ ہوں گے اور اگر کانگریس الکشن ہار جاتی ہے تو اماں پھر پینترا بدل کر بی جے پی کی ہمنوا بن جائینگی بلکہ بنگال کی دیدی بھی ایسا کرنے سے گریز نہیں کرینگی۔ اشتراکیت پسند بظاہر اپنے آپ کو علاقائی جماعتوں سے مختلف گروہ قرار دیتے ہیں لیکن سوویت یونین کے خاتمہ اور چین کی سرمایہ داری نے ان بیچاروں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں ہیں نیز بدھ دیو بھٹا چاریہ نے اس دعویٰ کی بھی نفی کر دی کہ ہم ان سے مختلف ہیں اس لئے اب اس کا شمار بھی علاقائی جماعت میں ہونا چاہئے جس کا اثر کیرالا، بنگال اور تریپورہ پر محیط ہے۔ ان کے علاوہ مسلم جماعتیں بھی ہیں مثلاً مسلم لیگ، اتحاد ملت، یونائیٹڈ فرنٹ اور ایم ایم کے وغیرہ جو فسطائیت کے خلاف فرقہ پرستوں اور موقع پرستوں کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔ تو گویا ان چاروں اقسام کی جماعتوں کے لئے ان انتخابات کے نتائج میں مسرت کا کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہے۔

کانگریس کو سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ وہ آسام میں تیسری مرتبہ اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب ہوگئی لیکن آسام گن پریشد اور اس کی حلیف بی جے پی کی خستہ حالی کے پیش نظر توقع بھی یہی تھی۔ اے جی پی فی الحال پوری طرح کوما میں ہے اس کا نام انتخابات کے علاوہ کبھی بھی سننے میں نہیں آتا اور بی جے پی اس کی بیساکھیوں پر سوار ہو کر انتخاب لڑنے کی کوشش کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اجمل کی یونائیٹڈ فرنٹ اور بوڈولینڈ پارٹی نے بھی اے جی پی سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ ویسے یونائیٹڈ فرنٹ کو بیک وقت خوشی اور غم سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ تو ضرور ہوا کہ پہلی مرتبہ اسے ریاست میں حزب اختلاف کی رہنمائی کا موقع ہاتھ آیا لیکن اے جی پی اور بی جے پی کی مایوس کن کارکردگی پر اسے افسوس ضرور ہوا ہوگا۔ اگر اس بار وہ دونوں مزید بیس نشستوں پر کامیاب ہو جاتے تو کانگریس کو اکثریت حاصل کرنے کے لئے یونائیٹڈ فرنٹ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا اور اس صورت میں بھی حکومت تو بہرحال کانگریس ہی کی بنتی لیکن فرنٹ کے کچھ ممبران اسمبلی کو وزیر بننے کا موقع بھی مل جاتا یہ سوئے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے دشمنوں کی ناکامی نے ایک مسلم سیاسی جماعت کو اقتدار میں حصہ داری سے محروم کر دیا۔ اب عقل عام کیا کہتی ہے یونائیٹڈ فرنٹ کو بی جے پی کی کمزوری کی دعا کرنی چاہئے یا اسے تقویت دینے کی کوشش کرنی چاہئے؟ ویسے کسی مسلم جماعت کے اپوزیشن کی سب پارٹی بن جانے کو بھی بھولا بھالا

عام مسلمان اپنے لئے باعثِ سعادت ہی سمجھتا ہے۔

آسام کی محرومی کا ازالہ بڑی حد تک کیرالہ میں ہوگیا۔ وہاں مسلم لیگ متحدہ محاذ میں دوسرے نمبر کی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اب اگر کانگریس کے ۲۷ ممبران اسمبلی ہیں تو مسلم لیگ کے نصف سے زیادہ یعنی ۲۰ ہیں اس طرح صرف چار کے فرق سے اقتدار سنبھالنے والا متحدہ محاذ اگر مسلم لیگ کو نائب وزارت اعلیٰ کی کرسی نہ دے تو یہ یقیناً حیرت کی بات ہوگی۔ اس طرح کی صورتحال میں بے چارہ عام مسلمان جو انتخابی سیاست کے پیچ وخم سے واقف نہیں ہوتا یہ دیکھ کر پریشان ہوتا ہے کہ دو قطبی ماحول میں مسلم جماعتیں متحد ہو کر کسی ایک کا ساتھ دینے کے بجائے مخالف خیموں میں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جاتی ہیں۔ اس غریب کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ انتخابی سیاست بھی تجارت کی مانند ہے جہاں ایک کمپنی بیک وقت دو حریف دوکانداروں کو اپنا ایجنٹ نہیں بنا سکتی اس لئے دونوں حریف ایجنٹوں کو حریف سرمایہ داروں کی ایجنسی لینی پڑتی ہے۔ اب اگر مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ ہے تو بھلا کسی اور مسلم سیاسی جماعت کو وہ کیوں منہ لگائے گی اور ایسے میں اس جماعت کے لئے کانگریس کے حریف خیمے میں جانے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار کیونکر ہوگا اب اس مجبوری کے پیش نظر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی بدعنوان سے ہاتھ ملانا پڑے یا نظریاتی دشمن کی تائید کرنی پڑے اسی کو انتخابی مجبوری کہتے ہیں جسے لوگ ازخود اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس مجبوری کے تحت اکثر ملی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے لیکن انتخابی سیاست میں اپنی جماعت کا فائدہ قومی و ملی مفاد سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

اشتراکیوں کو اس بار دوہرہ زخم لگا لیکن یہ بھی توقع کے مطابق ہی تھا۔ کیرالہ میں ہر پانچ سال کے بعد اقتدار سے بے دخل ہونے کی روایت اس طرح قائم ہوئی ہے کہ اگر اس میں انحراف ہوتا تو وہ حیرت کی بات ہوتی۔ ویسے کمیونسٹوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وزیر اعلیٰ اچھوت آنند انہیں جیت کا آنند نہیں دلا سکتے اس لئے انہیں انتخاب سے پہلے ہی اچھوت بنا کر دور کر دیا گیا لیکن وہ پینترہ بھی کام نہ آیا اور کیرالہ کی روایت برقرار رہی۔ مغربی بنگال میں گذشتہ پارلیمانی انتخاب کے دوران ہی اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ سرخ سورج روبہ زوال ہے۔ دراصل بنگال کی ناکامی کو لوگ بدھادیو کے سر منڈھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے گورباچیف کی طرح اشتراکی نظریات سے انحراف کیا اور اس کی سزا خود بھی پائی اور پارٹی کو بھی شکست سے دوچار کیا حالانکہ بدھادیو نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جو اشتراکی روایات کے خلاف ہو ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جلد بازی کی۔ اشتراکی

طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے مزدوروں کو متحد کر کے ان کی طاقت کے بل بوتے پر انقلاب لاؤ اور پھر اپنے مخالفین کو انقلاب کا دشمن قرار دے کر ان کا قلع قمع کردو۔ اس کے بعد سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر انہیں محنت کشوں کا استحصال کرو۔ یہی کچھ ان لوگوں نے سابقہ سوویت یونین میں اور پھر چین میں کیا۔ بدھا دیو نے یہ کام انقلاب سے قبل شروع کر دیا اور سندی گرام میں اپنے چہرے پر پڑی خوشنما نقاب خود اپنے ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنی سیٹ بھی نہیں بچا پائے۔ اشتراکیوں نے دیہی علاقوں میں ایک زبردست مافیا قائم کر رکھا تھا جس کی کمر توڑنے کا عظیم کارنامہ ممتا بنرجی نے انجام دیا اس کے لئے وہ یقیناً مبارکباد کی مستحق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اشتراکیوں کے چالیس فی صد ووٹ محفوظ ہیں اور وہ پرامید ہیں اگلی مرتبہ جب لوگ ممتا سے مایوس ہوں گے تو پھر ان کے بھاگ کھلیں گے اور کیرالہ میں وہ ریاستی روایات کے چلتے پھر ایک بار اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ ویسے بھی عوام کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے ورنہ وہ دوبارہ جے للیتا کو بدعنوانی کے مدعے پر اقتدار نہیں سونپتے۔ ممتا بنرجی نے جس طرح دل کھول کر مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا اسے دیکھ کر نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ مسلمان اس بات سے بھی بہت خوش ہیں کہ اس بار بنگال اسمبلی میں مسلم ممبران کی تعداد ۲۰ رفی صد سے زیادہ ہوگئی لیکن اس سے پہلے بھی یہ تعداد کم نہیں ہوتی تھی ۴۵ رسے زیادہ وہ پہلے بھی تھے اور ریاست میں ایک نام نہاد مسلم نواز پارٹی نے ۳۴ رسال حکومت کی اس کے باوجود سچر کمیشن نے یہ انکشاف کیا کہ مغربی بنگال کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب مودی کے گجرات سے کم ہے اس لئے اگر مسلمان اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ ان کے ممبران کی تعداد میں اضافہ یا ان کی نام نہاد ہمدرد حکومت سے ملت کا کوئی بھلا ہو جاتا ہے تو انہیں اپنی طرز فکر کی اصلاح کر لینی چاہئے۔

اس بار اتفاق سے جن ریاستوں میں انتخابات ہوئے ان میں ایسی ایک بھی ریاست نہیں تھی جہاں بی جے پی مضبوط ہو۔ اس لئے وہ حاشیے پر رہی لیکن کرناٹک جہاں بی جے پی کی ریاستی حکومت کو اندر سے بغاوت کا سامنا ہے۔ اس کے ۱۱ رممبران اسمبلی کے پارٹی سے استعفیٰ دینے سے حکومت اقلیت میں آگئی ہے اس کے باوجود ضمنی انتخاب میں تینوں نشستوں پر اپنی زبردست کامیابی درج کر دا کر بی جے پی نے ثابت کر دیا کہ اس کے اپنے گڑھ میں وہ اب بھی مضبوط ہے اور وزیر خارجہ کرشنن ملک سے باہر جو کچھ بھی کر لیں لیکن اپنی ریاست میں بری طرح ناکام و نامراد ہیں۔ اس بار پڈوچیری کی طرح آندھرا پردیش میں وائی ایس آر کے بیٹے جگن موہن ریڈی نے کڑپا پارلیمانی حلقے

سے کانگریس اور ٹی ڈی پی دونوں کے امیدواروں کی ضمانت ضبط کروا کر کانگریسی رہنماؤں کی نیند اڑا دی ہے۔ جگن موہن نے اپنے باپ کی موت کے بعد وزارت اعلیٰ کی کرسی پر اپنی دعویداری پیش کی تھی جسے کانگریسی اعلیٰ کمان نے ٹھکرا دیا لیکن اب پانچ لاکھ چالیس ہزار ووٹوں سے اپنی کامیابی درج کروا کر اس نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس کو یہ سودہ مہنگا پڑ سکتا ہے۔

ٹی وی کے پردے پر جب مختلف جماعتوں کے کارکنان کو ناچتے گاتے دکھلایا جا رہا تھا اس وقت مرکز کے کانگریسی رہنما سرمایہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر ملک کے عوام کا اپنے خاص انداز میں شکریہ ادا کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب لوگوں پر سے کامیابی کا خمار اترا تو انہیں پتہ چلا کہ پٹرول کی قیمت میں پانچ روپئے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ اضافہ اب اس قدر جلدی جلدی ہونے لگا ہے کہ عام آدمی کے لئے گذشتہ ایک سال کے اندر ایندھن کے اخراجات دوگنا ہو چکے ہیں اور عوام یہ بھی جانتے ہیں کہ اشیاء خورد ونوش کی قیمتوں پر بھی اس کا اثر یقیناً پڑے گا۔ ویسے اب بیچاری کانگریس بھی کرے تو کیا کرے؟ اسے ان سرمایہ داروں کو اپنا روپیہ وصول کرنے کا موقع تو دینا ہی ہے جنھوں نے پچھلے انتخابات میں چندہ دیا تھا بلکہ اگلے انتخابات تک کمانے کا موقع بھی دینا ہے تاکہ پھر دوبارہ چندہ لیا جا سکے۔ کانگریسی رہنما جگدمبیکا پال کے مطابق بین الاقوامی سطح پر تیل کی قیمت میں اضافے کے سبب صارفین پر یہ بوجھ ڈالنا پڑا لیکن بین الاقوامی بازار میں جب تیل کی قیمت کم ہوتی ہے تو اس وقت حکومت کو عوام کا خیال نہیں آتا۔ ان کو راحت پہونچانے کے بجائے جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے عوامی نمائندے تیل کی قیمت میں کمی کو اپنے لئے رحمت جان بنا کر اس منافع کو اپنے سوئیس بنک کھاتوں میں جمع کر دیتے ہیں تاکہ ان کی پشت در پشت اس پر عیش کر سکے۔ انتخابات کے بعد عوام الناس کا استحصال یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ گذشتہ ۶۱ رسالوں سے یہ عمل بدستور جاری ہے لیکن اس کے باوجود لوگ اس جنجال سے نکلنے کے بجائے اس میں پھنستے بلکہ دھنستے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے تو کہا تھا 'جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی' لیکن ہمارے آج کل کے دانشوروں نے انقلاب کو انتخاب سے بدل دیا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح 'روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب' ہے اسی طرح 'روح امم کی ممات کشمکشِ انتخاب' ہے۔

# صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک

ڈاکٹر بنایک سین کو بالآخر رہائی نصیب ہوگئی۔ اس موقع پر ان کی ۸۴ رسالہ ماں انوسویا نے کہا "آج میں بہت خوش ہوں، میں چاہتی ہوں کہ اس دنیا کے ہر انسان کو اس طرح کی خوشی نصیب ہو جیسی کہ آج مجھے ملی ہے۔" انوسویا تو خیر ماں ہے لیکن اس خبر پر ہر کوئی فرط مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔ وکیل رام جیٹھ ملانی بولے "مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہی چاہئے کہ اس مقدمہ میں عدالت عالیہ کے اندر جو کچھ ہوا، اس پر ذاتی طور سے میں بہت خوش ہوں۔ اس کے ذریعہ جمہوریت کا وہ اصول قائم ہو گیا جس کی رو سے ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے۔" جیٹھ ملانی کی بات اس ترمیم کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ آزادی حاصل تو ضرور ہے لیکن اگر اس کا استعمال بلا خوف وخطر کیا جائے تو عمر قید کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ اس سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں عرضی داخل کر کے ضمانت حاصل کرنے کے لئے خطیر وسائل اور جیٹھ ملانی جیسے گراں یار وکیل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ڈاکٹر سین کی مانند مقبول ومعروف بھی ہونا پڑتا ہے تاکہ رہائی کے لئے نہ صرف قومی بلکہ عالمی سطح سے دباؤ بنایا جا سکے۔ لیکن کیا یہ ساری سہولیات ملک کے ہر شہری کو مہیا ہیں؟ اس سوال کا جواب ملک کا ہر باشندہ جانتا ہے۔ بقول رام جیٹھ ملانی ان کا مؤکل "نہ تو خود تشدد میں ملوث ہیں اور نہ ہی انہوں نے تشدد کو پناہ دے رکھی ہے۔ لٹریچر تو خیر ہر کسی کے گھر پر ہوتا ہے۔ خود میرے گھر پر اس سے زیادہ خطرناک لٹریچر موجود ہے۔" وکیل صاحب نے بجا فرمایا اصل معاملہ لٹریچر کے المادی میں رکھنے یا وقت ضرورت اس کا استعمال کر کے دنیا کمانے کا نہیں ہے بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے میدان عمل میں آنے کا ہے۔ مذکورہ مقدمہ کے وکیل اور مؤکل کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے۔

رام جیٹھ ملانی کا کہنا ہے کہ سیاستدانوں کو مندرجہ بالا بات سمجھنی چاہئے لیکن افسوس کہ وہ اسے

نہیں سمجھتے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ بالکل ہی نہیں سمجھتے۔ سین کو عمر قید دینے کا فیصلہ تو عدالت نے کیا لیکن چونکہ وکیل صاحب جج صاحبان کو ناراض کرنا نہیں چاہتے اس لئے خود سیاست کھیل گئے۔ سیاستدان موقع کا فائدہ اٹھانے کے معاملے میں وکیل صاحبان سے پیچھے نہیں ہیں۔ مرکزی وزیر داخلہ پی چدمبرم اور سلمان خورشید تک نے عدالت کے فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان دونوں حضرات کا تعلق وکالت کے پیشے سے ہے۔ چدمبرم کے مطابق نچلی عدالت کے فیصلے سے اگر کوئی مطمئن نہ ہو تو اس کے پاس اونچی عدالت میں جانے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ لیکن پھر وہی سوال کہ کیا ہر کس و ناکس کے لئے یہ ممکن ہے۔ عدالت عالیہ تو در کنار کئی لوگ نچلی عدالت میں بھی اپنی پیروی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ غالباً بہار کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کو ۲۰ رسال کی عمر میں گرفتار کیا گیا اور ۴۰ رسال بعد یعنی جب وہ ساٹھ سال کا ہوا تب اسے بے قصور جان کر بری کر دیا گیا۔ قومی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ جن لوگوں نے اس کی عمر عزیز کے چالیس قیمتی سال چھین کر ان میں قید و بند کی صعوبتیں بھر دیں ان کا بال بیکا نہیں ہوا گویا جمہوریت کے جن ثمرات کا ذکر رام جیٹھ ملانی کر رہے تھے ان میں سے میٹھے اور رس دار پھل تو سزا دینے والے خاص لوگ نوش فرماتے ہیں اور عام آدمی کو اس کے کڑوے کسیلے سڑے گلے پھلوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ نظام جمہوریت کے بے حس ترازو میں پھلوں کو تولا بھی جاتا ہے اور چکھا بھی جاتا ہے تاکہ اسے چن چن کر ہوشیاری کے ساتھ تقسیم کیا جا سکے۔ یکساں تقسیم کا ڈھنڈورا پیٹنے والا خوشحال طبقہ میٹھے پھل کھاتا ہے اور جمہوریت کے گن گاتا ہے۔ کڑوے پھل کھانے والوں کی آواز کو ذرائع ابلاغ کے ہنگامے میں دبا دیا جاتا ہے۔ میڈیا کے اس شور میں ڈاکٹر سین جیسے لوگوں سے زنداں کے اندر رہائی کی شب چاندیوں ہم کلام ہوتا ہے۔

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا۔۔۔ "جاگ سحر آئی ہے"

تو وہ جواب دیتے ہیں

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

ڈاکٹر بنا یک سین کے طرز فکر کا ثبوت ان کا وہ طرز عمل ہے جو انہوں نے رہائی کے بعد اختیار کیا۔ انہوں نے چکنی چپڑی باتیں کرنے کے بجائے کہا "میں غدار نہیں ہوں اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں نے اپنے ملک سے کبھی بھی دغابازی نہیں کی۔ میں اس ملک میں حقوق انسانی کی تحفظ کا

کام جاری رکھوں گا۔'' ایک سوال کے جواب میں وہ بولے'' یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں نکسلیوں کو اسلحہ رکھنے کے لئے کہوں۔ اس کے لئے حکومت کو پہل کرنی ہوگی میں تو صرف اپنے علاقے میں امن وامان کی کوشش کرتا رہوں گا۔'' انہوں نے علاقے میں قیام امن کی خاطر حکومت سے مطالبہ کیا کہ نکسل تحریک کے خلاف حکومت کی پشت پناہی میں چلائی جانے والی نام نہاد عوامی تحریک سلوا جوڈم کو فوراً بند کر دیا جائے۔ ڈاکٹر سین نے اس طرح کی تحریک کے خلاف اپنی مہم جاری رکھنے کا عزم دوہرایا بقول فیض۔

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

وزیر قانون ویرپا موئلی کے بیان کا ڈاکٹر سین نے خیر مقدم کیا جس میں انہوں نے بغاوت کے قانون پر نظر ثانی کی ضرورت پر زور دیا تھا اور کہا کہ انگریزوں کے زمانے میں وضع کئے گئے اس بغاوت کے قانون کو ختم کرنے کی خاطر عوام کو متحد ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کی منسوخی کے بغیر ہم اپنے آپ کو آزاد قوم کا فرد نہیں سمجھ سکتے۔ ویرپا موئلی تو چھتیس گڑھ میں اپنی مخالف جماعت بی جے پی کی حکومت کے ساتھ براہ راست سیاست بازی پر اتر آئے تھے اسی لئے انہوں مزید کہا کہ یہ فیصلہ ریاستی حکومت کے لئے چشم کشا ہے۔ چھتیس گڑھ حکومت کو چاہئے کہ وہ بلا امتیاز معروضی طرز فکر اختیار کرے اور جب مقدمہ عدالت عالیہ میں ہو تو مزید احتیاط برتے۔ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے ریاستی وزیر اعلیٰ رمن سنگھ بولے ہم سپریم کورٹ کے فیصلے کا احترام کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یاد دلایا کہ دہلی میں تو صرف ضمانت ہوئی ہے باقاعدہ مقدمہ تو بلاس پور کے ہائی کورٹ میں چلے گا اور ہم اس کے فیصلے کو بھی تسلیم کریں گے۔ قربان جایئے اس خود اعتمادی پر جس نے رمن سنگھ سے یہ کہلوایا گویا انہیں یقین ہو کہ بلاس پور کے اندر ہونے والا عدالتی فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ڈاکٹر سنگھ کا اس وقت تک کا وزیر اعلیٰ کی کرسی پر براجمان ہونا شرط ہے۔ ہندوستان کی سیاست پر جو لوگ گہری نظر رکھتے ہیں وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ڈاکٹر سین جیسے باضمیر لوگوں کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون وزیر اعلیٰ ہے اور کس پارٹی کی حکومت ہے؟ اس لئے کہ ظلم واستحصال کے حمام میں ہر پارٹی کی برہنگی کم وبیش یکساں ہے۔

وزیر اعلیٰ اور وزیر قانون کی اس سیاسی جنگل بندی میں وزیر اعلیٰ کا پلڑا بھاری دکھلائی دیتا ہے اس لئے کہ مقدمے میں بری ہونے اور ضمانت پر رہا ہونے کے فرق سے وہ واقف ہیں انہیں پتہ ہے

کہ ضمانت کا فیصلہ اگرچہ دہلی میں ہوا لیکن حقیقت میں کاغذات ضمانت بلاس پور میں داخل کیے گئے ہیں۔ ضمانت کی شرائط بھی نہایت دلچسپ ہیں مثلاً ان کو ۵۰ رہزار کے ذاتی مچلکہ اور اضافی ۵۰ رہزار کی ضمانت جمع کروانے کے لئے کہا گیا۔ پاسپورٹ ضبط کر کے عدالت میں رکھ لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نہیں جائیں بلکہ ہر پیشی میں بذات خود حاضر ہوں۔ اس طرح کی شرائط و ضوابط کے ساتھ عطا ہونے والی ضمانت کو باعزت ضمانت کون کہے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ باعزت طریقے سے تو ملزم صرف بری ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سین کو اس کے لئے نہ جانے کب تک انتظار کرنا ہوگا؟

اس مقدمہ کی سماعت کے دوران سرکاری وکیل کی پیروی اور دلائل ہندوستانی عدلیہ کے طرز فکر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ سرکاری وکیل للت کی اولین دلیل یہ تھی کہ ڈاکٹر سین نکسلیوں کے ہمدرد ہیں گویا باغیوں سے ہمدردی بغاوت کے ہم پلہ ہے۔ جسٹس بیدی اور پرساد کی بنچ نے کہا کہ یہ ایک جمہوری ملک ہے یہاں کسی باغی سے ہمدردی رکھنا بغاوت کا ارتکاب کرنے کے مترادف نہیں ہے اس کے بعد جسٹس بیدی نے عمر قید کی سزا کا جواز دریافت کیا تو للت نے بتلایا کہ ملزم کے گھر پر ایسے پمفلٹ پائے گئے جن میں بغاوت کی بو آتی ہے اور ایسی صورتحال میں یہ ثابت کرنا ضروری نہیں ہے کہ ڈاکٹر سین اس کے مصنف ہیں بلکہ اس طرح کے لٹریچر کی اشاعت و تقسیم بھی بغاوت میں شمار ہوتا ہے۔ بیدی صاحب نے اس دلیل کو نہایت کمزور جواز قرار دیا اور کہا اس طرح کا لٹریچر ہر طرف پھیلا ہوا ہے اگر کسی کے گھر میں گاندھی جی کی سوانح پائی جائے تو وہ گاندھیائی افکار کا حامل نہیں ہو جاتا ۔ سرکاری وکیل للت نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ڈاکٹر سین نے ۳۰ رمرتبہ نکسلی رہنما نارائن سانیال سے ملاقات کی ہے۔ جسٹس بیدی نے پوچھا کیا ملاقات جیلر کی موجودگی میں ہوئی؟ تو جیٹھ ملانی نے بتلایا کہ جیلر ہر ملاقات کے وقت موجود ہونے کا اعتراف کر چکا ہے۔ جسٹس بیدی نے کہا ڈاکٹر سین کن لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں اس بنیاد پر ضمانت کی درخواست کو رد کرنے کا جواز نہیں بنتا۔ گویا عدالت کی نظر میں کسی باغی سے ربط ضبط رکھنا بھی بغاوت نہیں ہے۔ وکیل للت کے اعتراف جرم کی دلیل کو بھی عدالت نے تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کو نہ صرف ضمانت کا حکم دیا بلکہ ڈاکٹر سین کی اپیل کا فیصلہ ہونے تک ان کی تاحیات قید کی سزا کو معطل کر دیا گویا ایک طرح سے ان پر لگائے گئے آئی پی سی کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت بغاوت کے الزام پر ہی سوالیہ نشان کھڑا ہو گیا۔ ضمانت کی شرائط طے کرنے کی ذمہ داری ہائی کورٹ کو سونپ دی گئی۔

ڈاکٹر سین کا اصل قصور وہ نہیں ہے جس پر عدالت میں بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ مئی

۲۰۰۷ء میں ڈاکٹر سین کو پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا ان پر ایک تاجر پیوش گوہا اور ماؤنواز مفکر نارائن سانیال کے درمیان پیغام رسانی کا الزام تھا۔ چھتیس گڑھ حکومت نے عدالت میں انہیں ریاست کے تحفظ کی خاطر خطرہ بتلایا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہ مئی میں ان کی درخواستِ ضمانت سیشن کورٹ نے رد کی اور دسمبر کے مہینے میں سپریم کورٹ نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ ملک بھر کی حقوق انسانی کی تنظیموں نے ڈاکٹر سین کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ دسمبر کے اواخر میں انہیں ہندوستان کی سماجیاتی اکادمی کی جانب سے آر آر کھیتان کے طلائی تمغہ سے نوازہ گیا۔ یہ اعزاز انہیں ماحول، انسان اور سماج کے ارتقاء اور چھتیس گڑھ کے مظلوم اور پسماندہ عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے دیا گیا تھا یہی گویا ڈاکٹر سین کا جرم عظیم تھا جس کے لئے ۱۵/ مارچ سے ۱۱/ اپریل ۲۰۰۸ء کے دوران انہیں قید تنہائی کی سزا دی گئی اس بار جیل خانے والوں کی دلیل تھی کہ ان کی اپنی ذات کو خطرہ ہے۔

دسمبر ۲۰۰۸ء ہی میں عالمی صحت کونسل نے ڈاکٹر سین کو عالمی صحت اور انسانی حقوق کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دینے کے لئے جوناتھن مان نامی ایوارڈ سے نوازہ۔ اس کے بعد ان کی ضمانت کی دو درخواستیں نچلی عدالت میں رد ہوئیں۔ مئی ۲۰۰۹ء میں سپریم کورٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے کے احکامات جاری کر دیئے لیکن مقدمہ بدستور جاری رہا گزشتہ سال دسمبر میں سیشن کورٹ نے سین، سانیال اور گوہا ان تینوں کو ملک سے بغاوت کے الزام میں عمر قید کی سزا سنا دی۔ فروری میں اس فیصلے کے خلاف سنوائی کے دوران ہائی کورٹ نے ضمانت کی درخواست منسوخ کر دی اور بالآخر پھر ایک بار عدالت عالیہ کو مداخلت کر کے ضمانت بحال کروانی پڑی۔ ڈاکٹر سین کو جب چار ماہ قبل سزا سنائی گئی تھی اس وقت ماہرین قانون کا ردعمل اس پورے معاملے کی پول کھول دیتا ہے۔

دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور پی یو سی ایل کے رکن راجندر سچر کے مطابق ڈاکٹر سین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ملک کے مفاد کے خلاف کام کر رہے تھے شرمناک الزام ہے بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا ''غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کا ایکٹ'' بجائے خود غیر دستوری قانون ہے گویا ایک ایسے قانون کی بنیاد پر جو دستور کے خلاف ہو عوام کو عمر قید کی سزا سنائی جائے اس سے زیادہ افسوس ناک بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

معروف مصنف اور حقوق انسانی کی سرگرم کارکن اروندھتی رائے جنہوں نے ڈاکٹر سین کی ضمانت کو امید کی کرن قرار دیا لیکن عمر قید کی سزا پر انہوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا یونین کاربائیڈ کا سربراہ دو سال کی سزا پاتا ہے اور ڈاکٹر سین کو عمر قید کی سزا سنائی جاتی ہے اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا

ہے؟ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں وہ بولیں "غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کے ایکٹ" کا بیجا استعمال نہیں ہو رہا ہے بلکہ یہ قانون جن مقاصد کی خاطر وضع کیا گیا تھا اسے پورا کر رہا ہے۔ انسداد دہشت گردی کے ماہر ڈاکٹر اجے ساہنی کے مطابق جرم و جواز دونوں موجود نہیں ہیں۔ سین کے لیے عمر قید کی سزا اور اصل پولس کی نااہلی اور تفتیشی عمل کی ناکامی کا مظہر ہے۔ سپریم کورٹ کے وکیل پرشانت بھوشن کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر سین کو سزا دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ عدلیہ کا ایک حصہ حکومت کے خلاف اٹھنے والی آواز کو دبانے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اس کے باعث عوام کا نچلی عدالتوں پر سے اعتماد اٹھ جائیگا۔

ماہرین قانون اور انسانی حقوق کے خیالات کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

حکومت غیر دستوری قانون کیوں بناتی ہے؟ اور ان قوانین سے کن مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے؟

انتظامیہ کی جانب سے تفتیش کے دوران نااہلی کیوں دکھلائی جاتی ہے؟

عدلیہ کو سیاست کی بساط کا مہرہ بننے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

ڈاکٹر سین جیسے لوگوں کو کیوں ہراساں کیوں کیا جاتا ہے؟

ہندوستان کے قبائلی علاقوں کے پس منظر میں جہاں نکسلی تحریک چل رہی ہے اگر ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو حیرت انگیز جواب ملتا ہے۔ یہ الزام اپنی جگہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر سین نکسلیوں کے حامی ہیں اور نکسلیوں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اور عوام حکومت کے بجائے ان کے ساتھ کیوں ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ جن علاقوں میں یہ قبائلی لوگ آباد ہیں اتفاق سے وہ علاقہ معدنیات کی دولت سے مالا مال ہے۔ وہاں پر کان کنی کی خاطر ان ادیباسیوں کا وہاں سے اخراج ضروری ہے چونکہ ادیباسیوں کی ساری معیشت اور معاشرت ان جنگلوں سے وابستہ ہے وہ وہاں سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ عالمی سرمایہ کار انہیں وہاں سے نکالنے کے لئے پولس کی مدد لیتے ہیں اور ڈراتے دھمکاتے ہیں نیز سیاستدانوں کی مدد سے نت نئے قوانین بنواتے ہیں۔ اب اگر کوئی نکسلی ان محتاج و مظلوم غریبوں کی مدد کے لئے آگے آتا ہے تو وہ باغی کہلاتا ہے۔ کوئی ان کے حقوق کی پامالی پر اعتراض کرتا ہے تو اس پر بھی بغاوت کا الزام دھر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سین ۱۹۸۱ء سے ان غریبوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ نہ صرف صحت بلکہ سماجی و سیاسی

مسائل میں بھی ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر سین نے حکومت کی زیادتیوں اور مظالم کو مرتب کیا۔ سلوا جودم نام کی سرکاری دہشت گردی کا پردہ فاش کیا اور معدنیات کی بڑی کمپنیوں سے اس کا رشتہ بے نقاب کیا اور یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۷ء سے انہیں ہراساں کیا جارہا ہے۔ ان کا دواخانہ بند ہو چکا ہے اور ان کو سامان عبرت بنا کر مستضعفین کے درمیان کام کرنے والے افراد کو خوفزدہ کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے لیکن اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈے نہ ہی ماضی میں کامیاب ہوئے ہیں اور نہ مستقبل میں بارآور ہوں گے۔ اسی امید پر ڈاکٹر بنایک سین جیسے لوگ دل برداشتہ ہوئے بغیر کشمکش کئے جارہے ہیں۔

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

# رام لیلا میدان پر بابا رام دیو کی رام کتھا

بوفورس توپ کی بدعنوانی نے مسٹر کلین کہلانے والے راجیو گاندھی کو اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا جن کے حامی ممبران ایوان کی تعداد ان کی ماں اور نانا سے زیادہ تھی لیکن پھر اس کے بعد ایسا لگنے لگا گویا ہندوستان کی سیاست میں بدعنوانی کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ عوام نے نہ صرف چارہ کھانے والے کو بلکہ کھاد نگل جانے والوں کو بھی کامیاب کیا۔ کمل کو ٹی وی کے پردے پر رشوت لیتے ہوئے دیکھا اور ہاتھی کو دولت کا انبار نگلتے ہوئے پایا اسکے باوجود دونوں کو اقتدار سے نوازا لیکن بابا رام دیو نے یہ ثابت کر دیا کہ بدعنوانی کا مسئلہ ابھی بھی زندہ ہے بشرطیکہ اسے اٹھانے والا بدعنوان نہ ہو۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک بدعنوان سیاسی جماعت دوسرے کی بدعنوانی کو اچھالتی تھی عوام جانتے تھے کہ اس معاملے میں مدعی اور مدعا الیہ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اس لئے وہ کسی کی بات پر کان نہ دھرتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس بار بدعنوانی کے خلاف دھرم یدھ چھیڑنے والا شخص نہ تو خود بدعنوان ہے اور نہ ہی اپنے کسی سیاسی مفاد کے پیش نظر اس معاملے کو اچھال رہا ہے تو اس کی پذیرائی مختلف انداز میں ہوئی اور سرکار کی چولیں ہل گئیں نیز حکومت کا اصلی گھناؤنا چہرہ ساری دنیا کے سامنے آ گیا۔

زرخرید ذرائع ابلاغ اور اس سے متاثر مخلص افراد بابا رام دیو پر مندرجہ ذیل الزامات لگا رہے ہیں:

- رام دیو کو اسی وقت یہ معاملہ اٹھانے کی کیوں سوجھی؟
- ان کی پشت پر سنگھ پریوار ہے
- وہ بی جے پی کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے

ان کے پاس دولت کا انبار کیوں ہے؟

بابا رام دیو نے یہ مسئلہ پہلی بار نہیں اٹھایا بلکہ وہ برسوں سے اس معاملے کو اٹھا رہے ہیں۔ وہ اپنے مختلف بیانات اور انٹرویو میں اس جانب توجہ مبذول کروا چکے ہیں لیکن ایک فرق ضرور واقع ہوا ہے۔ اس سے پہلے بات زبانی جمع خرچ تک محدود تھی اب انہوں نے عملاً تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ تحریک چلانے کا فیصلہ ابھی کیوں کیا؟ پہلے کیوں نہیں کیا؟ تو یہ ایک مہمل سوال ہے اس لئے کہ وہ جب بھی اس طرح کا فیصلہ کرتے یہ سوال رونما ہو جاتا اس لئے یہ سوال سرے سے کسی اہمیت کا حامل ہی نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کب کیا گیا بلکہ سوال یہ ہونا چاہئے کہ آیا یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ملک کی ہزاروں کروڑ کی دولت کو سوئیس بنکوں سے واپس ملک میں لایا جانا چاہئے تو اس کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟

یہ ایک نہایت شرمناک حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اناج کے گودام بھرے پڑے ہیں اس کے باوجود ۱۵۰ ضلع کے عوام ہر سال بھکمری و فاقہ کشی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ بیان کسی حزب اختلاف یا رام دیو کا نہیں بلکہ عدالت عالیہ یعنی سپریم کورٹ کا ہے۔ سپریم کورٹ کے جج نے پچھلے دنوں حکومت سے زائد اناج مہیا کرنے کا تقاضہ کرتے ہوئے حکومت کی غربت کو ناپنے کی پیمائش کو بھی چیلنج کیا۔ دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشت بھارت میں شہری علاقوں میں غریب وہ ہے جس کی آمدنی یومیہ ۲۰ روپئے ہے یا جو ۱۷ روپئے ہر روز خرچ کرتا ہے یا دیہات میں جس کی آمد و خرچ ۱۲ روپئے یومیہ ہے۔ آج کل کی مہنگائی کے پیش نظر یہ معیار ویسے ہی بہت پست ہے اس کے باوجود اس ملک میں ۳۶ فیصد عوام غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ جسٹس بھنڈاری اور ورما کے مطابق یہ رقم کم از کم دوگنی ہونی چاہئے اگر ایسا کر دیا جاتا ہے تو غربت کی شرح میں کس قدر اضافہ ہو جائیگا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کے باوجود سوئیس بنکوں میں ہندوستان کا کالا دھن سب سے زیادہ ہے اور اپنے قریب ترین حریف روس سے چار گنا ہے۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۰۹ء میں یہ دولت ۲۱ لاکھ کروڑ تھی اور ہر سال اس میں ایک لاکھ کروڑ کا اضافہ ہوتا ہے۔ اگر ۲۰۰۸ء میں اسے لا کر ملک کے ۴۵ کروڑ عوام میں تقسیم کر دیا جاتا تو ہر ایک کے حصے میں ایک لاکھ روپئے اور غریبی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اگر حکومت یہ اقدام کر دیتی تو ان ۲۵ ہزار لوگوں کا کیا ہوتا جو سال بھر میں کئی بار سوئیزرلینڈ اپنی دولت کی دیکھ بھال کے لئے آتے جاتے رہتے ہیں۔ سرکار کے لئے وہ ان ۲۵ ہزار لوگوں کی اہمیت ۴۰ کروڑ رائے دہندگان سے زیادہ ہے۔ ایسے میں اگر کوئی اس لوٹ کے مال کو واپس

ہندوستان کے خزانے میں لا کر غریبوں کی فلاح وبہبود کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو اس میں کیا غلط ہے؟

یہ بات بابا رام دیو نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اس سال جنوری میں سپریم کورٹ کے جج نے کہی جبکہ جرمنی کے لیشٹن سٹین بنک میں کثیر دولت کے جمع کرنے کا معاملہ سامنے آیا اور حکومت نے ۲۶ لٹیروں کا نام بند لفافے میں عدالت کو دیتے ہوئے کہا کہ ہم اسے ظاہر نہیں کر سکتے۔ عدالت نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا آخر اس میں کیا مشکل ہے۔ جسٹس سدرشن اور نجار نے کہا یہ تو سیدھا اور صاف قومی دولت کی چوری کا معاملہ ہے ایسے میں حکومت مجرمین کی اس قدر پردہ داری کیوں کر رہی ہے۔ جن لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ حکومت نے رام دیو کے خلاف یہ احمقانہ اقدام کیوں کیا انہیں سپریم کورٹ کے بیان کو سامنے رکھنا چاہئے اس لئے کہ جو حکومت بدعنوانوں کی محافظ ہے وہ ان کے خلاف کام کرنے والوں پر اگر ظلم نہیں کرتی تو اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ پہلے تو حکومت کو اندازہ تھا کہ یہ بھی ایک ڈرامہ ہوگا اور وہ بابا کو کچھ مراعات وغیرہ دے کر منالیں گے اس لئے اس نے سودے بازی کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ یہ شخص تو سنجیدہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود ڈرگئی اور سرکاری دہشت گردی پر اتر آئی۔

رام دیو پر سنگھ پریوار کی پشت پناہی کا الزام اس لئے لگایا جاتا ہے ان کے اسٹیج پر اچانک سادھوی رتھمبرا نمودار ہوگئی لیکن کسی فسطائی خاتون کی حمایت کے نتیجے میں اس تحریک کو فسطائی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر رام دیو خود وشوا ہندو پریشد کے اسٹیج پر پہنچ جاتے یا سادھوی رتھمبرا کے پروچن میں جادھمکتے تو بے شک یہ الزام حق بجانب ہوتا لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ اس پورے عرصے میں ان سے کوئی بھی فسطائی تو کجا فرقہ وارانہ بیان بھی منسوب نہیں کیا جا سکا۔ بی جے پی کی حمایت کو بھی مختلف معنی پہنائے جارہے ہیں حالانکہ یہ تو بی جے پی کی موقع پرستی ہے جو وہ اس تحریک کی آنچ میں اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کی کوشش کر رہی ہے اگر اس وقت مرکز میں بی جے پی کی حکومت ہوتی تو کانگریس بھی بعینہ وہی سب کر رہی ہوتی جو اب بی جے پی والے کر رہے ہیں، ہندوستان کی مفاد پرست سیاسی جماعتوں کا یہی معمول ہے اور بابا رام دیو کی حمایت تو نہ صرف بی جے پی نے بلکہ کمیونسٹ، سماجوادی اور بہوجن سماج پارٹی نے بھی کی ہے بلکہ کئی غیر سیاسی تنظیموں اور رہنماؤں نے ان کے خلاف کی جانے والی سرکاری کارروائی کی مذمت کی ہے اور اب تو سپریم کورٹ نے اس کے خلاف نوٹس جاری کر دیئے ہیں اس لئے بی جے پی کے ذریعہ کی جانے والی حمایت کے باعث کسی کو فسطائی کٹھ پتلی قرار دے دینا زیادتی معلوم ہوتا ہے۔ ڈگ وجئے اور آزاد جو بڑھ چڑھ کر بابا رام دیو کو سنگھی کھوٹا قرار دے رہے ہیں اس بات کا جواب کیوں نہیں دیتے کہ کانگریس کے چار چار وزراء

ان کا استقبال کرنے ہوائی اڈے پر کیوں گئے تھے اور پھر ہوٹل میں بیٹھ کر اس سنگھی مکھوٹے سے کون سی راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔

حکومت نے اس بہیمانہ کارروائی کے لئے جس وقت کا انتخاب کیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ رات کے ایک بجے نہتے عورتوں اور بچوں سمیت مظاہرین پر تشدد کا جواز کس قدر بھیانک ہے جو لوگ اس کارروائی کو جائز قرار دے رہے ہیں وہ دومنٹ کے لئے تصور کریں کہ اگر ان کے اہل خانہ کسی مظاہرے میں شریک ہوتے جس کو اس رویہ کا شکار ہونا پڑتا تو انہیں کیسا لگتا؟ حکومت کی جانب سے پیش کیا جانے والا احمقانہ جواز بھی نہایت دلچسپ ہے مثلاً:

بابا رام دیو کو یوگا کی اجازت دی گئی تھی۔

رام دیو نے یوگا کو سیاسی رنگ دے دیا۔

پانچ ہزار افراد کو جمع کرنے کی اجازت تھی۔

بابا اپنے وعدے سے مکر گئے۔

امن وسلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

بابا رام دیو عرصہ دراز سے دنیا بھر میں یوگا کے کیمپ لگاتے رہے ہیں لیکن اس مرتبہ ان کا ارادہ یوگا سکھلانے کا نہیں تھا بلکہ بدعنوانی کے خلاف مظاہرہ کرنے کا تھا اس حقیقت سے ملک کا بچہ بچہ واقف تھا اس کے باوجود انہیں صرف یوگا کرنے کی اجازت کیوں دی گئی یہ ایک بنیادی سوال ہے؟ بابا رام دیو کا استقبال کرنے کے لئے جو وزراء کرام ہوائی اڈے پہونچے اور پھر انہیں اپنے ساتھ ہوٹل لے گئے تو کیا وہ وہاں یوگا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے یا اس مظاہرے کے سلسلے میں گفت وشنید کر رہے تھے؟ یوگا کو اگر کسی نیک مقصد کی خاطر سیاسی رنگ دیا جاتا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟ مظاہرین کی تعداد طے کرنے کا اختیار کسے ہے؟ اجازت دینے والوں کو یا مظاہرہ کرنے والوں کو؟ وعدے سے مکرنے والی بات کم از کم کسی سیاسی جماعت کو تو زیب نہیں دیتی جن کو نہ تو اپنے وعدہ کا کوئی پاس و لحاظ ہوتا ہے اور نہ عوام جن کے عہد کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ کانگریس نے دو سال قبل اپنے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ ۱۰۰ دنوں کے اندر ملک کی ساری دولت جو بیرونی ممالک میں پوشیدہ رکھی گئی ہے اسے واپس لائے گی لیکن ۷۰۰ سے زیادہ دن گزر چکے ہیں اگر کانگریس والے اپنے عہد کو پورا کر دیتے تو آج اس تحریک کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ حکومت سے جو مطالبہ کیا گیا تھا اس کو پورا کرنے کے بجائے حکومت نے اول تو اس مظاہرے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی اور

بدعنوانی ختم کرنے کے بجائے مظاہرے کے خاتمے کی شرائط طے کرنے لگی۔ اگر حکومت کی جانب سے اس معاملے میں لیپا پوتی کے بجائے ٹھوس اقدام کئے جاتے تو مظاہرہ اپنے آپ ختم ہو جاتا۔ جہاں تک امن وسلامتی کو لاحق ہونے والے خطرے کا سوال ہے تو جس کانگریس پارٹی کی آستین سے اب بھی سکھوں کے قتل عام کی بو آتی ہے اس کو یہ الزام زیب نہیں دیتا۔ جو لوگ جامعہ ملیہ میں اپنے شکاری کتوں کو بھیج کر دن دہاڑے معصوم نوجوانوں کو شہید کر دیتے ہیں ان کا امن وسلامتی کے بہانے رام لیلا میدان میں بیٹھنے والے نہتے مظاہرین پر تشدد کرنا عین توقع کے مطابق ہے۔

بابا رام دیو پر بے شمار دولت جمع کرنے کا الزام بھی ہے اور ان کی املاک کو بڑے زور وشور کے ساتھ ذرائع ابلاغ میں اچھالا جا رہا ہے۔ کیا دستور کی رو سے کسی سادھو سنیاسی کو دولت جمع کرنے پر کوئی روک ٹوک ہے۔ کیا دولت صرف سیاسی رہنما جمع کر سکتے ہیں اور بے حیائی کے ساتھ اپنے کاغذات نامزدگی میں اس کا اظہار کر سکتے ہیں جبکہ ان میں سے اکثر کا کوئی جائز ذریعہ آمدنی نہیں ہوتا ۔ بابا رام دیو اپنے ذاتی جہاز سے دہلی آئے تھے اس کے باوجود مرکزی وزراء ان سے ملنے کی خاطر ہوائی اڈے پر تشریف لے گئے حالانکہ غیر قانونی دولت جمع کرنے کے الزام میں انہیں جیل لے جانا چاہئے تھا۔ اس تحریک کے آغاز سے قبل حکومت کو سوامی رام دیو کی املاک پر دھاوا بولنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔ حکومت نے اس قدر طویل انتظار کیوں کیا؟ اور اب بھی اس دولت میں سے کیا کچھ جائز اور کتنا ناجائز ہے یہ بتانے کے بجائے دولت کس قدر ہے اور ایک سنیاسی کو اس کی کیا ضرورت ہے اس طرح کے بے جا سوالات کے ذریعہ شکوک وشبہات کیوں پیدا کئے جا رہے ہیں؟

اس بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کالے دھن کا واپس ملک میں آنا تو ناممکن ہے ہاں اس کوشش میں سرکار گر سکتی ہے؟ جمہوریت کے اندر حکومت کا بننا بگڑنا ایک معمول کی بات ہے بغیر کسی معقول وجہ کے لوگ اقتدار سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اس لئے کسی اہم اور ضروری مقصد کے حصول کی خاطر اگر حکومت گر جاتی ہے تو گرے اپنی بلا سے حکومت کو گرنے سے بچانا عوام کی فلاح و بہبود سے زیادہ اہمیت کا حامل کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی مقصد کا حصول ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ان لوگوں کو نہیں کرنا چاہئے جو خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں یا تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں بلکہ ان پر چھوڑ دینا چاہئے جو اس تحریک کو چلا رہے ہیں اور اس کے لئے مختلف قسم کی قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ ویسے کسی تحریک کو چلانے کے لئے اس کی کامیابی کے امکانات کا یقینی ہونا شرط ہرگز نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ بیشتر اوقات جو چیز ناممکن نظر آتی ہے وہ آگے چل کر ممکن ہو جاتی ہے بشرطیکہ اس

کے لئے عزم وحوصلہ کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔ انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ آج سے چند ماہ قبل کون سوچ سکتا تھا کہ مصر میں ایسا بڑا عوامی انقلاب برپا ہوجائیگا لیکن جو بات لوگوں کے خواب و خیال میں نہیں تھی دیکھتے دیکھتے سچ ہوگئی اسی لئے انقلابی تحریکیں انتخابی جماعتوں کی طرح بہت زیادہ حساب کتاب نہیں کرتیں۔ بابارام دیو کی بدعنوانی کے خلاف تحریک سے بالآخر کیا حاصل ہوگا یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا مگر ابھی تک یہ اس کے نتیجے میں دو بڑی غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں۔

پہلی تو یہ کہ موجودہ جمہوری نظام کے اندر ایک عظیم عوامی تحریک برپا کرنے کے لئے انتخاب میں حصہ لینا ناگزیر ہے۔ بابارام دیو کبھی بھی انتخاب کے بکھیڑے میں نہیں پڑے اس کے باوجود وہ ایک ایسی تحریک برپا کرنے میں کامیاب ہوگئے جس سے سرکار کی نیند اڑ گئی اور اسے آدھی رات میں تشدد پر اترنا پڑا۔

دوم یہ کہ موجودہ حالات میں سیاست کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے پارلیمان کی دہلیز پر قدم رکھنا لازمی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے وہ جماعتیں جو اس انتخابی کھیل میں شامل ہیں بد عنوانی کو دور کرنے کے بجائے اس میں ملوث ہوگئی ہیں حالانکہ ان سب کو برپا کرنے والے لوگ نہایت اصول پسند اور انقلابی نظریات کے حامل رہے ہیں۔ گاندھی جی کانگریس کے روح رواں تھے اور رام منوہر لوہیا جنتا پریوار کے۔ پیریار نے ڈی کے تحریک کی بنیاد ڈالی جس کے بطن سے ڈی ایم کے نکلی اور کانشی رام نے بہوجن سماج کی ان میں سے کوئی بھی بدعنوان نہیں تھا بلکہ آر ایس ایس کے ہیڈ گیوار پر بھی بدعنوانی کا کوئی الزام کبھی نہیں لگا لیکن ان کے شاگردوں کو جو ایوان کی رونق بنے ہوئے ہیں دیکھا جائے تو ہر ایک کا دامن داغدار نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک ایسا شخص جو کبھی بھی اقتدار کے گلیارے میں داخل نہیں ہوا بدعنوانی جیسی بڑی برائی کے خلاف ایک شمشیر بے نیام بن گیا اور عوام نے بھی کاروباری سیاستدانوں کے بجائے ایک یوگا گرو کو زیادہ قابل اعتبار سمجھا یہ حیرت انگیز حقیقت ہے۔

ہندوستان کے سارے بدعنوانوں کی آماجگاہ شہر دہلی ہے جہاں سے وہ ملک کی دولت لوٹ کر غیر ملکی بنکوں میں لے جاتے ہیں۔ دل والوں کی دلی ان کا دل کھول کر خیر مقدم کرتی ہے لیکن اگر کوئی اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف مہم چلانا چاہتا ہے تو اسے دہلی شہر میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ رام دیو اور ان کے ہمنواؤں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر وزیر اعظم کو افسوس ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مایاوتی بھی مرکزی حکومت کی بدسلوکی کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں لیکن دونوں بابارام دیو کو دہلی آنے کا راستہ دینے سے انکار کردیتے ہیں۔ کیا آزادی کے بلند بانگ دعوی کرنے والے ہندوستان کی پیشانی پر یہ ایک کلنک نہیں ہے؟

# دھماکوں کی سیاست اور معیشت کے دھماکے

ممبئی شہر ایک مرتبہ پھر ۱۳؍ماہ کے بعد بم دھماکوں سے دہل گیا لیکن اس بار حکومت نے اپنی گوں ناگوں سیاسی مجبوریوں کے سبب بلا کے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ انتظامیہ نے ماضی کی روایات کے برخلاف جلد بازی اور بے احتیاطی سے گریز کیا اور ذرائع ابلاغ کو تلقین کر دی گئی ہے کہ اس معاملے کو بیجا طول دینے کے بجائے ایک بھیانک خواب سمجھ کر جلد از جلد بھلا دیا جائے۔ حکومت کی مجبوری اتر پردیش کے انتخابات ہیں جس میں کانگریس کی توجہ خاص طور پر مسلمانوں کی جانب ہے۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہتی جس سے مسلمانوں پر بے سروپا الزام تراشی کر کے انہیں ناراض کیا جائے۔ اتر پردیش کے انتخابات کانگریس کے لئے اس زاویے سے بھی اہم ہیں کہ اس میں حاصل ہونے والی کامیابی کا سہرا راہل گاندھی کے سر باندھ کر ان کے لئے وزارت عظمیٰ کا راستہ ہموار کرنا مقصود ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جب بھی اتر پردیش میں کانگریس کمزور ہوئی ہے گاندھی۔ نہرو خاندان کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا ہے گویا اس خاندان کے اقتدار کا راستہ رائے بریلی۔ امیٹھی اور الہ باد سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ وزیر داخلہ پی چدمبرم کے نہایت سلجھے ہوئے بیان کی کوئی اور وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔

یہ دھماکے کس نے کئے اس کے بارے میں سوائے کرنے اور کروانے والے کے کوئی بھی وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی بنیاد یا تو قیاس آرائی ہے یا سیاسی ابن الوقتی اور اس کا مظاہرہ سب سے زیادہ مقامی سطح پر ہو رہا ہے مثلاً شیوسینا کا راہل گاندھی کے بیان پر پیچ و تاب کھانا جس میں انہوں نے کہا کہ اس طرح کے دھماکے افغانستان، عراق اور امریکہ میں ہوتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ راہل گاندھی کا یہ بیان ہنوز سیاست کے میدان میں ان کے طفل مکتب ہونے کا ثبوت ہے اگر یہ بات حقیقت بھی ہو تب بھی اس موقع پر اس کا اظہار غیر مناسب ہے

۔راج ٹھاکرے نے اپنی سیاسی روٹی سینکتے ہوئے دیگر ریاستوں سے آنے والے شہریوں کو بلا جواز مورد الزام ٹھہرادیا اس کے جواب میں بی ایس پی نے خود راج کو دہشت گرد قرار دے کر اپنی دوکان چمکانے کی کوشش کی۔ سب سے زیادہ غیر ذمہ داری کا ثبوت وزیر اعلیٰ چوہان نے اپنے اس ناعاقبت اندیش بیان سے دیا کہ این سی پی کو وزارتِ داخلہ کا قلمدان دینا ایک غلط فیصلہ تھا جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ چوہان صاحب شاید یہ بھول گئے کہ سب سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کرنے کے باعث وزارت اعلیٰ کی کرسی کی اصل حقدار این سی پی ہے۔ اگر وہ خود اسے این سی پی کے لئے خالی کردیں تو راشٹروادی بخوشی انہیں وزارتِ داخلہ کے قلمدان سے نواز دیں گے تا کہ ان کا دم خم دیکھ سکیں۔ جو وزیر اعلیٰ دھماکوں کے بعد ۱۵ رمنٹ تک اپنے پولس کمشنر سے رابطہ تک نہ قائم کر سکا ہو اسے اس طرح کی ابن الوقتی زیب نہیں دیتی وہ بھی کیا کرے یہی کانگریس کا کلچر ہے۔

ان دھماکوں کے حوالے سے مقامی سیاست کے علاوہ ایک معاشی پہلو بھی روشنی میں آیا ہے ۔ممبئی میں اوپیرا ہاؤس اور دادر کے علاوہ تیسرا دھماکہ زویری بازار میں ہوا جہاں ہیروں کے تقریباً ۵۰۰۰ تا ۶۰۰۰ ردوکانیں اور کارخانے ہیں۔ حکومت نے ان کے لئے باندرا کرلا کامپلکس میں بھارت ڈائمنڈ بورس تعمیر کیا ہے لیکن ابھی تک صرف ۵۔۶ رلوگوں نے ہی اس نئی سہولت کا رخ کیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کے دھماکوں سے بیوپاریوں میں خوف و دہشت پیدا کر کے انہیں قلبِ شہر سے نکال کر مضافات میں بھیجنا مقصود ہو اس لئے کہ زویری بازار کی زمین فی الحال بلڈر لابی کے لئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی بن گئی ہے اور قانوناً وہاں پر بسنے والوں کا انخلا ممکن نہیں ہے ویسے مقامی بیوپاری اب بھی وہاں سے نکلنے کے بجائے پولس چوکی کا قیام اور غیر قانونی پارکنگ کی ممانعت کا مطالبہ کرر ہے ہیں۔

۱۳ر جولائی کے دن جبکہ یہ دھماکے رونما ہوئے پڑوس کی ریاست گجرات میں فسادات کے حوالے سے ایک اہم ترین فیصلہ عدالت میں سنایا گیا۔ ویرمگام میں عمران بھٹی، جمعہ بھٹی اور حیدر بھٹی کو ۲۸ رفروری ۲۰۰۲ء کے دن فسادات کے دوران ہلاک کر دیا گیا تھا۔ نو سال بعد اس مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے احمد آباد کے ٹرائیل کورٹ نے ۶ رملزمین کو سزا سنائی اور ۴ رکو رہا کر دیا۔ ان میں سے دو بھوپا بھارواڑ اور باچو جی رنچھوڑ جی کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جبکہ وٹھل عرف کچھو کو ۱۰ رسال قید اور روہالا گھیلا و مولا گھیلا کو پانچ سال کی سزا سنائی گئی۔ یہ فیصلہ اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے قبل گودھرا ٹرین حادثے میں ۳۶ رلوگوں کو مورد الزام ٹھہرایا جا چکا ہے اور دس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی

ہے۔ٹرین حادثے میں صرف ۵۹ رکارسیوک مارے گئے تھے جبکہ اس کے بعد ہونے والے فسادات میں تقریباً ۲۰۰۰ رمعصوموں نے اپنی جان گنوائی تھی لیکن کسی مجرم کو ابھی تک کوئی سزا نہیں ہوئی تھی اور اس کی واحد وجہ نریندر مودی حکومت کا عدلیہ پر دباؤ رہا ہے۔مودی کے اس رویہ پر سپریم کورٹ پھٹکار سنا چکا ہے۔ بیسٹ بیکری کا معاملہ گجرات سے ممبئی کی عدالت میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

مودی کی دہشت اس قدر ہے کہ اوڈے گاؤں مقدمے کی سماعت کرنے والی خصوصی عدالت کی جج محترمہ ترویدی استعفیٰ دینے پر مجبور ہوگئیں۔گزشتہ سال اسی مقدمے کے سرکاری وکیل سی ایچ دیسائی کو بھی بھگایا گیا۔اوڈے گاؤں میں یکم مارچ ۲۰۰۲ کو ۲۳ ربدقسمت مسلمانوں کو ہلاک کردیا گیا تھا۔گجرات فسادات کی پیروی کرنے والے چار سرکاری وکلاء کو اب تک سبکدوش ہونے پر مجبور کیا جا چکا ہے۔ان میں سے ۷۲ رسالہ معمر وکیل پی آر اگروال نے اپنے استعفیٰ میں الزام لگایا کہ جج سری واستو ان کے دلائل کو سنتے ہی نہیں ہیں اس لئے وہ اپنی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔اگروال صاحب کو مقدمے کے آخری مراحل میں یہ اقدام کرنا پڑا جبکہ ۲۰۰ رگواہ ۸۵ رملزمین جن میں سابق بی جے پی ایم ایل اے پرہلاد گوسا بھی شامل ہیں کے خلاف پیش ہو چکے ہیں۔اس سے قبل گلبرگ سوسائٹی اور نروڈا پاٹیہ مقدمات کے سرکاری وکلاء آر کے شاہ اور نگم شکلا کو بھی مودی کے دباؤ نے چلتا کر دیا۔ہر کوئی اس قدر دہشت زدہ کر دیا جاتا ہے کہ ذاتی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔گجرات میں سپریم کورٹ کی قائم کردہ خصوصی عدالت میں ۸ رمقدمات زیر سماعت ہیں جس نے سنگھ پریوار کے ۳۳۰ رملزمین کی نیند اڑا رکھی ہے ایسے میں ویرم گام کے مقدمے کا فیصلہ یقیناً ذرائع ابلاغ پر چھا جاتا اور مودی کی دہشت گردی کو بے نقاب کر دیتا مجرمین اور مہلوکین کے افراد خانہ کو ٹیلی ویژن کے پردے پر دیکھ کر فسادات کی یاد تازہ ہو جاتی مگر اسی دن ہونے والے یہ دھماکے مقدمے کی خبر پر گہن بن کر چھا گئے۔اور دھماکوں کے شور میں اس مقدمہ کی آواز گھٹ کر مر گئی۔نریندر مودی اپنی جانب سے توجہ ہٹانے کی خاطر اس طرح کے دھماکے کروانے میں ماہر ہے۔

قومی سطح پر اس کی وجوہات اور اثرات کو جاننے کے لئے وزیر داخلہ کا بیان نہایت معاون و مددگار ہے۔پی چدمبرم نے ممبئی حملے پر اظہار تاسف کے ساتھ یہ بھی کہا کہ دھماکہ ہندوستان کی معاشی راجدھانی پر حملہ نہیں ہے شاید وہ کہنا چاہتے تھے کہ اس کا کوئی خاص اثر معیشت پر نہیں پڑے گا۔ان کے مطابق یہ کسی چھوٹے گروہ کا کام ہوسکتا ہے لیکن وہ کوئی قیاس آرائی کرنا نہیں چاہتے انہوں نے پولس کو کسی روایتی مفروضہ کی بنیاد پر تحقیق کرنے کے بجائے ان تمام امکانی گروہوں کی چھان بین کا

حکم دیا جو اس طرح کی کارروائی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جہاں اس بات کا اعتراف کیا کہ انڈین مجاہدین کے دو افراد کو پچھلے دنوں گرفتار کیا گیا وہیں یہ اعلان بھی کیا کہ ابھی حال میں نکسل وادیوں کو بھی ممبئی اور پونا سے گرفتار کیا جا چکا ہے گویا شک کی سوئی کسی ایک فرقہ یا گروہ کی جانب مرکوز کر دینا درست نہیں اس کے باوجود میڈیا میں انڈین مجاہدین کی دھوم ہے لوگ اس طرح سے بیان کر رہے ہیں کہ چند مبرم نے انڈین مجاہدین کا تک نام نہیں لیا اور پھر یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے اس سے پہلے کئے جانے والے سارے حملے ۱۳ یا ۲۶ رتاریخوں کو ہوئے اور ان سب میں انڈین مجاہدین ملوث رہے ہیں حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انڈین مجاہدین صرف اور صرف ممبئی پولس کے ذہن کی افترا پردازی ہے جسے ان لوگوں نے اے ٹی ایس مہاراشٹر کی حریفائی میں ایجاد کیا تھا۔

ان دونوں اداروں کے درمیان پائی جانے والی مخاصمت اظہر من الشمس ہے۔ دہلی پولس جب جامع مسجد کے معاملے میں انڈین مجاہدین کی تحقیق کرنے کی غرض سے ممبئی آئی تو کرائم برانچ نے ساری تفصیلات ذرائع ابلاغ میں لیک کر کے اسے رسوا کیا۔ ۲۰۰۸ء کے دھماکوں میں اے ٹی ایس سے پہلے افضل عثمانی کو گرفتار کر کے اے ٹی ایس پر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی جبکہ ۲۶ر نومبر حملے کی تحقیقات کا اصل حقدار اے ٹی ایس تھی لیکن ریاستی حکومت نے یہ ذمہ داری بلاوجہ ممبئی پولس کو سونپی اس سے پہلے ۲۰۰۶ء کے لوکل ٹرین دھماکوں میں انڈین مجاہدین کے ملوث ہونے کا اعلان کر کے ممبئی پولس نے اے ٹی ایس کی جانب سے گرفتار کئے جانے والے لوگوں کو غیر متعلق ثابت کر دیا۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے درمیان کس قدر بے ربطگی پائی جاتی ہے اس کا ثبوت اس وقت سامنے آیا جبکہ وجیہ القمر خان کو سی بی آئی نے ۵۰ رخطرناک ترین مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کر کے اس کے خلاف انٹرپول سے ریڈ کارنر وارنٹ جاری کروا دیا جبکہ بعد میں پتہ چلا کہ اسے اے ٹی ایس اور پھر ممبئی کرائم برانچ پہلے ہی گرفتار کر چکے ہیں اور وہ حراست میں ہے لیکن ان دونوں اداروں نے سی بی آئی کو اطلاع فراہم کرنے کی زحمت نہیں کی۔

ممبئی بم دھماکوں کے بین الاقوامی محرکات کو جاننے کے لئے مستقبلِ قریب میں ہونے والی ہند پاک بات چیت اور امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے دورۂ ہند کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک نہایت خوش آئند بات ہے پاکستان کے صدر زرداری اور وزیر اعظم گیلانی دونوں نے (جنہیں آئے دن کراچی میں ہونے والی اموات پر کوئی غم و افسوس نہیں ہے) ممبئی بم بلاسٹ کی پرزور مذمت کی گویا بالواسطہ یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم گناہ گاروں کا اس حملے سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس

کے جواب میں ہندوستان کے خارجہ سکریٹری آر کے سنگھ نے کہا ان دھماکوں سے ہند پاک بات چیت متاثر نہیں ہوگی گویا ہندوستان نے بھی بلا واسطہ یہ تسلیم کرلیا کہ ہم آپ کو اس کے لئے ذمہ دار نہیں سمجھتے ورنہ یہ گفتگو اگر منسوخ نہیں تو کم از کم معطل تو ضرور ہی ہو جاتی ۔لیکن ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی بہتری کو اگر امریکہ کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ پیش رفت اس کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے ۔ان دونوں ہم سایوں کے درمیان اپنا سائبان ڈال کر امریکہ بہادر جو سیاسی و معاشی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے ان پر ہند و پاک کے بہتر تعلقات سے اسی طرح پانی پھر جاتا ہے جس طرح بارش نے ممبئی دھماکوں کے شواہد کو ملیامیٹ کر دیا۔ اگر یہ دونوں از خود دوست بن جائیں تو ہیلری کلنٹن کو آخر ثالث کون بنائے گا؟ اس لئے ہند پاک تعلقات اور امریکی خارجہ سکریٹری کے دورے سے قبل دھماکوں کی اپنی اہمیت ہے ۔سچ تو یہ ہے کہ اس بار ہیلری کلنٹن کی آمد کی خبر کو ذرائع ابلاغ نے اہمیت ہی دھماکوں کے بعد دی ورنہ کون جانتا تھا کہ موصوفہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرمانے والی ہیں ۔پاکستان اور امریکہ کے تعلقات اسامہ اور ریمنڈ ڈیوس کے واقعات کے بعد خاصے بگڑ چکے ہیں امریکہ نے اپنی ۳۰۰ ملین ڈالر کی مجوزہ مدد کو بند کر کے اسے اپنے گرگوں کے ویزا سے مشروط کر دیا ہے اور پاکستانی حکمرانوں نے اس کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا ہے ایسے میں پاکستان کو گھیرنے اور اس پر بلا واسطہ دباؤ ڈالنے کے لئے اس طرح کے دھماکے نہایت مفید حربہ ثابت ہو سکتے ہیں ۔

اگر ممبئی میں یہ دھماکے نہ ہوئے ہوتے تو بھلا اوبامہ کو ہندوستان سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے یہ کہنے کا موقع کیسے ملتا کہ امریکی عوام ہر مشکل کی گھڑی میں ہندوستان کے عوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ہیں ۔ہم اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دلوانے میں ہندوستان کا تعاون کریں گے جیسا کہ ۲۰۰۸ء میں کر چکے ہیں ۔ بظاہر یہ بیان کافی خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سزا دلوانا تو درکنار ممبئی بلاسٹ کے ملزم ڈیوڈ ہیڈلی سے ہندوستانی افسران کو ملاقات کرنے کا موقع بھی امریکی انتظامیہ نے نہیں دیا۔مسز ہیلری کلنٹن نے اپنے بیان میں کہا کہ میں منصوبے کے مطابق آئندہ ہفتہ اپنا دورہ کروں گی ۔میرا ایمان ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ساتھ دینا پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہے ۔ہم ہندوستان کے ہمراہ دہشت گردی کے خلاف اپنی مشترکہ جدوجہد کا عزم کرتے ہیں ۔تصور کریں کہ اگر ان بیانات کے پس منظر سے دھماکوں کو ہٹا دیا جائے تو یہ سب کس قدر بے محل معلوم ہوتے ہیں؟

ہیلری کلنٹن کے دورے کا مقصد نائب سکریٹری رابرٹ لیک نے ایک ویب کانفرنس میں

یوں واضح کیا: صدر اوبامہ اور سکریٹری کلنٹن دونوں ممالک کے عوام اور اکیسویں صدی میں عالمی تحفظ اور خوشحالی کے پیش نظر ہندامریکی تعلقات کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس جملے میں ایک پوشیدہ اشارہ چین کے بڑھتے ہوئے عالمی اثرات پر لگام لگانے کی جانب ہے جو ہندوستان اور امریکہ کا مشترکہ رقیب ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے تو ہندوستان پر اسلحہ سے متعلق لگائی گئی پابندیوں کو امریکہ نے ختم کردیا ہے اور پھر جوہری تکنیک کی فراہمی کا دروازہ کھولا گیا۔ رابرٹ بلیک کے مطابق ۲۰۱۰ء میں امریکہ اور ہندوستان کے درمیان تجارت میں پچھلے سال کی بنسبت ۳۰ رفی صد اضافہ ہوا ہے اور فوجی لین دین دوگنا ہوگیا ہے۔ اب توانائی کے علاوہ داخلی تحفظ، دفاعی ودیگر امور پر گفتگو ہوگی۔ ایسے میں اگر پاکستان سے ہندوستان کے تعلقات استوار ہوجائیں اور دھماکے نہ ہوں تو داخلی تحفظ اور دفاعی امور کی ہوا اپنے آپ نکل جاتی ہے۔

بلیک کے مطابق ہندامریکی تعلقات میں سب سے اہم مدعا دہشت گردی کیخلاف چلائی جانے والی مہم میں اشتراک عمل ہے اس کے لئے امریکی داخلی تحفظ کی سکریٹری جانیٹ ناپولیٹانو ممئی میں دہلی کا نہایت کامیاب دورہ کرکے وزیر داخلہ چدمبرم سے ملاقات کرچکی ہیں اور اب ہم ہندوستان سے افغانستان اور دیگر وسط ایشیائی ممالک میں تعاون پر گفتگو کرنے جارہے ہیں۔ ایک طرف تو امریکہ خود افغانستان سے بے آبرو ہوکر بھاگ رہا ہے اور جاتے جاتے اپنی بلا ہندوستان کے گلے میں ڈال کر جانا چاہتا ہے۔ امراجالا کے صحافی سنجے ابھگیان نے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا چونکہ ہندوستان کو اپنے غیر جانبدار ہونے پر فخر ہے اس لئے کیا وہ کبھی امریکہ کا دوست بمعنی حلیف ہوسکتا ہے اس کا چونکا دینے والا جواب بلیک کی جانب سے سامنے آیا اس نے کہا ہم ہندوستان کو غیر جانبدار ملک نہیں سمجھتے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد ہندوستان نے واقعی یہ محسوس کیا کہ ہند اور امریکہ کے درمیان بہت سارے مشترکہ مفادات اور اقدار ہیں۔ رابرٹ بلیک نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا کہ آئندہ چند سالوں میں ہندوستان اپنے دفاعی بجٹ پر ۳۰ ربلین ڈالر صرف کرنے والا ہے اس لئے امریکہ کے لئے وہ کافی اہمیت کا حامل (گاہک) ہے۔ فی الحال امریکہ کی معیشت جس طرح چرمرا رہی ہے ایسے میں ہندوستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی لیکن اس سے ہندوستان کے عوام کو کیا ملے گا؟ دھماکے، قتل وغارتگری اور گرفتاریاں نیز رہنماؤں کو حاصل ہوں گے ووٹ، اقتدار اور بے شمار بدعنوانی کی دولت جس کے بوجھ سے سوئزرلینڈ کے بنک بوجھل ہوئے جارہے ہیں اور جس کے خلاف ہزارے ورام دیو جیسے لوگ چلا رہے ہیں لیکن دھماکوں کے اس شور شرابے میں ان کی سننے والا کون ہے؟

# ممبئی بم دھماکہ

## کہیں بھی حادثہ گزرے وہ مجھ سے جوڑ دیتا ہے

فیض عثمانی بم دھماکوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تو اسے دہشت گردی کے نام پر ممبئی پولس نے ہلاک کردیا۔ ممبئی بم دھماکے کا ذمہ دار کون ہے اس کے سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن فیض عثمانی کا قاتل کون ہے اس بارے میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پولس ایک صحتمند آدمی کو جس کا بے گناہ بھائی تین سال سے احمد آباد میں قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کررہا ہے تفتیش کی غرض سے اپنے ساتھ تھانے لے گئی اور ایک گھنٹہ بعد اسے ہسپتال میں بھرتی کردیا گیا۔ اسکے دماغ کی رگیں پھٹ گئی تھیں اس کے باوجود نہ ہی اسے آئی سی یو کی سہولت فراہم کی گئی اور نہ ہی دوسرے دواخانے میں منتقل کیا گیا یہاں تک کہ وہ مظلوم اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ پولس کا دعوی ہے کہ اسے کوئی جسمانی اذیت نہیں دی گئی ڈاکٹر لہانے کہتے ہیں کہ اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں پایا گیا۔ اس کے باوجود ڈی جی پی اجیت پرسنس نے مسلمانوں پر یہ احسان کیا کہ موت کی وجوہات کا پتہ لگانے کے لئے سی آئی ڈی جانچ کا اعلان کردیا گویا چوروں کا پتہ لگانے کی ذمہ داری ڈاکوؤں کو سونپ دی گئی۔ کیا پولس کے محکمہ سے کوئی مجنون شخص بھی یہ توقع کرسکتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنے ہی لوگوں کے آستین پر لگے خون کے دھبے دیکھیں گے اورانہیں عیاں کرنے کی جرأت کریں گے؟ ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ دماغ کی رگیں جسمانی تکلیف سے نہیں بلکہ ذہنی اذیت رسانی سے پھٹتی ہیں اور اسی جرم کا ارتکاب ممبئی پولس نے کیا ہے۔ زبیدہ نام کی ایک بے کس خاتون کو بیوہ اور اس کے پیچھے معصوم بچوں کو یتیم کرنے کا گناہ عظیم ان ظالموں کے سر پر ہے جس کی سزا ان کو مل کر رہے گی۔

دھماکوں کے جال میں مسلم عوام کو کس طرح پھنسایا جاتا ہے اس کی ایک زندہ مثال بذاتِ خود فیض عثمانی کا بھائی افضل ہے۔ افضل عثمانی کو احمد آباد کے دھماکوں کا ذمہ دار قرار دے کر گرفتار کیا گیا لیکن جب اس کی فردِ جرم داخل کی گئی تو اس میں کئی قسم کے تضادات اور خامیاں سامنے آئیں دراصل جھوٹ خود اپنے خلاف گواہی دیتا ہے۔ افضل پر سول ہسپتال اور ایل جی ہسپتال کے قریب ہونے والے دھماکوں کا الزام ہے۔ سول ہسپتال والی چارج شیٹ ایک جگہ کہتی ہے کہ افضل نے دو عدد ویگن آر کار کی مدد سے دھماکے کئے دوسری جگہ اسی میں درج ہے کہ ایک گاڑی تو ویگن آر تھی مگر دوسری کار ماروتی ۸۰۰ تھی۔ اس کے برعکس ایل جی ہسپتال والی چارج شیٹ کے مطابق دو ویگن آر اور ایک ماروتی کا استعمال دھماکوں کی خاطر کیا گیا۔ ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر ایک ہی شخص بیک وقت کیونکر موجود تھا جبکہ دونوں دھماکے ایک ساتھ ہوئے؟ اور اگر اس کام کو ایک سے زیادہ لوگوں نے کیا تو ان میں افضل کہاں تھا اور تھا بھی کہ نہیں تھا؟ ان دھماکوں میں استعمال ہونے والے اشتعال انگیز مادے کے بارے میں بھی تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔

احمد آباد اور سورت میں ہونے والے دھماکوں کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دینے میں فردِ جرم بری طرح ناکام ہے۔ اس چارج شیٹ میں ویسے تو انڈین مجاہدین کی جانب سے ایک ای میل کے ذریعہ دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرنے کا ذکر ہے جس میں کہا گیا تھا کہ دھماکے گجرات فسادات کا بدلہ لینے کے لئے کروائے گئے لیکن چارج شیٹ کا دعویٰ اس سے مختلف یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لئے یہ دھماکے برپا کئے گئے۔ بم دھماکوں کی وجہ بدلے کی کارروائی تو کسی حد تک قرین قیاس ہے لیکن نظامِ حکومت کے قیام کی بات جس پر فردِ جرم میں اصرار کیا گیا ہے مسلمانوں تو کجا ہندو دانشوروں کے گلے سے بھی نہیں اترتی۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اس فردِ جرم میں اصل وجوہات پر روشنی ڈالنے کے بجائے اشتعال انگیز تقاریر کرنا اور سی ڈی تقسیم کرنا جیسے الزامات کو بلاوجہ بار بار دوہرایا گیا ہے۔

جولائی ۲۰۰۸ء میں احمد آباد بم دھماکوں کے ماسٹر مائنڈ کو سرکاری گواہ بنالینے کا دعویٰ گجرات پولس نے بڑے طمطراق سے کیا تو تہلکہ جریدے کی رعنا ایوب نے کالج کے اس نوجوان طالب علم سے ملاقات کی اور اس گفتگو میں چند ناقابلِ یقین حقائق سامنے آئے جسے ہر کوئی تہلکہ کی ویب سائٹ پر پڑھ سکتا ہے۔ اس گواہ نے اعتراف کیا کہ وہ بم دھماکوں کی سازش اور تیاری میں شریک تھا۔ اسے فسادات کی کیسٹ دکھلا کر اس کام کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ دھماکوں میں ان کے گروہ کا سرغنہ عالم زیب

تھا جو ایک بیرونی خفیہ گروہ (جس کا احمد آباد سے کوئی واسطہ نہ تھا) کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ اس گروہ کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ لوگ جدید طرز کا لباس پہنتے تھے اور خوب سگریٹ پیتے تھے۔ عالم زیب نے اپنے تمام ساتھیوں کو سیمی سے خاص طور پر دور رہنے کی تاکید کر رکھی تھی اور اس گواہ کے مطابق اگر وہ سیمی کے سابقہ ارکان سے ملتے تو وہ انہیں اس کارروائی میں ملوث ہونے سے منع کرتے۔

ابتدا میں ان سے کہا گیا تھا کہ سنگھ پریوار کے دفاتر اور فسادات کے مجرمین مثلاً بجرنگی وغیرہ کو نشانہ بنایا جائیگا لیکن آخری دن اہداف کو تبدیل کر دیا گیا اور بموں کو عام مقامات پر نصب کرنے کا حکم دیا گیا جس سے بدظن ہو کر اس گواہ نے اپنے آپ کو اس کارروائی سے الگ کر لیا اس کے باوجود پولس نے اسے گرفتار کر کے بری طرح زدوکوب کیا اور جب وہ ٹوٹ گیا تو اسے سیمی کے سابق ممبران کی فہرست پکڑا دی گئی جن کو مورد الزام ٹھہرا کر اس نے اپنی گردن چھڑائی۔ اس نوجوان نے صاف کہا کہ انڈین مجاہدین جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایسے میں یہ سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ وہ کون لوگ تھے جن کے اشارے پر دھماکے کئے گئے اور جن کا بال بیکا نہیں ہوا۔ پولس اور انتظامیہ نے ان کی جانب سے پوری طرح صرف نظر کرتے ہوئے ان مجرمین کے بجائے کبھی انڈین مجاہدین تو کبھی حزب المجاہدین کے نام کا شور مچایا اور افضل و شہزاد جیسے لوگوں کو بلی کا بکرہ بنا کر گرفتار کر لیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ درمیان میں شہزاد کہاں سے آ گیا؟

شہزاد گجرات پولس کا ایک تازہ شکار ہے جسے حال میں نہایت مضحکہ خیز انداز میں گرفتار کیا گیا۔ ممبئی کے حالیہ بم دھماکوں کے دو دن بعد احمد آباد پولس نے شہزاد رنگریز کو احمد آباد میں ڈانی لمڈا نامی مقام سے دس بموں کے ساتھ گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا پولس کے مطابق اس نے یہ بم رتھ یاترا کے وقت دھماکہ کرنے کی غرض سے بنائے تھے لیکن سخت انتظامات کے باعث وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ممبئی کے بم دھماکوں نے اس کے حوصلوں کو بلند کر دیا تھا۔ اس بار پھر دھماکوں کی کوئی معقول وجہ ندارد ہے۔ نہ تو ممبئی پولس اور نہ ہی گجرات اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب دے پا رہی ہے۔ اسکے باوجود ذرائع ابلاغ ان بے سر پیر کی خبروں کو زور شور سے اچھالنے میں لگا ہوا ہے۔

شہزاد کی گرفتاری کی کہانی بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ شہزاد اپنی دوسری بیوی ریشماں کے پاس رات شراب پی کر آیا تو میاں بیوی کے درمیان لڑائی ہو گئی ریشماں اپنے شوہر کی شکایت لے کر پولس تھانے پہونچی تو پولس نے شہزاد کو سبق سکھلانے کے عوض ریشماں کو شہ دی کہ وہ شہزاد پر بم بنانے کا الزام تھوپ دے۔ اپنے خصم سے ناراض ریشماں پولس کے جھانسے میں آ گئی

اور رپورٹ درج کرائی کہ شہزاد نے اسے بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی اور اس طرح اسے پتہ چلا کہ شہزاد کے پاس بم ہے۔ پولس نے چھاپہ مار کر ایک بم اسی کمرے سے برآمد کر لیا جس میں ریشماں رہتی ہے لیکن اسے اس بم کے بارے میں لڑائی سے پہلے پتہ نہ تھا۔ یہ ایک ایسی احمقانہ بات ہے کہ بالی ووڈ والے بھی اسے بتلانے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن ہندوستانی ذرائع ابلاغ میں سب کچھ کھپ جاتا ہے۔ پولس شہزاد نامی شرابی کو انڈین مجاہد قرار دے دیتی ہے اور اخبارات میں اس کی تصاویر چھپ جاتی ہیں۔ پولس کے مطابق اس کے گھر پر ایک اور چنڈولہ جھیل کے کنارے سات بم و دیگر ساز و سامان پکڑا گیا جن کی مدد سے شہزاد بم بناتا تھا۔ دو دن بعد پولس نے یونس نامی ایک شخص کو گرفتار کیا اس پر الزام ہے کہ اس نے یہ بم شہزاد کو دیئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بم کس نے بنائے یونس نے یا شہزاد نے؟ پولس نے ریشماں کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا اس نے چار سال قبل بھی ایک بنگلہ دیشی کی مدد سے شہزاد کے بم بنانے کی اطلاع پولس کو دی تھی اگر یہ صحیح ہے تو پولس نے شہزاد کی نگرانی کیوں نہیں کی اور اس کو دوبارہ بم بنانے سے قبل گرفتار کیوں نہیں کیا؟

دنیا بھر میں تو یہ ہوتا ہے کہ کئی دھماکوں کو ذمہ داری کسی ایک تنظیم کے سر تھوپ دی جاتی ہے ویسے اس صورتحال کو بالکل بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کوئی ایک تنظیم مختلف دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہو مثلاً سی آئی اے یا موساد جنکی دہشت گردی کا شمار مشکل ہے لیکن ہندوستان کو اس کے برعکس یہ سعادت حاصل ہے کہ یہاں ایک ہی دھماکے کی ذمہ داری مختلف لوگوں کے سر تھوپ دی جاتی ہے اور ان حیرت انگیز واقعات پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ اس طرح کے واقعات کی ایک مشہور مثال تو ۲۰۰۶ء میں ہونے والا وارانسی کا دھماکہ ہے جس کے الزام میں انتظامیہ نے پھولپور اعظم گڑھ کے ولی اللہ کو سرغنہ قرار دے کر اپریل ۲۰۰۶ء میں گرفتار کر لیا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد باغپت کے رہنے والے ابوزبیر کو کپوارہ میں ہلاک کر کے یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ وارانسی بم دھماکے کا اصل مجرم وہی تھا اور وہ فرار ہو کر پاکستان جا رہا تھا کہ پولس مڈبھیڑ میں مارا گیا۔ ان دونوں متضاد خبروں کو ذرائع ابلاغ بے دھڑک شائع کرتا رہا کسی نے رک کر پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ آخر سچ کیا ہے؟

ولی اللہ کے اہل خانہ ان کے معصوم ہونے کی دہائی دیتے رہے اور وکلاء نے ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ عدالتی دہشت گردی کا یہ عالم تھا کہ کسی وکیل کو ان کی پیروی کی اجازت نہیں تھی جو کوئی آگے آتا تو اسے دھمکی دی جاتی بلکہ ایک مرتبہ عدالت کے احاطے میں وکلاء نے ملزم پر حملہ بھی کر دیا۔ دوسری جانب فاسٹ ٹریک عدالت میں پولس انسپکٹر ترپاٹھی مسلسل آٹھ پیشیوں میں حاضر نہیں

ہوئے یہاں تک کہ جج نے ولی اللہ کو رہا کرنے کی دھمکی دے دی تب جا کر مقدمہ آگے بڑھا ۲۰۰۸ء میں ولی اللہ کو ملک سے بغاوت جیسے سنگین الزامات سے بری کر دیا گیا مگر غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور سازش کرنے کا الزام لگا کر دس سال کی سزا پھر بھی سنائی گئی۔ اس مقدمے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے مسلمانوں کے ساتھ پولس اور انتظامیہ کس طرح کا معاملہ کرتا ہے۔ جن الزامات کا اعتراف ایمانند کر چکا ہے آج بھی ان کے لئے انڈین مجاہدین اور حرکت الجہاد کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کرنل پروہت اور سادھوی پرگیہ کے خلاف اس قدر شواہد کے موجود ہونے کے باوجود بے گناہ مسلم نوجوان ہنوز رہائی سے محروم ہیں۔ بقول شاعر

مجھے بے دست و پا کر کے بھی خوف اس کا نہیں جاتا

کہیں بھی حادثہ گزرے وہ مجھ سے جوڑ دیتا ہے

سیاسی جماعتیں اور انتظامیہ اپنی گوناگوں مفادات کے پیش نظر دھڑلے کے ساتھ اس طرح کا ظلم و زیادتی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ عوام کی یادداشت پوری طرح غارت ہو چکی ہے انہیں ماضی کی کوئی بات یاد نہیں رہتی اور وہ ہر قسم کی کذب بیانی پر ایمان لانے کے لئے ہر دم تیار بیٹھے ہیں ورنہ یہ نہ ہوتا کہ جس روز فیض عثمانی کا بہیمانہ قتل ہوا اس روز ممبئی کے سب سے بڑے اور معتبر سمجھے جانے والے اخبار ٹائمز کے ٹیلی ویژن چینل سے حرکت الجہاد کے جنوبی ہند کے نام نہاد کمانڈر محمد یوسف کا اقبالیہ بیان نشر ہو رہا ہوتا۔ اس شخص کو ڈیڑھ سال قبل گرفتار کیا گیا اور ۲۰ رجنوری ۲۰۱۰ء کو یہ فلم ٹائمز ناؤ سے نشر ہو چکی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس اقبالیہ بیان کی فلم ٹائمز کو ملی کیسے؟ پولس نے اسے کیوں ذرائع ابلاغ کے حوالے کیا؟ اور اس فلم میں جس شخص کو دکھلایا گیا وہ کون ہے؟ اور گزشتہ ڈیڑھ سالوں کے درمیان اس کا مقدمہ کہاں تک پہنچا؟ یہ سب بتلانے کے بجائے اسے اس طرح نشر کیا جا رہا تھا گویا موجودہ دھماکوں میں اس شخص کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اچانک اس طویل عرصے کے بعد ٹائمز کو اس فلم کو نشر کرنے کا خیال اس موقع پر کیوں آیا نیز اس عرصے میں سنگھ پریوار کے جن دہشت گردوں نے جھوٹ پکڑنے والی مشین کے آگے بیانات دیئے ہیں پولس انہیں ذرائع ابلاغ کے حوالے کیوں نہیں کرتی اور ٹائمز والے ایسے مواقع پر سوامی ایمانند کے اقبالیہ بیان کو کیونکر پوری طرح بھلا دیتے ہیں۔ اسے بھی نشر کر کے اپنے غیر جانبدار ہونے کا ثبوت کیوں پیش نہیں کیا جاتا؟ یہ تمام سوالات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ نام نہاد آزاد میڈیا دولت کی غلامی میں اندھا ہو چکا ہے اور عوام کی آنکھوں میں دھول

جھونک رہا ہے۔ بقول شاعر۔

حادثہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا　　یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

ٹائمز ناؤ کی ایک صحافی اس روز بہار کے کشن گنج ضلع میں پاؤ کھالی نام کے گاؤں میں بھی پہنچ گئی جہاں ریاض السر کار نامی بنگلہ دیشی کو بم دھماکوں میں ملوث ہونے کے شبہ میں پولس نے گرفتار کرلیا اس صحافی ریاض کے مکان مالک مہتاب عالم کا انٹرویو نشر کیا۔ ریاض السر کار کے بارے میں بتلایا گیا کہ وہ حرکت الجہاد سے تعلق رکھتا ہے اور پولس اس کے انڈین مجاہدین اور سیمی سے تعلقات کا پتہ لگا رہی ہے۔ ویسے ریاض اپنے آپ کو ہندوستانی بتلاتا ہے۔ اسے ہندی اور انگریزی کے علاوہ کنڑ زبان پر بھی ملکہ حاصل ہے اور پولس کے مطابق اس کی ڈائری میں مراٹھی زبان کے اندراجات بھی پائے گئے ہیں۔ یہ کیسا بنگلہ دیشی ہے جو بنگلور اور ممبئی جیسے شہروں میں رہنے کے بعد کشن گنج میں جا بسا ہے؟ جبکہ اسکے نشانے پر یہی بڑے شہر ہیں۔

رات گئے تک ٹائمز ناؤ کی یہ اوٹ پٹانگ خبریں دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی تو خواب میں ۲۶ رنومبر کو ممبئی شہر پر ہونے والے حملے کی فلم چل پڑی میں نے دیکھا لیو پولڈ کیفے سے دہشت گرد بیئر کی کئی بوتلیں چڑھا کر باہر نکلے اور سی ایس ٹی ریلوے اسٹیشن پر آکر اندھا دھند گولیاں برسانے لگے اس کے بعد وہ باہر آکر ٹائمز کی عمارت میں گھس گئے اور ٹائمز ناؤ کے دفتر کو تہس نہس کر ڈالا۔ میں خواب میں ٹیلی ویژن کا چینل بدل کر آج تک پر جا پہونچا جہاں شوخ اور چنچل انامیکا ٹائمز کی تباہی پر افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔ ٹائمز والوں نے اس حملے کے بعد اپنی نشریات ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس خبر کو سناتے وقت انامیکا کا چہرہ خوشی سے تازہ گلاب کی مانند کھل گیا تھا۔ اس خبر پر تبصرے کی خاطر انامیکا نے فون سے آندھرا کے جنگلوں میں بیٹھے نکسلی رہنما تنگاراؤ سے رابطہ قائم کیا جن کی کردار کشی حال ہی میں ٹائمز ناؤ چینل نے کی تھی۔ جب ان سے ٹائمز کے بند ہو جانے پر اپنی رائے کا اظہار دینے کے لئے کہا گیا تو تنگاراؤ بولے ''یہ تو گینگ وار ہے۔ کرائے کے صحافی جو مائک ہاتھ میں لے کر ہر روز عوام کو اپنی دہشت گردی کا شکار کرتے ہیں۔ بالآخر وہ کرائے کے دہشت گردوں کے ہاتھ مارے گئے۔ معمولی سے توقف کے بعد تنگاراؤ نے آگے کہا بھئی میں تو پیپلس وار کا آدمی ہوں مجھے اس گینگ وار میں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس پر کسی قسم کا افسوس ہے۔'' اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا مجھے بھی کوئی افسوس نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ جب عوام کی آنکھ کھلے گی تو اسے بھی کوئی افسوس نہیں ہوگا۔

# دھلی دھماکہ

## تو روشنی کے واسطے جلا لیا گیا مجھے

دنیا بھر کے لوگوں نے ۱۱ ستمبر کو دس سال قبل ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے کو یاد کیا اور اس کے سوگ میں ہم ہندوستانیوں نے پانچ روز قبل دہلی ہائی کورٹ کے باہر ہونے والے دھماکے کو فراموش کر دیا۔ ہندوستان کے لوگوں کی جس صفت کا اعتراف ساری دنیا کرتی ہے وہ ہمارا صبر و تحمل ہے جو اپنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس معاملے میں استثناء اس وقت ہوتا ہے جب کسی کمزور کے خلاف ہمیں سرکاری تحفظ حاصل ہو جائے جیسا کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد خود دہلی میں ہوا تھا یا گودھرا ٹرین حادثے بعد گجرات میں ہوا۔ ہمارے عفو و درگذر کا راز ہماری مجبوری میں پنہاں ہے جس کا جی بھر کے فائدہ ہماری حکومت اٹھاتی ہے اور یہی کچھ دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے کے بعد بھی ہوا۔ ہم نے اس واقعہ کو اس قدر آسانی سے کیونکر بھلا دیا؟ اس سوال کا نہایت دلچسپ جائزہ مختلف ماہرین نفسیات نے پیش کیا ہے۔

معروف ماہر نفسیات اودھیش شرما کے مطابق اس طرح کے حملوں کے بار بار ہونے نے ہمیں ان کا عادی بنا دیا ہے۔ ہمارا ذہن ان حادثات کو درج تو کرتا ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کے اندر اس سے متعلقہ احساسات وجذبات پیدا نہیں ہوتے۔ ایک بہیمانہ قتل عام ہمارے لئے ایک خبر بن کر رہ جاتا ہے اور اموات کو ہم تعداد میں شمار کرتے ہیں۔ تحت الشعور میں ہم اس واقعہ کا موازنہ کسی فلمی منظر سے کرنے لگتے ہیں۔ جب کوئی سیاستداں اسے بزدلانہ حملہ قرار دیتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کوئی پرانی ریل دوہرائی جارہی ہے۔ ٹی وی کے پردے پر نظر آنے والے مناظر میں بھی بلا کی یکسانیت دکھائی دیتی

ہے یہ الفاظ دگر ضمیر کی موت نے احساس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اس لئے کہ ہم سب جانتے ہیں جن سراغوں کا ابتدا میں بڑے طمطراق کے ساتھ دعویٰ کیا جاتا ہے وہ آگے چل کر ایک اندھی گلی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ اس لئے معروف ماہر نفسیات ایرا تریویدی یوں رقمطراز ہیں کہ یکے بعد دیگرے حادثات کے باعث ہماری بے حسی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جب کسی حادثے کی خبر ہمیں ملتی ہے تو سب سے پہلے ہم اپنے اعزہ و اقارب کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب پتہ چلتا ہے کہ وہ سارے محفوظ و مامون ہیں تو پھر اپنے کام میں کولہو کے بیل کی مانند جٹ جاتے ہیں۔ شرما کا کہنا ہے کہ آج کل ہمارے آس پاس اس قدر منفی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ان حادثات کی جانب بالکل توجہ نہیں کرتے جو ہم پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتے۔ اسی لئے ٹیلی ویژن کے پردے پر بکھری ہوئی لاشوں کے مناظر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ مرکزی وزیر برائے سیاحت سبودھ کانت سہائے نے جو ممبئی بم دھماکے کے وقت فیشن شو سے محظوظ ہو رہے تھے دہلی دھماکے کے بعد اعلان کیا کہ دھماکے کہاں نہیں ہوتے؟ دنیا بھر میں ہوتے رہتے ہیں اور ہم نے تو دھماکوں کے بیچ جینا سیکھ لیا ہے۔ ان سے ہمارے معمولات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دہلی ہائی کورٹ کی کارروائی دھماکے کے باوجود جاری رہی۔ اس افسوس ناک صورتحال میں عوام کی حالتِ زار پر ساحر لدھیانوی کے یہ اشعار صادق آتے ہیں۔

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

شاعر کی طرح ماہرین نفسیات کی رائے بھی یقیناً مبنی بر حقیقت ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حملے بار بار ہوتے کیوں ہیں؟ جب تک اس سوال کا جواب ہم حاصل نہیں کرتے اس وقت تک ان حملوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور قوم کے چند افراد اس میں اپنی جان عزیز گنوائیں گے مگر من حیث القوم ہم ایک زندہ لاش میں تبدیل ہو جائیں گے۔

دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے پر تبصرہ کرتے ہوئے تمام ذرائع ابلاغ نے اس بات پر اشارہ کیا کہ یہ اسی سال ۲۵ رمئی کو ہونے والے حملے کا اعادہ ہے۔ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ وہ ریہرسل تھا اور یہ اصل ہے لیکن یہ سراسر حماقت کی بات ہے۔ دہشت گردانہ حملوں کا ریہرسل نہیں کیا جاتا۔ اس

حقیقت کے باوجود اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حملوں کے اندر گہرا تعلق ہے چونکہ دونوں کا مقصد یکساں ہے اس لئے یقیناً دونوں کے حملہ آور کا ایک ہی ہونا فطری امر ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حملہ آور کون ہے؟ اس کا پتہ لگانے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ دونوں ہی مرتبہ ان دھما کوں نے کس کا بھلا کیا؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لئے مئی کے آخری ہفتہ میں وقوع پذیر ہوئے سیاسی حالات اور ماہ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں رونما ہونے والے واقعات کا موازنہ ضروری ہے۔ ۲۰ رمئی کے دن ۲۔جی بدعنوانی کے معاملے میں سی بی آئی کی رپورٹ شائع ہوئی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا اور وہی زمانہ تھا جبکہ دولتِ مشترکہ کے کھیلوں میں ہونے والی بدعنوانی منظرِ عام آئی اور سریش کلماڑی سمیت کئی افراد گرفتار ہوئے۔ ستمبر کے آغاز میں نوٹ کے بدلے ووٹ کی کہانی بے نقاب ہوئی اور امر سنگھ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن یہ تو ایک واقعہ تھا اس کے علاوہ آڈیٹر اور کمپٹر ولر کی رپورٹ پارلیمان میں پیش ہوئی جس میں ائیر انڈیا کے ذریعہ جہازوں کی خریداری پر بے شمار سوالات اٹھائے گئے ریلائنس کے کرشنا گوداوری ٹھیکے کی بدعنوانیاں نمایاں کی گئیں۔ یہی وہ وقت تھا جب آدرش گھوٹالہ میں دو مرکزی وزراء ولاس راؤ دیشمکھ اور سشیل کمار شندے سے سی بی آئی نے پوچھ تاچھ کا آغاز کیا۔ اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالات پر غور کیا جائے تو عقدہ اپنے آپ کھل جاتا ہے:

- ذرائع ابلاغ میں مندرجہ بالا خبروں پر پردہ ڈالنے کی ضرورت کسے تھی؟
- ان موضوعات پر اخبارات و ٹیلی ویژن پر بحث و مباحثے میں کس کا نقصان تھا؟
- بدھ کے دن اگر دہلی ہائی کورٹ کا دھماکہ نہیں ہوتا تو کیا اس دن امر سنگھ کی ضمانت کے رد ہو جانے کے باعث کانگریس کے ساتھ ان کے امر پریم کی کہانی پردہ سیمیں پر زیرِ بحث نہیں آتی؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کہانی کے ہیرو منموہن اپنے آپ کو کیسے بچاتے؟
- جمعرات کو جب ریلائنس اور ائیر انڈیا کے گھپلے سامنے آتے تو کیا امبانی اور پٹیل کو منہ چھپانے کی کوئی جگہ میسر آتی؟
- انا ہزارے کی بھوک ہڑتال ختم کروانے والے ولاس راؤ جب سی بی آئی کے دفتر سے اپنی آدرش صفائی پیش کر کے لوٹتے تو کیا ٹی وی والے انہیں بخش دیتے؟

دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے نے ان تمام سوالات کو معصوم عوام کے خون کی چادر سے ڈھانپ دیا گیا بقول قتیل شفائی۔

کبھی جوان کے جشن میں سیاہیاں بکھر گئیں　　　تو روشنی کے واسطے جلا لیے گیے مجھے

آج کل ہمارے ملک میں بدعنوانیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کی جانب سے توجہ ہٹانے کے لئے بم دھماکے کروانا بظاہر غیر منطقی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی ان گھپلوں کی نوعیت اور کمیت پر غور کرے اور ہمارے سیاستدانوں کی خصلت وجرأت کو نظر میں رکھے تو اسے یہ حرکت نہایت معمولی دکھائی دے گی۔ دولتِ مشترکہ کے کھیلوں کی انتظامیہ کمیٹی کے سابق صدر سریش کلماڑی پرانے کانگریسی ہیں۔ کانگریس پارٹی میں ان کی پذیرائی محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ شرد پوار کے ازلی دشمن ہیں اور اسی لئے انہیں کھانے کمانے کا موقع دینے کے لئے اس کمیٹی کی صدارت سے نوازہ گیا۔ انہوں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوتے ہوئے تمام اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر ایک سوئس کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا جس سے سرکاری خزانے کا ۹۵ رکروڑ روپئے کا نقصان ہوا۔ ایسا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے افسران تک کو کنارے لگا دیا۔ ان کے ایک دستِ راست سرجیت نے دعویٰ کیا تھا کہ وزارتِ کھیل نے سوئس ٹائمنگ کمپنی کو ایک ٹنڈر کی بنیاد پر ٹھیکہ دینے کی توثیق کی تھی جو سراسر بے بنیاد پایا گیا۔ ۲۵ رمئی کے ملک بھر کے اخبارات میں کلماڑی کے خلاف داخل ہونے والی چارج شیٹ سب سے بڑی خبر تھی۔ دوسری بڑی خبر ۲۔جی گھپلے میں سی بی آئی کی جانب سے داخل کی جانے والی سابق وزیر مواصلات واطلاعات کے خلاف پیش ہونے والی چارج شیٹ کا ذکر تھا۔ سی بی آئی نے اس معاملے میں ۳۰۰۰۰ رہزار کروڑ کے گھپلے کا الزام لگایا تھا اور خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اس میں سے کچھ بھی سرکار کو واپس نہیں ملے گا۔ ان معاملات پر پردہ ڈالنے کے لئے دہلی ہائی کورٹ میں ایک ایسا دھماکہ کروینا جس میں کوئی جانی ومالی نقصان نہ ہو کوئی مہنگا سودہ ہرگز نہیں تھا۔

اے راجہ کا قصور تو بس اتنا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو عوام کی دولت لوٹ کر اسم بامسمہ بنانے کی کوشش کی تھی اس کی جانب سب سے پہلے انگشت نمائی سی اے جی کی رپورٹ میں کی گئی اور الزام لگایا گیا کہ 1.76 لاکھ کروڑ کی خرد برد ہوئی ہے۔ سی بی آئی نے اسے ہلکا بھی کیا تو بات ۳۰ رہزار کروڑ سے کم نہ ہوسکی۔ اس میں دوسو کروڑ تو ڈی ایم کے پارٹی کے ٹی وی چینل کو دیئے گئے اور اس الزام میں کرونا ندھی کی بیٹی کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس کے علاوہ راجہ کے پاس بیرونی زر مبادلہ کی جو غیر قانونی رقم پائی گئی وہ ہزار کروڑ ہے۔ راجہ نے اپنی دولت کو اس ہوشیاری سے مختلف افراد اور نجی ٹرسٹوں میں پھیلا دیا ہے کہ سی بی آئی کے لئے جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسے ثابت کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ راجہ کے اس کالے دھندے میں اس کا کھوٹا صادق باشاہوا کرتا تھا۔

جب سی بی آئی نے اس کے اطراف شکنجہ تنگ کیا اور وہ تعاون کے لئے تیار ہو گیا تو اسے قتل کروا دیا گیا ۔ جو لوگ اپنے ہی خواہوں کو بلی کا بکرہ بنانے میں پس و پیش نہیں کرتے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اجنبی معصوموں کا خون ناحق بہانے سے گریز کریں گے خام خیالی نہیں تو اور کیا ہے؟ مواصلات کے شعبے میں ہونے والی اس زبردست بدعنوانی کا حزب اختلاف بی جے پی کوئی فائدہ نہیں اٹھا پا رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس نے بڑی عیاری کے ساتھ سی بی آئی کی تفتیش کا دائرہ کار وسیع کر دیا ہے اور اس میں این ڈی اے کے وزراء پرمود مہاجن، رام ولاس پاسوان اور ارون شوری کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے سابقہ وزیر خزانہ جسونت سنگھ سے بھی پوچھ تاچھ شروع کر کے بی جے پی کی نیند اڑا دی ہے اس لئے یہ بیچارے انا ہزارے کی حمایت پر قناعت کر کے بیٹھے رہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس دھماکے کے بعد اڈوانی نے دہشت گردی کے بجائے بدعنوانی کے خلاف رتھ یاترا کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے جو نوجوان قیادت اڈوانی کی رتھ میں پیش پیش ہوتی تھی اب وہ سرد مہری دکھلا رہی ہے اس لئے کہ انہیں اس کے پہیے تلے اپنے خواب کچلتے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں۔

ستمبر کے حالات مئی سے زیادہ سنگین تھے امر سنگھ کے علاوہ دو مرکزی وزراء دیشمکھ اور شندے پر آدرش گھوٹالے کے الزامات نیز ایئر انڈیا اور ریلائینس پر سی اے جی کی رپورٹ یہ ایک بڑے دھماکے کا تقاضہ کرتی تھی۔ سرکار جانتی تھی کہ امر سنگھ منگل کو گرفتار ہوں گے ان کی درخواستِ ضمانت بدھ کو نامنظور ہو گی اور جمعرات کو سی اے جی کی رپورٹ پارلیمان میں پیش ہو گی۔ حکومت کو یہ بھی پتہ تھا کہ اس رپورٹ میں کس قدر دھماکہ خیز انکشافات ہوں گے اس لئے بدھ کا دن دہلی ہائی کورٹ کے دھماکے کے لئے مختص کیا گیا اور سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا۔ پرفل پٹیل نے تو خیر ٹی وی پر اپنی صفائی پیش کر دی لیکن ریلائنس کے دفتر سے تو ذرائع ابلاغ والے رپورٹ یا انٹرویو لانے کے بجائے صرف تحفے تحائف لے کر لوٹ آئے اور انہیں عوام کی نظروں سے چھپا دیا۔ پرفل پٹیل نے بجائے ۱۱۱ ر جہاز خریدنے کا جواز پیش کرنے کے سی اے جی رپورٹ میں تضادات نکالنے شروع کر دیا۔ ایئر انڈیا نے ایک ایسے وقت میں جبکہ اس کا جہاز ڈوب رہا ہے ۴۰۰۰۰ کروڑ کا سودہ بغیر بازار کی جانچ پڑتال کے کر دیا۔ ایسا کرنے کے لئے پہلے انڈین ایئر لائنز کو اس میں ضم کیا گیا اس فیصلے پر بھی سی اے جی نے اعتراض کیا اور پھر بڑی جلد بازی میں ایک ایسی ضرورت پیش کی گئی جو نا معقول ہے فی الحال اس دم توڑتی کمپنی کے پاس اپنے ملازمین کو تنخواہ دینے کے لئے مالی وسائل نہیں ہیں اس لئے کہ یہ ۳۸۰۰۰ ر ہزار کروڑ خسارے میں ہے۔ اگر یہ احمقانہ سودہ نہیں کیا گیا ہوتا تو ایئر انڈیا

خسارے کے بجائے منافع میں ہوتی۔ یہ سرکاری کمپنی ایک جانب جہاز خرید رہی ہے اور دوسری طرف حکومت کی جانب سے غیر ملکی ہوائی کمپنیوں کو ہندوستانی ہوائی اڈوں تک رسائی دی جارہی ہے اس خودکش حکمتِ عملی پر بھی سی اے جی نے اعتراض کیا ہے۔

کرشنا گوداوری کے ڈیلٹا میں ریلائنس کی جانب سے تیل کے ذخائر کا انکشاف اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز خبر تھی اس لئے کہ یہ نوزائیدہ نجی کمپنی مغربی ہندوستان میں کام کرتی تھی اور سرکاری ادارہ او این جی سی برسوں سے معدنی تیل کی تحقیق و تفتیش میں لگا ہوا تھا اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ او این جی سی کو اس کا پتہ چلتا خیر لکشمی دیوی کی کرپا سے وہ چمتکار ہو گیا۔ اس کے بعد ریلائنس نے حکومت سے معاہدہ کر کے وہ علاقہ اپنے قبضے میں کیا لیکن ٹھیکے میں اراضی کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہیں کی۔ اس لئے ایک کے بعد ایک دس اضافی ٹھیکے دیئے گئے اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ سی اے جی کے مطابق ڈائرکٹر جنرل ہائیڈروکاربن کو چاہئے تھا کہ وہ ریلائنس کو دوسرے مرحلے سے روک دیتے اس لئے اب ٹھیکے کے دس مرحلوں پر نظر ثانی ہونی چاہئے اور ایسا کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب اہل نہیں ہیں۔ ریلائنس نے ۲۵ فی صد تیل سے مالا مال علاقہ حکومت کو واپس کرنے کی شرط سے بھی روگردانی کی ہے۔ ریلائنس کی دھاندلی کی فہرست کافی طویل ہے ایک طرف اس نے پیداوار کی تقسیم میں چوری کی اور دوسری جانب جن کنوؤں سے تیل نکالا جاچکا ہے انہیں قاعدے سے بند کرنے کی ماحولیاتی ذمہ داری بھی ادا نہیں کی۔ چند سال قبل ہندوستان جیسے غریب ملک کے سرمایہ دار مکیش امبانی کو جب دنیا کے سب سے امیر آدمی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تو سب لوگ حیرت زدہ تھے لیکن اگر حکومت وقت اپنا قومی سرمایہ نجی لوگوں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے لگے تو یہی ہوگا کہ عوام غریب سے غریب تر اور سرمایہ دار امیر سے امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ کے زیر سایہ ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ منموہن جی نے جس وقت اقتدار سنبھالا تھا اس وقت لوگ انہیں نہایت صاف ستھرے کردار کا حامل سیاستداں سمجھتے تھے لیکن اب حال یہ ہے کہ ان کی حکومت کو ہندوستانی تاریخ کی سب سے زیادہ بدعنوان حکومت ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے یہ اور بات ہے کہ کانگریسی حضرات تو کجا بدعنوانی کے خلاف لڑنے والے دورِ حاضر کے عظیم سورما انا ہزارے بھی ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں گویا ایک طرف ملک دھماکوں کی زد میں اور دوسری جانب انشا جی کے نام کو منموہن سے بدل کر ان کے شعر کو یوں پڑھا جارہا ہے۔

تم منموہن کا نام سنو، کیا منموہن سودائی ہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں

# میرا کا درد

محترمہ میرا شنکر کو امریکہ میں ہندوستان کی اولین خاتون سفیر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس سے پہلے وہ جرمنی میں اسی عہدے پر فائز تھیں۔ ویسے ۱۹۹۰ء میں جبکہ سدھارتھ شنکر رائے سفیر ہوا کرتے تھے وہ امریکی سفارت خانے کے اقتصادی شعبہ میں کام کر چکی ہیں۔ سفارتی حلقوں میں میرا شنکر نہایت قابل اور پروقار خاتون کے طور پر معروف ہیں جس کی تصدیق خود صدر اوبامہ بھی کر چکے ہیں۔ انہیں ایک ایسے وقت میں امریکہ میں سفارتکاری کا سنہرہ موقع ملا جب کہ ہند امریکی تعلقات عنفوانِ شباب پر ہیں۔ میرا شنکر نے وزیرِاعظم من موہن سنگھ کے امریکی دورے سے قبل اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا "ہم امید اور مواقع کے ایک پرعزم دور میں ہیں۔ وزیرِاعظم سنگھ اور صدر اوبامہ ہمارے آپسی تعلقات کی بہتری کو عظیم بلندیوں پر لے جائیں گے اور باہم اعتماد و تعاون کا نقشہ کار مرتب کریں گے۔" اس بیان کے ایک سال بعد صدر اوبامہ کے ہندوستانی دورے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میرا نے کہا ہندوستان کی غیر معمولی معاشی ترقی نے ہند امریکی تعلقات کی بہتری میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ براک اوبامہ کے ہندوستانی دورے میں دونوں ممالک کے رہنماؤں نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ہند امریکی اشتراک نہ صرف ان دو ممالک بلکہ عالمی استحکام اور خوشحالی کے لئے ناگزیر ہے۔ امریکہ پر اپنے ملک کے احسانات گناتے ہوئے وہ بولیں کے اوبامہ کے مذکورہ دورے میں امریکی تاجروں نے ایک ہزار کروڑ ڈالر کی برآمد کے معاہدے کئے ہیں جن سے امریکہ کے اندر پچاس ہزار لوگوں کو ملازمت ملے گی گویا یہ دوستی دونوں ممالک کے لئے نفع بخش ہے۔

ایک طرف میرا شنکر کی یہ خوش فہمیاں اور دوسری جانب خود ان کے ساتھ امریکی حفاظتی دستوں کی جانب سے روا رکھا جانے والا سلوک، ان دونوں کے درمیان کوئی مطابقت نظر نہیں

آتی۔ تین ماہ قبل ماہ ستمبر میں انہیں مسافروں کی قطار سے الگ کرکے ان کی خاص جامہ تلاشی لی جاتی ہے جس پر وہ خاموشی اختیار کر لیتی ہیں اور کوئی خبر نہیں بنتی لیکن پھر گزشتہ ہفتے بدسلوکی کو دہرایا جاتا ہے۔ میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے کے باوجود انہیں دیگر مسافروں سے الگ کر لیا جاتا ہے تاکہ انکی مخصوص جامہ تلاشی لی جا سکے۔ وہ اپنے سفارتی کاغذات دکھلاتی ہیں اور سمجھاتی ہیں کہ بین الاقوامی ویانا کنونشن کے تحت سفارتکاروں کو تفتیش سے رعایت دی گئی ہے۔ لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وجہ دریافت کرنے پر بتلایا جاتا ہے چونکہ انہوں نے ساڑی پہن رکھی ہے اس لئے یہ امتیازی سلوک ان سے کیا جا رہا ہے۔ معروف سابق سفارتکار بھدر اکمار نے اس اہانت آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہندوستانی سفارتکاروں کو امریکہ میں ڈیزائنر انڈرویئر (جانگیہ) پہن کر فیشن پریڈ کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئے بشرطیکہ اس ابھرتی ہو عالمی طاقت کا عزت و وقار اس کی اجازت مرحمت فرمادے۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں راجستھان کے اندر میرابائی نام کی ایک شاعرہ پیدا ہوئی وہ کرشن کی بھکت تھی اسے لوگ رادھا کا پونر جنم بھی کہتے ہیں جو کرشن کی معشوقہ تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ میرابائی کرشن کے بھجن گاتی اور مندر میں رقص کرتی تو اس کے سسرال والے اسے معتوب کرتے اور کرشن کنھیا اس کی مدد کرتے بالآخر وہ تلسی داس کے کہنے پر اپنا گھر سنسار تیاگ کر کرشن جنم استھان متھرا چلی آئی اور بعد میں کرشن کی جائے وفات دوارکا سفر کیا اور وہاں فوت ہوئی۔ یہ مغلیہ دور کی میرا کا حال تھا لیکن یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جمہوری دور کی میرا شنکر بھی بھارت ماتا کی بھکتی میں امریکہ کے اندر عتاب کا شکار ہے اور اسے بھی مدد کے لئے وزیر خارجہ کرشنا سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کرشنا یقیناً مدد کے لئے آگے آئے اور اپنے دفتر کے ذریعہ جواب طلب کیا جواب میں ہوم لینڈ سکریٹری جانیٹ ناپولیٹانو نے کہا انہوں اس معاملہ کو دیکھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں پائی۔ انہوں نے کہا امریکہ میں سفیروں کو بھی انہیں بنیادی حفاظتی طریقہ کار سے گزرنا ہوتا ہو جو دیگر مسافروں کے لئے ہیں۔ جامہ تلاشی بھی ہماری حکمتِ عملی کا حصہ ہے جو ان حالات میں ناگزیر ہے۔ جانیٹ کے خیال میں محافظ افسر نے جو کچھ کیا وہ قاعدے کے مطابق تھا۔ اس طرح امریکہ کی وزارتِ داخلہ نے ہند امریکی دوستی اور اعتماد کو جس پر میرا شنکر کو بڑا ناز تھا چار چاند لگا دیئے۔ اس رویہ پر حزب اختلاف نے شور مچایا اور اسے حکومت کی نااہلی قرار دیا تو خود وزیر خارجہ طیش میں آگئے اور انہوں نے کہا اس ناروا سلوک کو برداشت نہیں کیا جائیگا وہ اپنے ہم منصب سے مناسب موقع پر اس بارے میں استفسار کریں گے۔

ان کی ہم منصب ہیلری کلنٹن نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس معاملے کو دیکھیں گی۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ صرف دیکھیں گی کچھ کریں گی نہیں۔ اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ میرا کے ساتھ کئے گئے اہانت آمیز سلوک کا چرچا ابھی سرد نہیں ہوا تھا کہ امریکیوں نے اقوام متحدہ میں ہندوستان کے مستقل نمائندے ہردیپ پوری کی پگڑی اچھال دی۔ ہردیپ کو جب تلاشی کے لئے پگڑی اتارنے کا حکم دیا گیا تو اس بیچارے نے بھی اپنے سفارتی کاغذات دکھلائے لیکن امریکیوں کے نزدیک وہ ٹائلیٹ پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اس لئے انہیں نصف گھنٹہ تک حراست میں رکھا گیا اور پھر تلاشی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اس صورتحال کو دیکھ کر میرا بائی کا شعر یاد آتا ہے۔

آؤ سہیلیاں رلی کراں ہے، پر گھر گاوں نواری

جھوٹا مانک موتیا، ری۔ جھوٹی جگ مگ جیوتی

ہندوستان اور امریکہ کے درمیان بہترین تعلقات کے باوجود بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا امریکہ کو ہندوستان سے دوستی مطلوب نہیں ہے؟ کیا وہ اس کی اہمیت و افادیت نہیں سمجھتا؟ جی نہیں ایسا نہیں ہے۔ امریکہ ہندوستانیوں کے مزاج سے واقف ہے اُسے پتہ ہے کہ ہمارے رہنما زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ وہ انکا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ ان سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے کہ باوجود تمام تر قومی ذہانت اور زور بازو کے دولت کے حریص ان بدعنوان رہنماوں کے پاس ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔ یہ امریکہ کے آگے سینہ تان کر سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتے جیسا کہ چین و ایران کے رہنما کرتے ہیں۔ یہ قنوطیت نہیں بلکہ حقیقت ہے ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ملک کے وزیر دفاع اور قومی جمہوری محاذ کے صدر جارج فرنانڈیس کی امریکی ہوائی اڈوں پر جامہ تلاشی لی گئی جس کا اعتراف خود انہوں نے کیا۔ اسی طرح موجودہ وزیر دفاع پرنب مکرجی کو بھی واپسی میں ماسکو ہوائی اڈے پر تفتیش کی ہزیمت اٹھانی پڑی، اس دورے کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ان کے ہم منصب نے ملاقات کا وقت دے کر اسے منسوخ کر دیا تھا اور صدر پوتین نے وقت دینے سے معذرت کر دی تھی وجہ بھی دلچسپ تھی ایک امریکی خارجہ سکریٹری کونڈی کے استقبال کی تیاری میں مصروف تھا تو دوسرا ایران کا دورہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اور تو اور خود سرزمین ہند پر شہر دہلی میں کونٹی نینٹل ایرلائنز کے محافظوں نے سابق صدر عبدالکلام کو روک کر ان کے جوتے اتروا لئے تا کہ تلاشی لی جا سکے۔ صدر کے ساتھ موجود سی آئی ایس ایف کے جوان نے انہیں مطلع کیا کہ ہندوستان کے قانون کے مطابق سابق

صدر مملکت کو تلاشی سے مبرا کیا گیا ہے لیکن ایئر لائنز والوں نے ہماری سرزمین پر بھی اپنے ملک کا قانون چلایا۔ بعد میں اس پر خوب ہنگامہ ہوا، ہوابازی کے وزیر پرفل پٹیل نے ایف آئی آر بھی لکھوائی لیکن ''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا'' یہ کہہ کر خود عبدالکلام نے معاملہ ٹائیں ٹائیں فش کر دیا۔ ہم بھولے بھالے ہندوستانی تو اسے بھول بھال گئے لیکن امریکی نہیں بھولے ان لوگوں نے خود پرفل پٹیل کو امریکی ہوائی اڈے پر یہ کہہ کر بٹھالیا کہ ان کا نام اور تاریخ پیدائش ایک ایسے شخص سے مشابہ ہے جو انہیں مطلوب ہے۔ اس پر بھی ہماری جانب سے کوئی خاطر خواہ ردعمل سامنے نہیں آیا۔ سابق سفیر رونن سین کا کہنا ہے کہ اس طرح کی بدسلوکی امریکہ میں عام سی بات ہے ان کے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے بلکہ ایک مرتبہ تو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسر کی موجودگی میں بھی ان کی تلاشی لی گئی تھی۔ رونن کے مطابق اس کا علاج یہی ہے کہ امریکی عہدیداروں کو بھی ہندوستان میں تلاشی کے عمل سے گزارا جائے۔ کمیونسٹ پارٹی نے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے مگر دہلی نہ سہی تو کم از کم کولکتہ کے ہوائی اڈے پر بھی کیا اس پر عمل درآمد ہو گا؟ شاید نہیں اس لئے کہ جہاں سفید جلد کی غلامی کے اثرات ابھی باقی ہیں وہاں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

امریکہ کے اندر تفتیش کو محض سفارتی یا سیاسی زاویہ سے دیکھنے کے بجائے انسانی اور معاشی زاویہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد دہشت گردی امریکہ میں ایک بہت بڑی صنعت اور کاروبار بن گئی ہے۔ لوگوں کو ڈرانے کے لئے آئے دن نت نئی کہانیاں گھڑی جاتی ہیں اور سخت سے سخت قوانین وضع کر دیئے جاتے ہیں تاکہ شہریوں کی انفرادی آزادی پر شب خون مارا جائے یا جدید ترین مشینوں کا اقتصادی بوجھ سرکاری خزانے پر ڈالا جائے۔ مثلاً چند سال قبل رابرٹ ریڈ نامی ایک شخص نے جوتے میں بم لے جانے کی کوشش کی اس کے بعد سے جوتے اتروائے جانے لگے۔ اس کے بعد مائع بم کی کہانی سامنے آئی دوائیاں اور دیگر مائع مصنوعات پر روک لگادی گئی اس کے بعد کسی مسخرے نے انڈرویر میں دھماکہ خیز اشیا لے جانے کی کوشش کی تو سارے جسم کی اسکیننگ کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس سال کے اواخر تک ۵۰۰ ہوائی اڈوں پر باڈی اسکیننگ مشین لگوانے کا منصوبہ زیر عمل ہے۔ اس پر لاکھوں ڈالر خرچ ہوں گے اور اس کی رشوت سیاستدانوں کی جیب میں چلی جائیگی۔ ایسے میں جبکہ امریکہ اپنی تاریخ کے سب سے بھیانک معاشی بحران کا شکار ہے عوام بیروزگار ہو رہے ہیں سیاستدانوں کی یہ لوٹ پاٹ قابل شرم ہے لیکن جن لوگوں کا لاج شرم سے کوئی واسطہ ہوتا ہے وہ بھلا امریکی سیاست میں آتے کب ہیں؟ تحفظ تو درکنار یہ مشینیں بے حیائی کے فروغ کا ذریعہ بن رہی

ہیں جن میں مسافر کے عریاں خطوط سامنے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ظلم ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کسی کے کپڑوں میں جھانک کر دیکھنے کا اختیار پہلی مرتبہ قانون کی مدد سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ ان مشینوں میں سے گزرنے کے لئے حکم دینے کا اختیار ڈیوٹی پر موجود افسر کے پاس ہوتا ہے۔ ویسے مسافر انکار کر سکتے ہیں لیکن پھر اسے خصوصی جامہ تلاشی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا ہوتا ہے اور جس طرح کے کرب سے اسے گزرنا پڑتا ہے اس کی دو مثالیں حاضر خدمت ہیں۔

پلے بوائے نامی فحش جریدے کی ماڈل اور بے واچ ٹی وی سیریل کی اداکارہ ڈونا ڈی ایریکو کو لاس اینجلس ایئر پورٹ پر مسافروں کی قطار سے الگ کر کے اسکیننگ مشین سے گزرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے دوسروں کو چھوڑ کر اسے منتخب کرنے کی وجہ دریافت کی جواب میں محافظ افسر بولا تم میری آنکھوں کو بھا گئیں دوسرے نہیں۔ اس طنزیہ جملے سے اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ خواتین کے ساتھ کیسا اہانت آمیز سلوک کیا جا رہا ہے، خیال رہے ڈونا اپنے ۷ سالہ بیٹے کے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ دوسری مثال سان ڈیاگو ہوائی اڈے سے سفر کرنے والے جان ٹائنر کی ہے جس نے اسکینر میں جانے سے انکار کیا تو اسے مخصوص جامہ تلاشی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا پڑا، اس میں افسران شرم گاہ کو بھی ٹٹول سکتے ہیں۔ جان ٹائنر نے افسر سے کہا کہ اگر اس نے پوشیدہ اعضا کو چھوا تو وہ اسے گرفتار کروا دے گا۔ لیکن چونکہ یہ ضروری تھا جان نے سفر کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ جان ٹائنر جب لوٹ رہا تھا۔ تو حفاظتی عملہ نے اسے آگاہ کیا کہ تفتیش سے انکار کے باعث اس پر ۱۱ ہزار ڈالر یعنی ساڑھے پانچ لاکھ روپئے جرمانہ لگ سکتا ہے۔ جان اس کی پرواہ کئے بغیر گھر لوٹ آیا۔ جان اور اس جیسے کئی مسافروں کا خیال ہے کہ حفاظتی عملے کا یہ طریقہ کار سراسر جنسی استحصال ہے۔ اور اس استحصال کا شکار غیر ملکیوں سے زیادہ خود امریکی ہوتے ہیں۔ زوگبی نام کے ایک ادارے نے گزشتہ دنوں اس مسئلہ پر سروے کر کے رائے عامہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا ۶۱ فی صد عوام فل باڈی اسکیننگ کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مشینوں کے لگنے کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہے اس لئے کہ جمہوریت میں انتخاب سے قبل تو رائے عامہ کی اہمیت ہوتی ہے بعد میں عوام کو کون پوچھتا ہے۔

جس طرح آپ لوگ بھول گئے کہ بات میرا شنکر سے شروع ہوئی تھی اسی طرح ذرائع ابلاغ بھی اس مسئلے کو بھول چکا ہے دگ وجے سنگھ نے اسے ہیمنت کرکرے کے فون میں الجھا دیا حزب اختلاف بھی میرا اور ہردیپ کو بھول کر دگ وجے کے پیچھے پڑ گیا، بی جے پی والوں نے اسے پاکستان اور قصاب کی بلاواسطہ مدد قرار دیا جبکہ راج ناتھ سنگھ تو بالواسطہ سادھوی پرگیا کی حمایت

کر چکے ہیں اسے قانونی واخلاقی امداد فراہم کررہے ہیں اڈوانی جی کو سادھوی کی سفارش کے لئے وزیراعظم کے پاس بھیجتے ہیں اور خود اس دہشت گرد سے ملنے جیل پہنچ جاتے ہیں حالانکہ بی جے پی کے مطابق دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ شیوسینا جو میرا شنکر کے معاملے میں تقریباً خاموش رہی اب دگوجئے کے بیان کو ہیمنت کرکرے کی اہانت قرار دے رہی ہے جبکہ دھمکی دینے والوں کی حامی ومددگار بنی ہوئی ہے۔ حکومت اور حزب اختلاف نے میرا اور امریکہ کو بھلا دیا اس لئے کہ ہمیں بہر صورت اقوام متحدہ کا مستقل ممبر بننا ہے صدر اوبامہ نے ہندوستانی پارلیمان میں ہمیں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کا گاجر دکھلا کر ہماری مشکلات میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ آئندہ دوسالوں کے اندر جس بلیک میلنگ سے ہمیں گزرنا ہے اس کی جانب جنوبی اور وسطی ایشیا کے لئے نامزد امریکی نائب سکریٹری رابرٹ او بلیک نے گزشتہ دنوں واشنگٹن میں اشارہ کیا۔ انہوں نے فرمایا آئندہ جنوری سے ہندوستان کی سلامتی کونسل میں عارضی ممبر کی حیثیت سے کارکردگی یہ طے کریگی کہ مستقل رکنیت کے لئے اس کی حمایت کی جائے یا نہیں؟ انہوں نے یاد دلایا کہ اس سے پہلے ہندوستان نے محض ۱۰ فی صد مواقع پر امریکہ کی حمایت کی ہے اور امید ظاہر کی آئندہ اس رویہ میں مثبت تبدیلی آئیگی اور اس تبدیلی کی اولین ضرورت یہ ہے کہ عوام کو گھریلو سیاست کے بکھیڑوں میں الجھائے رکھا جائے۔ ہندی سیاستدانوں پر فی الحال معمولی سی ترمیم (کرشنا کے بجائے امریکہ) کے ساتھ میرابائی کا بھجن صادق آتا ہے۔

جو تم چھوڑو پیا ، میں نہیں چھوڑوں رے<br>
توسے پریت جوڑی امریکہ، کون سنگ جوڑوں رے

# زعفرانی سیاست

# شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

نتیش کمار ۲۰۰۵ء میں جب پہلی بار بی جے پی کی مدد سے وزیر اعلیٰ بنے تو اس وقت مسلم مجلس مشاورت کے صدر جناب سید شہاب الدین نے انہیں مبارکباد کے پیغام میں اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بہار کو ترقی کی راہ پر لے جائیں گے۔ انتخابی نتائج اس بات کے غماز ہیں کہ عوام تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔ عوام نے ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف اور سیکولرزم کے حق میں ووٹ دیا ہے جو ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ سید شہاب الدین کے اس بیان کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو بہار میں ترقی، سماجی انصاف، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیکولرزم کے حوالے سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ چونکا دینے والی ہیں۔ پہلی تبدیلی اور ترقی تو یہ ہوئی کہ شہاب الدین صاحب کی دختر نیک اختر محترمہ پروین امان اللہ وزیر سماجی فلاح و بہبود بن گئیں۔ یہ غیر معمولی تبدیلی اس معنی میں بھی ہے کہ سید شہاب الدین نے بی جے پی کے خلاف بابری مسجد تحریک کی قیادت کی تھی اور بی جے پی نتیش کمار کی حکومت میں حصہ دار ہے اور تو اور پروین کے خاوند افضل امان اللہ نے ہوم سکریٹری کی حیثیت سے ایل کے اڈوانی کی گرفتاری کے سارے انتظامات کئے تھے اور انہوں نے ہی گورنر کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی اہلیہ کو حلف برداری کے لئے اسٹیج پر بلانے کی ذمہ داری بھی ادا کی۔

پروین امان اللہ کی وزارت نے نہ صرف سماجی فلاح و بہبود کو یقینی بنادیا بلکہ سیکولرزم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روایت کو بھی زندہ کردیا اس کے علاوہ کئی اور مظاہر بھی سامنے آئے۔ گزشتہ سال جب دوسری مرتبہ نتیش کمار کامیاب ہوئے تو مسلم ممبران اسمبلی کی تعداد ۱۵ سے بڑھ کر ۱۹ ہوگئی۔ پہلی بار بی جے پی کے ٹکٹ پر ایک مسلمان کامیاب ہوگیا پچیس سالوں سے اسمبلی مسلم خاتون کی موجودگی

سے محروم تھی۔ اس مرتبہ پہلی بار دو مسلم خواتین پہنچ گئیں اور کانگریس کے چار میں سے تین امیدوار اور ایل جے پی کے تین میں سے دو ممبران اسمبلی مسلمان تھے۔ گویا دو سیاسی جماعتوں کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی ایسے میں نتیش کمار نے مسلمانوں پر ایک اور احسان کر ڈالا جو عامر سبحانی کو پرنسپل سکریٹری (ہوم) نامزد کر دیا۔ اب جبکہ مسلمانوں کی ساری مرادیں اس جمہوری نظام نے پوری کر دیں تو اچانک فوربس گنج کی گولی باری کا واقعہ رونما ہو گیا جس نے اس مصنوعی لیپا پوتی کی قلعی کھول کر رکھ دی اور تلخ حقائق جنہیں خوبصورت شال میں لپیٹ کر خوشنما بنا دیا گیا تھا بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو گیا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ فوربس گنج کے واقعہ سے تین دن قبل گوپال گنج میں ایک اور واردات رونما ہو گئی جس نے مسلمانوں کے تئیں حکومت کے امتیازی سلوک کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ رنجن یادو نام کا ایک قیدی مختلف سنگین الزامات کے تحت گوپال گنج کی جیل میں عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے اس نے ڈاکٹر بھودیو سنگھ سے اپنی سنٹرل جیل میں منتقلی کی خاطر جعلی بیماری کا سرٹیفکٹ مانگا جسے انہوں نے دینے سے انکار کر دیا تو اس نے بیماری کے بہانے سے انہیں اپنے پاس بلایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملہ کر کے زخمی کر دیا بعد میں پٹنہ کے ہسپتال لے جاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ پر قومی انسانی حقوق کے کمیشن نے سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ریاست کے چیف سکریٹری سے دو ہفتہ کے اندر جواب طلب کیا لیکن فوربس گنج میں مارے جانے والے ۶ لوگوں کے حوالے سے حقوق انسانی کمیشن کے کان پر ابھی تک جوں نہیں رینگی۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے بھودیو کے قتل پر سخت کارروائی کرتے ہوئے جوڈیشیل انکوائری کا اعلان کیا اور سی بی آئی جانچ کا مطالبہ کر ڈالا لیکن فوربس گنج کے معاملے میں صرف عدالتی تفتیش کی خاطر عدالت سے جج نامزد کرنے کی گذارش کر کے خاموش ہو گئے۔ ان مظلوموں کی مزاج پرسی کے لئے متاثرہ علاقے کا دورہ تو درکنار ہمدردی کے دو بول ان کے منہ سے نہیں پھوٹے۔ گوپال گنج کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پنکج کمار پال اور اور انسپکٹر جنرل (جیل) رمیش لال کا تبادلہ کر دیا گیا اور سپرنٹنڈنٹ پولس کو نوٹس دیا گیا حالانکہ ان سب کا براہ راست قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے برخلاف فوربس گنج میں جن پولس افسران کے احکامات سے ان کی موجودگی میں گولی باری ہوئی ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا بلکہ ہوم گارڈ کے ایک سپاہی کو معطل کیا گیا اور کہا جا رہا ہے کہ حقائق کا پتہ لگانے کے بعد کارروائی ہو گی جبکہ مقامی ٹی وی چینلس پر پولس کے مظالم کی فلم بھی دکھلائی جا چکی ہے اور

سارے ثبوت پیش کئے جا چکے ہیں گویا بقول شاعر ؎

شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

ڈاکٹر بھودیو کے سات قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر تو داخل ہوگئی لیکن فوربس گنج قاتلوں کو سزا دینے کا کوئی اہتمام سرکار کی جانب سے نہیں کیا گیا بلکہ اراریہ کی ایس پی گریما ملک نے نہایت بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مجرمانہ کارروائی کو جائز قرار دیتے ہوئے مظاہرین پر اسلحہ کے ذریعہ پولس پر حملہ کرنے کا جھوٹا الزام جڑ دیا اسکے باوجود کسی نے ان کی سرزنش نہیں کی یہ نہایت افسوسناک ہے جبکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا انہیں اس ظلم وزیادتی کے لئے ذمہ دار قرار دے کر معطل کردیا جاتا۔ اس کے باوجود سابقہ مرکزی وزیر تسلیم الدین جواب یوٹرن لے کر جنتا دل (یو) میں آ گئے ہیں فرماتے ہیں کہ نتیش کمار اچھا آدمی ہے یہ فرقہ پرستوں کی سازش ہے حالانکہ یہ پولس کی سفاکیت ہے جس کی بلاواسطہ ذمہ داری وزیر اعلیٰ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وزیر اعلیٰ فرقہ پرستوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے ڈاکٹر بھودیو کے لواحقین کی خاطر دس لاکھ روپے کی امداد اور ان کے ریٹائر منٹ کی مدت تک ان کی بیوہ کو پوری تنخواہ جاری رکھنے کی ہدایات جاری کیں نیز گھر کے ایک فرد کو ملازمت کی بھی یقین دہانی کروائی لیکن فوربس گنج کے معاوضے کے بارے میں پہلے تو یہ کہا گیا کہ ان کے لئے سرکاری امداد کا فیصلہ تحقیقات کے بعد ہوگا اور پھر مرنے والے ایک بچے کے والدین کو صرف تین لاکھ روپے تھما دیئے گئے بقیہ لوگوں کو حکومت اور میڈیا شر پسند قرار دے کر ان کی امداد سے آنا کانی کررہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جونہی انہیں مظلوم تسلیم کرلیا جائے گا پولس اپنے آپ ظالم قرار پائے گی اور اس پولس فورس کی دل آزاری سیاستداں کیسے کرسکتے ہیں جس کے بل بوتے وہ اس ظالمانہ نظام کو چلا رہے ہیں۔

اراریہ کا رکن پارلیمان بی جے پی سے تعلق رکھتا ہے اس پارلیمانی حلقے میں ۶ ممبران اسمبلی ہیں جن میں سے چار کا تعلق بی جے پی سے ہے اور باقی دو مسلمان ہیں جو جنتا دل (یو) اور ایل جے پی کے ممبر ہیں ان میں سے ایک ذاکر انور نے اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اس بات کا پتہ لگایا جانا چاہئے کہ آخر گاؤں والوں کو مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کا مسئلہ پہلے حل کیوں نہیں کیا گیا؟ پولس نے براہ راست گولی باری کیوں کی؟ اور ان لوگوں نے عورتوں اور بچوں تک

پر رحم نہیں کیا بلکہ ایک زخمی نوجوان کو سڑک پر پیٹ پیٹ کر کیوں ہلاک کر دیا؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عوام کا یہ نمائندہ ان سوالات کو کرنے کے بجائے ان کے جواب دیتا اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا لیکن انتخاب جیتنے کے بعد انہیں اپنے ذاتی مسائل حل کرنے سے فرصت ملے تو یہ عوام کی جانب توجہ دیں۔ ویسے ان سوالات کے جوابات سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے اس لئے تحقیق و تفتیش میں اسے الجھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ فوربس گنج کے گاؤں بھجن پور اور رانی گنج کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور پھر ان کی اکثریت غریب مزدور ہے۔ یہ دو وجوہات ہی ان پر ہر طرح کا ظلم و زیادتی روا رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ایسے میں اگر وہ احتجاج کرنے کی جرأت کر ڈالیں اس لئے کہ فیکٹری کی اس دیوار سے ان کا بازار، ہسپتال اور قریب کے بڑے گاؤں میں جانے کا راستہ بند ہو جاتا ہے تب تو وہ گناہ کبیرہ ہے نیز یہ احتجاج بھی حکمراں جماعت بی جے پی کے ایم ایل سی کی فیکٹری کے خلاف ہو تب تو وہ کسی رحم کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔ اور یہی ہوا۔ بہار کی سرکار نے ۲۸ ایکڑ زمین کا ایک قطعہ جو کبھی مسلمانوں کی ملکیت تھی لیکن ان لوگوں نے بھودان تحریک کے دوران سرکار کو خیرات کر دیا تھا سوربھ اگروال کو جو ایم ایل سی اشوک کمار اگروال کے بیٹے ہیں کو اسٹارچ کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے دان کر دیا۔ اس کارخانے کے باعث آنے جانے کا راستہ بند ہو گیا تو گاؤں والوں نے احتجاج کیا۔

اس مسئلے کو نمٹانے اور ان پر دباؤ ڈالنے کی خاطر خود نائب وزیر اعلیٰ سشیل کمار مودی نے زحمت کی اور یہ طے ہو گیا متبادل راستہ مہیا کیا جائیگا لیکن اگروال صاحبان اس راستے کی فراہمی تک صبر نہ کر سکے اور راتوں رات دیوار تعمیر کر کے راستے کو بند کر دیا جس سے فطری طور پر عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور ان لوگوں نے دیوار کے ایک حصے کو توڑ کر اپنا راستہ صاف کر لیا پولس نے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو اس کی گاڑی جلا دی پھر کیا تھا سیاستدانوں اور پولس والوں نے مل کر غریب عوام پر قہر برسانا شروع کر دیا ان پر نہایت قریب سے کمر کے اوپر گولی باری کی گئی اور زخمی ہو کر گرنے والے مصطفیٰ اور شازمین کو ہسپتال لے جانے کے بجائے ان کے سینے پر چڑھ کر ان کی موت کو یقینی بنایا گیا یہ سب ویڈیو میں موجود ہے اس بہیمیت کا نشانہ نہ صرف ایک حاملہ عورت بلکہ ایک معصوم بچہ بھی بنا۔ اس طرح گویا بہار کی صنعتی ترقی کا راستہ ہموار کیا گیا۔

ایک طرف غریب عوام کا سڑکوں پر خون بہایا جا رہا ہے دوسری طرف ریاست کی جدید صنعتی پالیسی کا اعلان ہوتا ہے۔ ریاستی صنعتی ترقی کے افسران کو خون ناحق کے بجائے اس بات کی فکر ستائے

جارہی ہے اس طرح کے واقعات سے ریاست میں ہونے والی بیرونی سرمایہ کاری پر برا اثر پڑے گا۔عامر سبحانی صاحب نے انتباہ کیا کہ ہر قیمت امن وقانون کو برقرار رکھا جائیگا اور مجرمین کو ریاست کی صنعتی ترقی کے ماحول کو برقرار رکھنے کے پیش نظر بخشا نہ جائیگا۔ ہوم سکریٹری کے اس بیان میں مجرم کون ہے؟ یہ سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جولوگ یہ خیال کرتے ہیں مسلمانوں کے سرکاری اعلی عہدوں پر فائز ہوجانے سے ان کے مسائل حل ہوجائیں گے ان کے لئے سبحانی صاحب کی دھمکی تازیانہ عبرت ہے۔ایسوں کے ہوتے امت کی تباہی کے لئے سنگھ پریوار کو کسی محنت ومشقت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کانگریس نے اس واقعہ کے لئے وزیراعلی کے استعفی کا مطالبہ کیا لیکن نتیش کمار اس کی پرواہ کئے بغیر چین سے صنعتی ترقی کے مزید سبق (اسباق) سیکھنے کے لئے غیر ملکی دورے پر روانہ ہوگئے۔ چین میں انہیں کچھ اور ملے یا نہ ملے مگر عوام کے احتجاج کو کچلنے اور ان کا استحصال کر کے معاشی ترقی کرنے کا بہت سارا درس ضرور مل جائے گا۔

اس واقعہ پر جہاں کانگریس پارٹی نے بیس لاکھ معاوضہ کا مطالبہ کیا وہیں آر جے ڈی کے ریاستی صدر رام چندر نے کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاستی حکومت کا پولس فورس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہا ہے حالانکہ یہ بات غلط ہے اس لئے کہ پولس فورس نے یہ سارا کھیل حکومت کے اشارے پر اس کی خوشنودی کی خاطر کھیلا ہے اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ ٦ ماہ قبل ٢٢ دسمبر کو بی ایس ایف کے جوانوں نے یہاں سے ١٧ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بترابا گاؤں کی خاتون کے ساتھ بدسلوکی کی جس کی شکایت کرنے کے لئے گاؤں والے ان کے کیمپ میں جا پہنچے وہ بیچارے اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ وہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں لیکن فورس کے جوانوں نے ان پر فائرنگ کر کے چار لوگوں کو ہلاک کر دیا جو سب کے سب مسلمان تھے اور ان احتجاج کرنے والوں کی یہ غلط فہمی دور کردی کہ وہ بھی اس ملک کے آزاد شہری ہیں۔ پولس والوں نے ان غریبوں کو اسمگلر قرار دے دیا حالانکہ اسمگلر شکایت واحتجاج کرنے کے لئے نہیں آتے اور جب سودے بازی کے لئے وہ سرحدی حفاظتی دستے کے پاس آتے ہیں تو ان پر پھولوں کی بارش کی جاتی ہے ان پر گولیاں نہیں برسائی جاتیں اسی بات کو انہاد کی شبنم ہاشمی نے بھی کہا جو اقلیتی کمیشن کی ممبر بھی ہیں کہ اگر یہ احتجاجی مسلمان نہ ہوتے تو پولس اس طرح کے انتہائی اقدام سے گریز کرتی اس سے آگے بڑھ کر مہیش بھٹ نے یہ سوال کردیا کہ کیا وزیر اعلی بہار کو دوسرا گجرات بنانا چاہتے ہیں؟ نتیش کمار ہمیشہ انتخاب سے قبل نریندر مودی کو اپنی مہم سے دور رکھ کر مسلمانوں کو رجھاتے ہیں لیکن انتخاب کے بعد سشیل مودی کو نائب

وزیر اعلیٰ بنادیتے ہیں اور مودی تو مودی ہوتا ہے اسکے نریندر یا سشیل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مسلمانوں پر ہونے والے اس بہیمانہ ظلم کے خلاف مختلف ملی جماعتوں کے رہنماؤں نے اپنا احتجاج درج کیا لیکن جماعت اسلامی کے ایک وفد نے جائے حادثہ کا دورہ بھی کیا اتفاق سے جماعت اسلامی کی بہار شاخ کے امیر جناب نعیم الزماں ارار یہ کے رہنے والے ہیں۔ نعیم الزماں صاحب نے انتظامیہ کے اس الزام کو بالکل بے بنیاد قرار دیا کہ مظاہرین اسلحہ سے لیس تھے اور کہا کہ یہ غریبوں اور مزدوروں کی بستی ہے وہ لوگ اسلحہ نہیں خرید سکتے اسی کے ساتھ انہوں نے کہا اگر حکومت مسلمانوں کے مطالبات کو قبول نہیں کرتی اور ظالموں کو سزا دینے میں ٹال مٹول کرتی ہے تو جماعت کی جانب سے ارار یہ کے ہر بلاک میں دھرنا دیا جائیگا اور چکا جام کر دیا جائے گا یہ ایک نہایت خوش آئند اعلان ہے اس لئے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان بیان بازی سے آگے بڑھ کر سڑکوں پر اتریں لیکن ایسا لگتا ہے یہ معاملہ صرف ارار یہ ضلع تک محدود نہیں رہے گا۔ اتر پردیش کے لکھیم پور کھیری میں ۱۴ سالہ نابالغ صنم کا پولس کے ذریعہ اغواء، عصمت دری، قتل اور پھر اس کے بعد پولس اسٹیشن کے احاطے میں اس کی لاش کو پھانسی پر لٹکا دیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ انتظامیہ کی درندگی نے سارے حدود و قیود کو پھلانگ دیا ہے اور یہ واقعہ ایک ایسی ریاست میں رونما ہوا ہے جہاں فی الحال بی جے پی چوتھے نمبر پر ہے اس لئے محض فرقہ پرستی اور فسطائیت کا نام لیکر اس سے دامن جھٹکنا بھی ممکن نہیں ہے۔

چوکیدار انتظار علی کی بیٹی صنم جمعہ کے دن مویشی چرانے کے لئے باہر گئی تو واپس نہیں آئی۔ اس کی ماں نے اپنی بیٹی کو تلاش کیا تو دوسرے دن اس کی لاش پولس تھانے کے احاطے میں پیڑ سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔ پولس کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی کرلی ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف قتل کے سارے ثبوت مٹا دیئے بلکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اپنے حق میں حاصل کرلی جس کے مطابق موت پھانسی کے لگنے سے ہوئی تھی لیکن لڑکی کے والدین اس کا انکار کرتے رہے یہاں تک کہ فورنسک لیباریٹری کی رپورٹ نے یہ راز افشا کر دیا کہ موت گلا گھونٹنے کے سبب ہوئی تھی۔ مایاوتی نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے پولس تھانے کے ۱۱ اہلکاروں کو معطل کر دیا لیکن کیا ان مجرمین کو قرار واقعی سزا ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہاں سے زیادہ نہیں میں ہے اس لئے کہ جب کسی سرکاری مجرم کو سزا دینے کی نوبت آتی ہے تو انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ یہ تینوں شیر اشوک چکر کے نشان کی مانند ایک جان ایک قالب ہو جاتے ہیں اور انصاف کا خون کر دیتے ہیں۔ اس طرح کا ظلم تو اسی وقت رک سکتا جب اس کے مجرم پولس افسران کو سرعام اسی پیڑ سے پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور دنیا بھر کے

ٹیلی ویژن چینل سے یہ منظر براہِ راست نشر کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو نام نہاد مہذب دنیا کے لوگ اسے وحشیانہ اقدام قرار دیں گے لیکن کوئی معصوم صنم کی ماں ترنم بیگم سے پوچھے تو وہ کہے گی کہ یہ سزا بہت کم ہے۔ ایسا لگتا ہے فیض نے یہ اشعار پھول سی معصوم صنم کی مظلومیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے کہے تھے۔

جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

# ببول کی شاخ پر گلاب کا پھول

(قسط اول)

سوامی اسیمانند کا اصلی نام نابا کمار ہے۔ یہ شخص مغربی بنگال کے کامار پکار نامی گاؤں میں پیدا ہوا اور طالب علمی ہی کے زمانے میں آر ایس ایس کی پکار پر لبیک کہہ کر اس میں شامل ہو گیا۔ کالج کے زمانے میں جب نابا ایم ایس سی کی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر بردمان آیا تو سنگھ کے حوالے اس کی دلچسپیوں میں خاصہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے آتے آتے نابا کمار آر ایس ایس کا ہمہ وقتی کارکن بن چکا تھا اور ضلع پرولیا کے قبائلی علاقوں میں سنگھ پریوار کی ایک ذیلی تنظیم وسنواسی کلیان آشرم کے لئے کام کرنے لگا تھا۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۳ء تک نابا کمار انڈمان نکوبار میں ونواسی آشرم کی خدمت میں لگا رہا۔ اس کے بعد سارے ملک کا دورہ کر کے ادیواسیوں کے درمیان ہندو دھرم کا پرچار کرتا ہوا گجرات کے ڈانگ ضلع میں پہونچا اور شبری آشرم قائم کر کے وہیں بس گیا۔ سنگھ پریوار کے ساتھ اس کے سفر میں ایک سہانا موڑ اس وقت آیا جب اس کے گرو پرم آنند نے اسے اسیم آنند کے خطاب سے نوازہ۔ پرم آنند کے معنیٰ اولین مسرت کے ہوتے ہیں اور اسیم آنند بے انتہا سرور کو کہتے ہیں ۔ یقیناً عرصۂ دراز تک نابا کمار نے سنگھ پریوار کو بے شمار خوشیوں سے نوازہ لیکن فی الحال یہ ان کے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے اور مسلمانوں کو خوش کر رہا ہے۔ دہلی کی تیس ہزاری کورٹ میں اسکے اقبالیہ بیان سے اس نے زبردست تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اسیم آنند نے مالیگاؤں، حیدرآباد اور اجمیر سمیت سمجھوتا ایکسپریس کے دھماکے میں اپنے ملوث ہونے کو تسلیم کر کے سنگھ پریوار کی نیند حرام کر دی ہے۔

سنگھ پریوار فی الحال اس قدر حواس باختہ ہے کہ طرح طرح کے متضاد بیانات دینے لگا ہے۔ سنگھل کے مطابق اسیم آنند نے سرے سے کوئی بیان ہی نہیں دیا یہ سب ذرائع ابلاغ کی جانب سے

اڑائی جانے والی افواہیں ہیں۔اس طرح کا بچکانہ بیان دینے کی جرأت اشوک سنگھل کے علاوہ اور کون کرسکتا ہے؟سنگھل جی جانتے ہیں کہ ان کے حاری حواریوں کی عقل ماؤف ہوچکی ہے اس لئے وہ ان کی ہر بے سر پیر کی منطق کو بلاچوں چرا قبول کرلیں گے۔بی جے پی کا ترجمان کبھی تو کہتا ہے کہ کانگریس حکومت سمجھوتا ایکسپریس بم دھماکے کا الزام ہندوستانیوں کے سرڈال کر پاکستان کی مدد کر رہی ہے اور دہشت گردی کے خلاف اپنی مہم کو کمزور کررہی ہے گویا کہ اصل دہشت گردوں کو چھپانا اور بچانا نیز معصوم لوگوں کو بے بنیاد الزامات کے تحت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس کر پاکستان کے نام کی مالا جپتے رہنے سے دہشت گردی کے خلاف چھیڑی گئی مہم تیز ہوتی ہے۔اور کبھی روی شنکر پرساد فرماتے ہیں کہ یہ بدعنوانیوں کی جانب سے توجہ ہٹانے کی سازش ہے جس میں سنگھ کو بلی کا بکرہ بنایا جارہا ہے۔آر ایس ایس کے ترجمان رام مادھو کے مطابق یہ بیان سی بی آئی نے زبردستی لکھوایا ہے۔سنگھ رہنما یہ بھی کہتے ہیں کہ اسیم آنند کا سنگھ سے کوئی تعلق نہیں تھا حالانکہ سنگھ کے سرسنگھ چالک سے لیکر بی جے پی کے سارے بڑے رہنما اس کے آشرم پر حاضری لگا چکے ہیں۔کل کو آر ایس ایس والے یہ بھی کہہ دیں گے وتو اسی آشرم کا سنگھ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس جھوٹ کو دنیا کی ہر عدالت میں سچ ثابت کردیا جائیگا۔

اسیمانند کے مطابق اس نے چنچلگوڑا جیل میں عبدالکلیم نامی نوجوان کے اخلاق سے متاثر ہوکر کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن جو شخص اتنے سارے معصوموں کی ہلاکتوں سے متاثر نہیں ہوا۔سادھوی پرگیہ کی گرفتاری کے بعد عرصہ دراز تک روپوش رہا لیکن گرفتار ہونے کے بعد قلیل عرصہ میں اچانک معجزاتی طور پر اس کا قلب منقلب ہوگیا یہ تسلیم کرلینا مشکل لگتا ہے۔ممکن ہے اسیمانند وعدہ معاف گواہ بن گیا ہو اور کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہو۔اس نے اپنی ساری کہانی کا مرکزی کردار جس سنیل جوشی کو بنایا اسے ہلاک کیا جاچکا ہے۔اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اسے خود پریوار نے پرلوک سدھار(روانہ کر) دیا۔اسیم آنند کے مطابق اس کا کام سرمایہ مہیا کرنا تھا اور بم بنانے والے اور پھوڑنے والے اور لوگ تھے نیز ہر دھماکے کی اطلاع بعد میں دی گئی۔اس سے اسیمانند کا بلاواسطہ ملوث ہونا تو ثابت ہوتا ہے بلواسطہ نہیں۔ویسے بھی ہمارے ملک میں ہندو دہشت گردوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ان کے مقدمے کو خود انتظامیہ اس قدر کمزور کردیتا ہے کہ عدالت کے لئے کوئی سزا تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا۔عدالت کو بھی اس طرح کے مقدمات میں کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔بابری مسجد کے فیصلے ہندوستانی عدالتوں کی غیر جانبداری کی منہ بولتی تصویر پیش

کرتے ہیں۔ اسیمانند اس بات سے بھی واقف ہیں کہ وطن عزیز کا سیاسی نظام جن چار پیروں پر کھڑا ہوا ہے یعنی مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور جمہوریہ (عوام) ان سب کو ہندو دہشت گردوں کے خلاف اقدام کرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے وگرنہ اس ملک میں آڈوانی اور مودی جیسے لوگوں کا نام وزیر اعظم کے طور پر نہ اچھالا جاتا اور انہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدعنوانی کے الزامات سے پریشان منموہن سرکار کو اس معاملے سے خاصی راحت ملی ہے۔ ذرائع ابلاغ اسے خوب اچھال رہا ہے جس سے عوام کی توجہات بی جے پی اور سنگھ پریوار کی جانب مرکوز ہو رہی ہیں۔ گوہاٹی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے قومی اجلاس میں کانگریس پر شدید تنقید کا امکان تھا لیکن اس کے عین ایک دن پہلے اس راز کا فاش ہو جانا یقیناً کسی کے پردۂ زنگاری میں چھپے ہونے کی نشاندہی کرتا ہے خیر وجہ جو بھی ہو اس سے قطع نظر اگر ان دونوں شیطانوں کی آپسی سر پھٹول سے حقائق باہر آجاتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف پھیلائی گئی افواہوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو یقیناً یہ نہایت خوش آئند بات ہوگی۔ لیکن ساری اٹھا پٹخ کا ٹھوس فائدہ اسی وقت ہوگا جب ان دھماکوں کے جھوٹے الزامات میں گرفتار مسلم نوجوان رہا کر دیئے جائیں۔ جن پولس افسران نے انہیں گرفتار کیا انہیں اپنے کئے کی قرار واقعی سزا دی جائے نیز جن سیاستدانوں نے نام نہاد مسلم دہشت گردی کی آگ پر سیاسی روٹیاں سینکیں ان کا سیاسی مستقبل اسی تنور میں جھونک دیا جائے۔ جمہوری ہندوستان میں یہ معقول توقعات بھی نہ جانے کیوں خام خیالی محسوس ہوتی ہیں۔

ہیمنت کرکرے کی تفتیش سے لے کر اسیمانند کے اعتراف تک کے سفر کا ایک فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کا ہر مسلمان دہشت گرد نہ سہی ہر دہشت گرد مسلمان ضرور ہے۔ اب یہ بات جگ ظاہر ہوگئی ہے کہ ہندوستانی دہشت گردی میں پیش پیش مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں۔ وطن عزیز میں دہشت گردی کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک سرکاری اور دوسرے عوامی۔ سرکار کی باگ ڈور گذشتہ چند صدیوں سے مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے سرکاری دہشت گردی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سے تمام تر سرکاری دہشت گردی کا سہرہ ہندوؤں کے سر بندھتا ہے اس لئے کہ وہی حکومت کا کام کاج چلا رہے ہیں۔ سرکاری دہشت گردی کی ابتدا حیدرآباد کے خلاف پولس ایکشن سے ہوئی۔ ہندوستان میں برپا ہونے والے اکثر و بیشتر فرقہ وارانہ فسادات یا تو حکومت کی سرپرستی میں کرائے گئے یا کم از کم حکومت نے فسادیوں کو تحفظ فراہم کیا اس کی سب سے بڑی مثال دہلی میں سکھوں کا قتلِ عام اور گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔ زمانے کے ساتھ

حکومت نے بنا ٹنگ دہلی انکاؤنٹر اسپیشلسٹ کے نام سے ایک سرکاری مافیا کو بھی جنم دیا جنھیں قانون کو ہاتھ میں لے کر معصوم عوام کا خون بہانے کی اجازت دے دی گئی۔ انسل پلازہ کا واقعہ جس کا پردہ ایک ہندو وکیل نے فاش کیا اس کی ایک مثال تھا۔ جامعہ ملیہ میں معصوم طلبا کی شہادت کا خون ابھی خشک نہیں ہوا ہے۔ گجرات میں اے ٹی ایس کمشنر ونجارہ حوالات میں بند ہے اور جیمنت کرکرے کے قتل پر شکوک وشبہات کی دبیز چادر اسی ایک کڑی کے بکھرے ہوئے دانے ہیں۔ حکومت کی جانب سے عوامی احتجاج کو دبانے کی خاطر لال گڑھ میں جو کیا گیا وہ جگ ظاہر ہے۔ چھتیس گڑھ میں غریب عوام اپنے گھروں سے بزور قوت بے خانماں کیا گیا اور انہیں سرکاری کیمپوں میں رکھ کر نہ صرف عسکری تربیت دی گئی بلکہ اسلحہ سے لیس کر کے نکسلیوں کے خلاف سلوا جودوم کا نام دے کر اتارا گیا۔ ان حقائق کا راز فاش کرنے والے بین الاقوامی انعام یافتہ سماجی کارکن ڈاکٹر بنائک سین کو عمر قید کی سزا سے نواز دیا گیا یہ سب سرکاری دہشت گردی کا ایک حصہ ہے۔ مسلم نوجوانوں کے ساتھ کانگریس سے لے کر کمیونسٹوں تک نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

عوامی دہشت گردی یا عسکریت پسندی کی چار شاخیں ہیں۔ علیٰحدگی پسند تحریکیں ان میں کشمیر کے علاوہ سب کی سب ہندو عوام کی جانب سے چلائی جارہی ہیں۔ سکھوں کو بھی چونکہ سنگھ پریوار ہندو شمار کرتا ہے اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ پنجاب سے لے کر آسام تک اس طرح کی ساری علیٰحدگی پسند جماعتیں ہندو مذہب کے ماننے والے چلا رہے ہیں۔ قسم دوم نکسل وادی عسکریت پسندی ہے اس کو بھی چلانے والے مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہی ہیں اس کے حامیوں میں بھی سرفہرست ارون دھتی رائے اور ڈاکٹر سین جیسے ہندوؤں کا نام آتا ہے۔ اس کے بعد فسطائی دہشت گردی ہے تو اس کی ابتداء آزادی سے قبل تو اکھالی کے فسادات سے ہوگئی تھی اور اس کا سب سے عظیم مظہر مہا تما گاندھی کا قتل تھا۔ ناتھورام گوڈسے نام نہاد اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والا براہمن ہندو تھا۔ اس کا تعلق نہ صرف ہندو مہا سبھا سے تھا بلکہ وہ آر ایس ایس کا بھی ممبر رہ چکا تھا۔ دہلی جانے سے قبل وہ بنفس نفیس دامودر ساورکر کی خدمت میں آشیرواد لینے کی خاطر حاضر ہوا تھا اور ساورکر نے اسے "یشسوی بھوو" (کامیاب ہو کر لوٹو) کے دعائیہ کلمات کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ اندرا گاندھی کو قتل کرنے والا محافظ مسلمان نہیں تھا اور راجیو گاندھی کو بھی مارنے والی دھانو بھی ہندو ہی تھی اسے اس مہم پر روانہ کرنے والا پربھاکرن بھی مسلمان نہیں تھا۔ اسیما نند نے اگر کچھ ہندوؤں کے دہشت گردی میں ملوث ہونے کی خبر دے دی تو یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

مسلمانوں کا نام اس دہشت گردی میں پہلی بار ۱۹۹۲ء میں آیا یہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد کی بات ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد سورت میں نہ صرف فسادات ہوئے اور مسلم خواتین کی آبروریزی کی گئی اوراس کی فلمبندی کر کے اسے پھیلایا گیا۔ اس ویڈیو کا ردعمل ممبئی میں ماتھاڈی کامگاروں کے قتل کی صورت میں رونما ہوا جو یقیناً قابلِ مذمت حرکت تھی۔ مسلم قوم اوراس کے رہنما وں نے اس کی بھر پور مذمت کی اس کے باوجود مسلمانوں کو سبق سکھانے کی خاطر مرکزی وزیرِ دفاع شرد پوار، وزیرِ اعلیٰ سدھا کر نائک اور بال ٹھاکرے متحد ہو گئے اور سرکاری سرپرستی میں فسادات کرائے گئے جس میں تقریباً ایک ہزار افراد جاں بحق ہوئے جن میں بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس کے بعد ماہِ مارچ میں مسلمانوں کا ردعمل سامنے آیا اور ممبئی میں پے در پے دھماکے ہوئے جس میں تقریباً ساڑھے تین سو افراد ہلاک ہوئے۔ اس دھماکے کو کرنے والے اصل مجرم پولس کے ہتھے آج تک نہیں چڑھے لیکن حکومت معصوم لوگوں کو برسوں سے قید و بند میں رکھے ہوئے ہے۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً دس سال امن رہا اس لئے کہ سارے لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ ظلم کے ببول پر امن کا پھول نہیں کھلتا۔

۲۰۰۱ء میں مرکزی حکومت کی باگ ڈور بی جے پی کے ہاتھ میں تھی اور ہندوستان کے تعلقات امریکہ سے بہتری کی جانب مائل تھے کہ ۱۱ ستمبر کا حملہ ہو گیا اوراس کے بعد امریکہ بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بی جے پی نے اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا پر پابندی عائد کر دی۔ ۲۰۰۲ء میں دوبارہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے نریندر مودی نے فروری کے اندر گجرات فساد کروائے اور ستمبر میں اکشر دھام مندر پر حملہ کروا کر ہندو رائے دہندگان کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ اکشر دھام حملے کے لئے کشمیری مجاہدین کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیشو بھائی کی ناراضگی اور واگھیلا کی بغاوت بھی بی جے پی کا کچھ بگاڑ نہ سکی دسمبر کے مہینے میں مودی نے غیر معمولی انتخابی کامیابی درج کروائی اوراس کے بعد دھماکوں کے لامتناہی سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ ہر دو سال بعد جب ایس آئی ایم پر سے پابندی ختم ہونے کا وقت آتا دھماکے رونما ہو جاتے اور ایس آئی ایم کو ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا۔ اکشر دھام کے دھماکوں کے بعد ۲۰۰۴ء میں ممبئی میں گیٹ آف انڈیا کے دھماکے اسی لئے ہوئے اور ۲۰۰۶ء میں ممبئی ٹرین دھماکوں کے بعد انڈین مجاہدین کی کہانی اسی لئے گھڑی گئی۔ ۲۰۰۸ء کا ممبئی حملہ تاخیر سے ہوا تو اس بیچ ٹریبونل نے پابندی منسوخ کر دی جسے حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کر کے پھر لگوا دیا۔ وارانسی میں ہونے والے حالیہ دھماکے بھی اسی کی کڑی

ہیں۔ گویا بی جے پی کی پرمپرا کو کانگریس حکومت بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

کارگل کی جنگ اور پارلیمنٹ پر حملہ بی جے پی کی سیاسی ضرورت تھی اور اس لئے اس نے خود اس کا اہتمام کیا یہی وجہ ہے کہ پارلیمان پر حملہ گھنٹوں ٹی وی پر نشر ہوتا رہا لیکن کسی سیاستدان کا بال بیکا نہیں ہوا۔ ۲۰۰۴ء میں بی جے پی حکومت سے بے دخل ہوگئی اور ۲۰۰۵ء میں بم دھماکوں کا رخ ایودھیا، یوپی اور دہلی کی جانب پلٹا ۲۰۰۶ء میں پھر ایک بار ممبئی نشانہ بنا۔ ان میں سے اکثر حملوں کے بعد جس تضاد بیانی کا مظاہرہ انتظامیہ کی جانب سے ہوا ہے اس سے شک کی سوئی اپنے آپ خود انہیں کی جانب گھوم جاتی ہے۔

اسیمانند کے مطابق ۲۰۰۲ء میں اکشر دھام حملے کے بعد ہندوؤں کے اندر دہشت گردی کے جراثیم پروان چڑھنے لگے اور ۲۰۰۶ء کے بعد ان لوگوں نے مالیگاؤں حملے سے اپنی کارروائی کا آغاز کردیا یہ بات پوری سچ نہیں ہے۔ ۲۰۰۳ء میں پربھنی کی دو مساجد پر حملے ہوئے اور ۲۰۰۴ء میں جالنہ اور پورنا میں مساجد پر حملے کئے گئے۔ ۲۰۰۶ء کے اندر جالنہ ہی میں آر ایس ایس کا کارکن بم بناتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔ یہ گویا ابتدا تھی اس کے بعد مالیگاؤں، حیدرآباد اور اجمیر شریف سمیت سمجھوتا ایکسپریس کا اعتراف تو اسیمانند نے کرہی لیا ہے اور نہ جانے کتنے ایسے حملے ہوں گے جو ہنوز صیغۂ راز میں ہیں جنھیں اسیمانند چھپارہا ہے یا جو خود اس سے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جتنا کچھ باہر آچکا ہے وہ مسلمانوں کے سر سے اس جھوٹے کلنک کو مٹانے کے لئے کافی ہے جو سیاستدانوں نے انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے مسلمانوں کے سر پر لگادیا تھا۔ الحمدللہ

# سیمی سے سوامی تک کانگریس کا ہاتھ

(قسط دوم)

مالیگاؤں ۲۰۰۶ء سے لیکر مالیگاؤں ۲۰۰۸ء کے درمیان ہندوستانی دہشت گردی کی تاریخ میں ایک عظیم تبدیلی واقع ہوئی۔ بم دھماکوں کی ذمہ داری پاکستان اور سیمی سے ہٹ کر سنگھ اور سوامی کی جانب منسوب ہوگئی۔ ماہ اکتوبر کے اندر اجمیر شریف کی چارج شیٹ میں جو الزامات راجستھان اے ٹی ایس نے سنگھ پریوار پر لگائے دسمبر میں سوامی ایسما نند نے انہیں اپنے اقبالیہ بیان میں تسلیم کر کے ان پر تصدیق کی مہر ثبت کردی گویا دو سال دھوم دھڑاکا دو سال تحقیقات اور دو ماہ میں تصدیق۔ انتظامیہ نے اپنے سیاسی آقاؤں کے لئے ایک منظر نامہ لکھا اس پر اپنے دشمنوں سے عمل درآمد کروایا انہیں کھلنے اور کھیلنے کے بھرپور مواقع فراہم کیا۔ بلا واسطہ ان کا ہر طرح سے تعاون کیا اور وقت آنے پر اس سارے کھیل کو سمیٹ دیا۔ جو لوگ دہشت گردی کے اسرار و رموز تک رسائی چاہتے ہیں ان کے لئے ان واقعات میں بڑی نشانی ہے بشرطیکہ وہ عقل سے کام لیں۔

ملک و ملت میں کچھ سادہ لوح ایسے بھی ہیں جو ان واقعات کو محض اتفاق سمجھتے ہیں۔ کچھ نیک دل لوگوں کے خیال میں ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا بنیادی سبب لاعلمی تھا اب چونکہ حقائق سامنے آگئے ہیں اصلاح ہورہی ہے۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کے خیال میں ملک کا سارا انتظامیہ سنگھ پریوار کے زیر اثر ہے اور سیاسی اقتدار کسی بھی جماعت کے ہاتھ میں ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہوتا وہی ہے جو صیہونی طاقتیں چاہتی ہیں گویا بیچاری کانگریس پارٹی اگر معصوم نہیں تو مجبور ضرور ہے۔ اگر یہ سب سچ ہوتا تو سادھوی پرگیہ کبھی بھی گرفتار نہ ہوتی، سوامی ایسما نند کو اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اس لئے کہ اسے گرفتار کر کے چنچلگوڑا جیل تک لے جانے والا

انتظامیہ کانگریس کے اشارے پر کام کر رہا تھا۔ اگر وہ سوامی جی گرفتار کر کے آندھرا نہیں لے جاتا تو نہ ان کی ملاقات عبدالکلیم سے ہوتی اور نہ کفارہ ادا کرنے کا خیال ان کے دل میں آتا۔ اگر انتظامیہ سنگھ پریوار کی گرفت میں ہوتا تو راجستھان اے ٹی ایس کی چارج شیٹ میں وہ سارے الزامات موجود ہی نہ ہوتے جن کا اعتراف اسیمانند نے کیا ہے۔ ایسے میں کیا اب بھی یہ سوچنا دانشمندی کی علامت ہے کہ کانگریس کی مرکزی اور ریاستی حکومتیں واقعی اندھیرے میں تھیں اور اپنی لاعلمی کے سبب معصوم مسلم نوجوانوں کو گرفتار کر رہی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہاراشٹر، آندھرا اور ہریانہ (جہاں سمجھوتا ایکسپریس کا دھماکہ ہوا) ان تینوں ریاستوں میں کانگریس کے نہایت سیکولر قسم کے وزیر اعلیٰ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ ولاس راؤ کو وسنت دادا پاٹل کی طرح فرقہ پرست کبھی بھی نہیں سمجھا گیا اور نہ وائی ایس آر پر نرسمہا راؤ کی مانند ہندو نواز ہونے کا الزام لگایا گیا بلکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو نہیں بلکہ عیسائی تھے۔ ایک راجستھان میں بی جے پی کی حکومت تھی جو ۲۰۰۸ء میں ختم ہو گئی۔ سیاسی رموز و نکات سے واقفیت رکھنے والے تو کبھی بھی یہ نہیں مان سکتے کہ یہ سب لاعلمی کے باعث ہوا اور جہاں تک اتفاقات کا سوال ہے وہ خوابوں اور خیالوں میں ہمیشہ ہی ہوتے ہیں، حقیقت میں کبھی کبھار ہی ان کا ظہور ہوتا ہے لیکن سیاست میں کبھی نہیں ہوتے یہاں تو سب کچھ منصوبہ بند طریقہ پر ہوتا ہے۔ منصوبوں کا ناکام ہو جانا دیگر بات ہے لیکن اتفاق سے الل ٹپ یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کانگریس والوں نے جانتے بوجھتے اس ببول کے پودے کو پنپنے ہی کیوں دیا؟ اس گلستان کے باغبانوں پر وہ پھولوں کی بارش کیوں کرتے رہے؟ اس کے کانٹوں میں معصوم مسلم نوجوانوں کو الجھا کر زخمی کیوں کیا گیا؟ ان دکھیاروں کے زخموں پر ببول کا کڑوا رس کیوں چھڑکا جاتا رہا؟ اور ایک وقت خاص میں اس پیڑ کو جس کی دیکھ ریکھ بڑے جتن سے کی گئی تھی اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

ان سارے سوالات کا واحد جواب ہے سیاسی مفاد! اپنی سیاسی ضرورت کے پیش نظر ہندو دہشت گردی کی آگ کو ہوا دی گئی اور اس کی نشوونما کی گئی اور اسی سیاسی فائدے کی خاطر اس کا قلع قمع بھی کیا جا رہا ہے۔ سنگھ پریوار اپنے نظریات و خیالات کی حد تک اول روز سے انتہا پسند رہا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی بنیاد پر ہی اس کی ساری سیاست کا دارومدار رہا ہے۔ مسلم پرسنل لا، گائے کشی، کشمیر اور بابری مسجد کے سہارے یہ لوگ اپنی سیاسی دوکان چمکاتے رہے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ پیدا کرنا اور اس کا فائدہ اٹھا کر فسادات برپا کر دینا یہ اس کا طریقہ کار رہا

ہے۔کانگریس کی حکومتوں نے ہمیشہ ہی اس طرح کی صورتحال میں سنگھ کو تحفظ فراہم کیا ہے اس لئے کہ فرقہ وارانہ فسادات اکثر بیشتر کانگریس کے لئے مفید ثابت ہوتے رہے ہیں۔ان کے ذریعہ اس نے مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کر کے خود کو مسیحا کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کے ووٹ بنک پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ہندو رائے دہندگان کی ناراضگی کا اندیشہ کانگریسیوں کو سنگھ پر یوار پر ہاتھ ڈالنے سے روکتا رہا لیکن اس کے باوجود یہ دونوں ایک دوسرے کے سیاسی حریف تو رہے ہی ہیں ۔سنگھ نے ہمیشہ ہی بی جے پی کی ہمنوائی کی جو فطری امر ہے سوائے ایک مرتبہ جموں کشمیر کے انتخاب کے جو استثنائی صورتحال تھی جس میں آر ایس ایس نے بی جے پی کے خلاف کانگریس کا ساتھ دیا اور اس کی بہت بڑی قیمت بی جے پی کو چکانا پڑی۔ اس لئے کانگریس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ آر ایس ایس موجود تو رہے تاکہ وقتِ ضرورت کام آئے لیکن اس کے اثرات کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ آر ایس ایس کے کارکنان کے اندر پائے جانے والے دہشت گردی کے رجحان کا بم دھماکوں کی صورت میں اظہار مسلمانوں کے لئے یقیناً نقصان دہ تھا لیکن کانگریس کے لئے فائدہ بخش تھا۔اس کے ذریعہ سے ایک طرف اس کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کر کے بی جے پی اور آر ایس ایس کے خلاف عوام میں غم و غصہ پیدا کرنا مقصود تھا اور دوسری جانب ان لوگوں کو بلیک میل کر کے اپنے سیاسی مفادات کا حصول سہل بنانا تھا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ پچھلے دنوں سہراب الدین کیس سے مودی کو بری کر کے کانگریس نے نیوکلیائی بل پر بی جے پی کی حمایت حاصل کی تھی اس طرح کی سیاسی سودے بازی میں کانگریس کو مہارت حاصل ہے۔اسی لئے کانگریس والے جان بوجھ کر سنگھ کے ذریعہ ہونے والی دہشت گردی سے نہ صرف چشم پوشی کرتے رہے بلکہ اس کی پشت پناہی کرتے رہے۔اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ان کی جانب سے صرفِ نظر کیا جائے دوسرے اپنے آدمی ان کی تنظیم میں گھسا دیئے جائیں یا ان کے چند لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے اور اپنے ایجنٹوں کے توسط سے ان کو ضروری اسلحہ و تربیت وغیرہ فراہم کیا جائے۔ انتظامیہ کی جانب سے نرمی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ان کی پذیرائی اس حکمتِ عملی کا ایک حصہ ہے۔لیکن اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب رسی کو کھینچ لیا جاتا ہے تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ونجارہ نے ساری قتل و غارت گری نریندر مودی کے ایماء پر کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مودی کے اقتدار کے باوجود وہ جیل میں چکی پیس رہا ہے۔ وزیر داخلہ امیت شاہ مودی کے اشارے پر کھیلتا رہا اور مودی نے اسی کو بلی چڑھا کر اپنے آپ کو بچا لیا۔

مہاراشٹر کو ہندو نظریات کے حوالے سے گنگوتری کا مقام حاصل ہے اس لئے کہ ہندوتوا کے سارے چشمے یہیں سے پھوٹتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لاٹھی اور نیکر سے آگے بڑھ کر بندوق لیس فوجی یونیفارم میں ملبوس دہشت گردی کی ابتدا کے لئے بھی یہی سرزمین سب سے زیادہ موضوع تھی سو یہی ہوا۔ مراٹھواڑہ کے پربھنی، جالنہ اور ناندیڑ سے اس کی ابتدا ہوئی۔ وزیر اعلیٰ ولاس راؤ اسی علاقے کے رہنے والے تھے تو کیا ان کے مخبروں نے انہیں نہیں بتلایا ہوگا کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے؟ ناندیڑ کا دھماکہ تو آر ایس ایس کے کارکن لکشمن راجکونڈوار کے گھر میں ہوا اور اس میں بم بناتے ہوئے اس کا بیٹا نریش اور ہمانشو پانسے نامی وی ایچ پی کارکن ہلاک ہوئے۔ یہ معاملہ اپریل کے مہینے میں ہوا اس کے باوجود پولس نے ان سارے حقائق سے آنکھیں موند لیں اور چند ماہ بعد جب مالیگاؤں دھماکہ ہوا تو انتظامیہ کو سیمی کے علاوہ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ آگے چل کر ناندیڑ دھماکے میں ملوث ایک ملزم نے نارکو ٹسٹ میں ہمانشو کے جالنہ، پورنا اور پربھنی کے دھماکوں کا سوتر دھار قرار دیا اس کے باوجود مالیگاؤں سے گرفتار شدہ مسلم نوجوانوں کی رہائی عمل میں نہیں آئی یہاں تک کے وعدہ معاف گواہ ابرار احمد نے اپنا بیان بدل دیا اور اے ٹی ایس نے عدالت سے کہہ دیا کہ ان نوجوانوں کے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں ہے پھر بھی وہ معصوم ہنوز جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی ہیں۔ کانگریس کی اس چال نے سنگھ پریوار کے اندر دہشت گردی کا رجحان رکھنے والے عناصر کا حوصلہ بلند کر دیا۔ وہ اس خوش فہمی کا شکار ہو گئے کہ انہوں نے انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں زبردست کامیابی حاصل کرلی ہے حالانکہ صورتحال اس کے برعکس تھی حکومت ان احمقوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مالیگاؤں کے معاملے میں کانگریس کی سنگھ کے خلاف رچی جانے والی سازش میں مسلمانوں کو بلی کا بکرہ بنایا گیا تھا۔ اب ان دہشت گردوں نے یکے بعد دیگرے بڑھ چڑھ کر حملے شروع کر دیئے، مکہ مسجد، اجمیر شریف اور سمجھوتا ایکسپریس وغیرہ وغیرہ۔ حکومت ہر حملے کے لئے مسلمانوں کو، انڈین مجاہدین کو، لشکر طیبہ کو اور آئی ایس آئی کو مورد الزام ٹھہراتی رہی یہاں تک کہ مالیگاؤں کا دوسرا دھماکہ ہوا جس میں صرف پانچ لوگ جاں بحق ہوئے اس پر خود سادھوی پرگیہ نے بھی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے راموجی کالسنگرے سے فون پر پوچھا صرف تین لوگ؟ کیا موٹر سائیکل بھیڑ میں نہیں کھڑی کی گئی تھی؟ جواب تھا ایسا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سادھوی نہیں جانتی تھی کہ اس کا فون ٹیپ ہو رہا ہے اور اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جانے والا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں سی بی آئی نے سادھوی پرگیہ کا فون ریکارڈ کیا؟ اور یہی فون کیوں ریکارڈ کیا؟ اس سوال کا جواب

یہ ہے کہ سی بی آئی سادھوی کی تمام حرکات سے واقف تھی اور اس کا ہر فون ریکارڈ ہو رہا تھا لیکن حکومت زیادہ سے زیادہ شواہد جمع کرنے کے لئے اسے موقع دے رہی تھی۔ دھماکے ہوتے رہے، مسلم نوجوان گرفتار بھی کئے جاتے رہے، ہندو دہشت گرد خوشی مناتے رہے کہ انہیں کامیابی پر کامیابی حاصل ہوتی جارہی ہے اور کانگریس پارٹی اپنے پاس زیادہ سے زیادہ شواہد جمع کرتی رہی تاکہ وقت ضرورت ان کا استعمال کیا جائے۔ ۲۰۰۹ء کے انتخابات سے ایک سال قبل کانگریس نے محسوس کیا کہ شکنجہ کسنے کا مناسب وقت آگیا ہے اب ہلکی آنچ پر اس کھچڑی کو چولہے پر چڑھا دینا چاہیے اس طرح مالیگاؤں کے دوسرے دھماکے نے ہوا کے رخ کو موڑ دیا۔

سادھوی پرگیہ، کرنل پروہت اور شنکراچاریہ دیانند پانڈے گرفتار کر لئے گئے۔ ابتدا میں گرفتار ہونے والے تین افراد میں سے سادھوی کا تعلق یقیناً سنگھ سے رہا ہے اور اس کے بے شمار ثبوت موجود ہیں۔ اڈوانی سے لیکر راج ناتھ سنگھ سب اس کی حمایت کر چکے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی پروہت اور پانڈے کے بارے میں ایک حرف بھی اپنی زبان پر نہیں لاتا۔ آر ایس ایس سے ان کے تعلق کو ثابت نہیں کیا جاسکتا بلکہ کرنل پروہت نے اپنے چند بیانات میں آر ایس ایس کو ہندو راشٹر کے راستے کی رکاوٹ قرار دیا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ آر ایس ایس کے مرکزی رہنما اندریش کمار پر آئی ایس آئی کا ایجنٹ ہونے کا الزام اور تین کروڑ لینے کا انکشاف اسی شخص کا ہے۔ دیانند پانڈے اس لحاظ سے نہایت پراسرار ہے کہ یہ شخص دہشت گردی کی ساری معلومات (تصویر اور آواز کے ساتھ) اپنے کمپیوٹر میں ریکارڈ کرتا رہا۔ یہ اس قدر عظیم حماقت ہے جس کا ارتکاب ایک اسکول کا طالب علم بھی نہیں کرسکتا اور پھر طرہ یہ کہ اس کمپیوٹر کو بڑی آسانی سے پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ خیر ان دونوں سے قطع نظر اب اجمیر۔ حیدرآباد اور سمجھوتہ ایکسپریس دھماکوں کے تانے بانے اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اس نے آر ایس ایس کے اچھے خاصے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جن کا تعلق چھتیس گڈھ، مدھیہ پردیش، گجرات راجستھان اور مہاراشٹر سے ہے۔ فی الحال سید ھے نشانے پر سنگھ کے اعلیٰ رہنما اندریش کمار اور سرسنگھ چالک موہن بھاگوت ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اندریش کمار کو جس پر آئی ایس آئی سے روپئے لینے کا الزام ہے سنیل جوشی کے قتل میں پھنسا دیا جائے اور ممکن ہے اس کے ملوث ہونے کا ثبوت بھی پولس کے ہتھے چڑھ گیا ہو اس لئے کہ پچھلے دنوں ہرشد سولنکی نامی نوجوان کو جوشی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے کا دعویٰ پولس کر چکی ہے۔ کل کو اگر سولنکی یہ کہہ دے کہ اس کام کے لئے اسے اندریش نے تیار کیا تھا تو سنگھ پریوار کی عزت و ناموس ہندو سماج کے

اندر کس بھاؤ میں نیلام ہوگی اس کا اندازہ کرنے کے لئے کسی ماہر جیوتش کی ضرورت نہیں ہے ۔کانگریس ایسا کرے گی یا نہیں اس کا فیصلہ اس کی سیاسی ضرورتوں پر منحصر ہے۔

اس پس منظر میں یہ فرض کرلیا جائے کہ اگر ناندیڑ دھماکے کے بعد کانگریس کی ریاستی حکومت نے اس زہریلے ناگ کا سر کچل دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یقینی بات ہے کہ یہ بزدل دہشت گرودُم دبا کر بیٹھ جاتے۔ مسلم عوام ان دھماکوں کی ہلاکت بچ جاتی اور معصوم نوجوان جیل کی صعوبتوں کا شکار نہ ہوتے لیکن کانگریس کا کیا فائدہ ہوتا؟ سچ تو یہ ہے کہ آج ان معصوموں کے خون سے کانگریس پارٹی اپنی مسلم نوازی اور سنگھ پریوار کی ملک دشمنی رقم کررہی ہے۔ سمجھوتہ کے معاملے میں پاکستان کے ذریعہ آنے والی رسوائی کے لئے سنگھ پریوار کو قصور وار ٹھہرایا جائیگا اور بی جے پی اس کا انکار نہ کرسکے گی۔ آگے چل کر وہ ان سارے شواہد کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا جائے گا جو دیانند پانڈے کے کمپیوٹر میں بند ہیں۔ کانگریس ان کے ذریعہ سنگھ پریوار کو بلیک میل کرکے اسے اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرے گی اور عوام میں اپنی نیک نامی کا ڈنکا بجائے گی۔ ۲۰۰۶ء میں شروع ہونے والا ڈرامہ ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچا ہے بلکہ کھیل جاری ہے۔ اس کی الماری سے بہت سارے ڈھانچوں کو باہر آنا باقی ہے جنھیں وقتاً فوقتاً حسب ضرورت باہر لایا جاتا رہے گا تاکہ اس سے سیاسی حریفوں کو مدافعت پر مجبور کرکے خود کو اقدامی پوزیشن میں رکھا جاسکے۔ انتخابی سیاست میں کامیابی حاصل کرنے کا یہ سب سے کامیاب و مجرب نسخہ ہے۔

جمہوریت کی گاڑی ایک پہیہ پر نہیں چلتی اس کے لئے کم از کم دو پہیوں کا ہونا ضروری ہے اسی لئے وی پی سنگھ نے کہا تھا کہ ہم کانگریس کو پوری طرح ختم کرنا نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوام کے سامنے کم از کم دو سیکولر متبادل موجود رہیں۔ اگر کانگریس ختم ہوجائے تو دوسرا متبادل بی جے پی ہوگی اور اس کے اقتدار میں آنے کے امکانات موجود رہیں گے۔ لیکن کانگریس پارٹی کی سوچ اس سے مختلف رہی ہے۔ وہ یا تو اپنے سیکولر متبادل کو نگل جانے کی کوشش کرتی ہے یا اسے صفحۂ ہستی سے مٹادینا چاہتی ہے۔ کانگریس پارٹی کی تاریخ اس حقیقت کی غماز ہے اس لئے کہ کانگریس کو بی جے پی کی بنسبت دوسری سیکولر جماعتوں سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ بی جے پی کو شکست دینا آسان تر سمجھتی ہے اسی لئے وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتی کہ صیہونی فکر کا خاتمہ ہوجائے وہ اسے کمزور حالت میں باقی رکھنا چاہتی ہے۔ اسی حکمتِ عملی کے پیشِ نظر اس نے بڑی خوبی کے ساتھ سنگھ پریوار کو دہشت گردی کے مایاجال میں پھنسا لیا ہے تاکہ اقتدار پر اپنی گرفت کو قائم و دائم رکھا جاسکے۔ وکی لیکس میں راہل گاندھی کا بیان اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

# لال چوک پر ترنگا اور لال قلعہ پر بھگوا

(قسط سوم)

بی جے پی والے دراصل خیالوں کی دنیا میں رہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انسان جو کرنا چاہتا ہے اکثر وہ ہوتا نہیں ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ہو جاتا ہے مثلاً ایسا کون سوئم سیوک ہوگا جو یہ نہیں چاہتا ہو کہ لال قلعہ پر بھگوا جھنڈا لہرائے لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ کل کو اگر سر سنگھ چالک موہن بھاگوت کو بھی ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے تب بھی اس بیچارے کو لال قلعہ پر ترنگا ہی لہرانا پڑے گا لیکن ان عقل کے ماروں کو کون سمجھائے کہ لال چوک پر ترنگا پرچم ایسا ہی ہے جیسا کہ لال قلعہ پر بھگوا لہرانا۔ چونکہ یہ آسان سی بات بھارتیہ جنتا پارٹی کی سمجھ میں نہیں آتی اس لئے وہ بار بار لال چوک پر پرچم کشائی کے لئے مچل جاتی ہے اور یاترا پر نکل پڑتی ہے۔ یہ یاترا ہندوستان بھر میں گھومتی ہے اور پھر جاکر جموں یا پنجاب کے اندر ایک جترا کی شکل اختیار کر کے دم توڑ دیتی ہے۔ اس لئے اب اس پارٹی کو اپنا نام بدل کر بھارتیہ جترا پارٹی رکھ لینا چاہئے۔ بھارت کی جنتا کے مسائل میں اسے ویسے بھی کوئی خاص دلچسپی ہے نہیں۔ اپنے وجود کا احساس کرانے کی خاطر یاترائیں نکالنا اور جترا لگانا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک ان یاتراؤں سے اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

سنگھ پریوار کے اندر یاترا کی داغ بیل جن سنگھ کے بانی صدر شیاما پرساد مکرجی نے ڈالی۔ وہ بھی ایک سیماب صفت آدمی تھے۔ شروع میں تقسیم ہند کے مخالف تھے لیکن بعد میں اس کے حامی بن گئے اس لئے کہ غیر منقسم بنگال میں ہندو اقلیت میں تھے اور یہ انہیں گوارہ نہ تھا۔ مغربی بنگال کی علیحدگی نے ہندوؤں کو اقلیت سے نکال کر اکثریت میں پہنچا دیا تھا گویا مکرجی صاحب کے نزدیک مل جل کر

رہنے سے زیادہ اہمیت اکثریت میں رہنے کی تھی۔ نظریاتی مدوجزر کا اثران کی انتخابی سیاست پر بھی ہوتا رہا۔ انہوں نے پہلا انتخاب کانگریس کے ٹکٹ پر لڑا پھر استعفیٰ دے کر آزاد کھڑے ہو گئے دوبارہ الیکشن جیتنے کے بعد ہندو مہا سبھا کا چولا اوڑھ لیا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد جب ہندو مہا سبھا پر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے پابندی لگائی تو انہوں نے مہا سبھا کا بسنتی چولا اتار کر پھینک دیا اور اس سے الگ ہو گئے۔ پنڈت نہرو نے خوش ہو کر انہیں وزارت صنعت وحرفت سے نواز دیا تو پھر نہرو کے لیاقت علی خاں کو دی جانے والی دعوت کا بہانہ بنا کر کانگریس سے دوسری بار قطع تعلق کر لیا اور سر سنگھ چالک گرو گولوالکر کا آشیرواد لینے کے لئے ناگپور پہنچ گئے اس طرح ایک نئی سیاسی جماعت بھارتیہ جن سنگھ وجود میں آ گئی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہلے ہی انتخاب میں اس تین الفاظ والی جماعت کو تین سیٹیں بھی مل گئیں۔ لیکن اس کے بعد مکر جی صاحب کے دماغ میں کشمیر کا سودہ سمایا اور ۱۹۵۳ء میں کشمیر کی یاترا پر نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت کشمیر میں داخلے کے لئے اجازت نامہ درکار تھا لیکن انہوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلا اجازت داخل ہونے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ سشما اور ارون جیٹلی کی مانند گرفتار کر لیے گئے اور حراست ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شیاما پرساد مکر جی کے بعد اڈوانی جی کی یادگار ایودھیا یاترا کو سمستی پور بہار میں لالو پرساد یادو نے روک لیا اس لئے اپنے رام رتھ میں سوار ہو کر وہ ایودھیا پہنچنے سے محروم رہے۔ اس یاترا کو روکنے کے طفیل لالو نے پندرہ سال بہار پر راج کیا اور مرکز میں وزیر ریلوے بھی ہوئے لیکن اس یاترا کے باعث اڈوانی جی اس قدر بدنام ہوئے کہ بی جے پی کو انتخاب میں کامیابی دلانے کے باوجود انہیں اٹل جی کو وزیر اعظم کی کرسی پر بٹھانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ اس معاملے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اٹل جی ایودھیا یاترا میں نہ گرفتار ہوئے اور نہ ہی اس کے دو سال بعد بابری مسجد کی شہادت کے وقت ایودھیا کے قریب پھٹکے بلکہ الٹا افسوس کا اظہار کر کے مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہے۔

بی جے پی کے تیسرے صدر مرلی منوہر جوشی کو بھی کشمیر جانے کی سوجھی اور انہوں نے ایکتا یاترا نکالی۔ اٹل جی اور اڈوانی جی انہیں جموں میں جلسہ کر کے چھوڑ آئے اور دہلی میں یہ پوچھے جانے پر کہ آپ لال چوک کیوں نہیں گئے؟ جواب دیا مجھے خودکشی کا شوق نہیں ہے۔ خیر کسی طرح نرسمہا راؤ نے مرلی جی کو لال چوک کے بجائے ایک فوجی چھاونی میں پہنچایا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جب انہوں نے ترنگا لہرایا تو پتہ چلا وہ الٹا ہے مطلب ہرا رنگ اوپر اور لال نیچے۔ اب یہ حسن اتفاق تھا یا کسی کشمیری کے ہاتھ کی صفائی تھی یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں خود بی جے پی کے

ذریعہ لہرائے جانے والے پرچم میں بھی اوپر سبز رنگ ہی تھا۔ یہ جھنڈا وندن بھی مرلی جی کو دوبارہ بی جے پی کا صدر نہ بنا سکا اور اس کے بعد ان کا پرچم پارٹی کے اندر ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو گیا۔

محترمہ اوما بھارتی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ نہ صرف ایودھیا میں اڈوانی جی کے ساتھ تھیں بلکہ سری نگر میں مرلی جی کے ساتھ بھی موجود تھیں جب وہ مدھیہ پردیش کی وزیر اعلیٰ بنیں تو وزیر اعظم بننے کے چکر میں انہوں نے ہبلی کی عیدگاہ میں جا کر پرچم لہرانے کا فیصلہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں نہ صرف مدھیہ پردیش کی وزارت اعلیٰ کی کرسی چھوڑنی پڑی بلکہ آگے چل کر پارٹی نے ہی انہیں چلتا کر دیا۔ اب وہ اپنی بھارتیہ جن شکتی پارٹی بنا کر نہ جانے کس صحرا میں کشتی چلا رہی ہیں۔ اڈوانی جی نے جب سیاست سے ریٹائرمنٹ کا ارادہ کیا تو ان کے دو فرمانبردار چیلے سشما سوراج اور ارون جیٹلی صدارت کے سب سے بڑے دعویدار بن کر سامنے آئے لیکن سنگھ پریوار نے اڈوانی کی جناح نوازی کے لئے دھوبی کے بجائے اس کے گدھے پر غصہ اتارتے ہوئے ان دونوں کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا اور نتن گڈکری جیسے نااہل شخص کو محض وفاداری کے انعام سے نوازتے ہوئے پارٹی کا صدر بنوا دیا۔ فی الحال پارٹی کے دونوں پٹے ہوئے مہروں نے اپنی سیاسی بساط کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے ایکتا یاترا نکالنے کا فیصلہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس یاترا سے گڈکری اسی طرح کنارہ کش رہے جیسے اٹل بہاری اڈوانی کی یاترا سے اور اڈوانی جی مرلی منوہر جوشی کی یاترا سے تھے۔ وہ پارٹی جو آپس میں ایکتا پیدا نہیں کر سکتی وہ ملک کے اندر کس طرح اتحاد پیدا کرے گی یہ تو خود بی جے پی والے بھی نہیں جانتے۔ لیکن اس یاترا کے بعد ارون اور سشما کا کیا حشر ہونے والا ہے یہ بتلانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نتن گڈکری ان دونوں کی سیاسی ارتھی کو کشمیر میں نہیں تو جموں میں لے جا کر ضرور جلائیں گے۔

ملک کے عوام وخواص کو اب اس طرح کے تماشوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ انہیں مرلی منوہر جوشی کی ایکتا یاترا کا حشر یاد تھا اس لئے بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذریعہ سری نگر کے لال چوک پر ترنگا لہرانے کا شوشہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ملک کے عوام اس حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں کہ یہ سب سرکس کے شیر ہیں جو محفوظ شامیانے میں تو خوب گرجتے اور دہاڑتے ہیں لیکن اگر انہیں حفاظتی دستوں کے بغیر گلی محلے میں چھوڑ دیا جائے تو چوہے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ محض شیر کی کھال کو لپیٹ لینے سے دانت تو نہیں نکل آتے۔ اور بغیر دانت والے شیر سے بچے ڈرتے نہیں کھیلتے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جو اپنی مادر تنظیم آر ایس ایس کے ناگپور میں واقع صدر دفتر پر یا دہلی مرکز جو اتفاق سے جھنڈے

والان نامی محلہ میں ہے ابھی تک ترنگا لہرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس سے لال چوک میں پرچم کشائی کی توقع ایک خام خیالی ہی ہے اس لئے کہ کشمیر میں ابھی تک یہ لوگ کسی پنچایت کا انتخاب بھی جیتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ بھارتیہ جنتا کی باسی کڑھی میں اس نئے ابال کی وجہ راشٹر بھگتی نہیں ہے بلکہ عوام کی توجہات کو ہندو دہشت گردی کی جانب سے ہٹانا تھا۔ اس حوالے سے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ فی الحال ذرائع ابلاغ میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن یہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے کہ محض کھیل تماشے سے حل ہو جائے اگر سنگھ پریوار والے اس معاملے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو انہیں سب سے پہلے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کے ماتھے پر ایک نیا نہایت بدنما کلنک لگ چکا ہے اور پھر اس کو مٹانے کی سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی۔ ایسا کیونکر ممکن ہوگا؟ اس سلسلے میں ایک مشورہ تو یہ ہے کہ اب بی جے پی کے رہنما سری نگر کے بجائے خود اپنی ریاست مدھیہ پردیش کا رخ کریں اور دیواس کی یاترا نکالیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اندور کے قریب دیواس میں ایسا کیا ہے کہ سنگھ پریوار کو اس کا رخ کرنا چاہئے۔ اگر کسی سنگھی سے آپ یہ سوال کریں گے تو وہ بلا توقف جواب دے گا ہمارے مہان پرچارک سنیل جوشی دیواس بائی پاس کے قریب ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے جنہیں سیمی سے تعلق رکھنے والے مسلم دہشت گردوں نے بلی چڑھا دیا۔ لیکن یہ معاملہ ایک ماہ قبل تک کا تھا جب تک کہ راجستھان پولس نے ہرشد سولنکی عرف راج کو جوشی کے قتل کے الزام میں گرفتار نہیں کیا تھا اور اس نے اپنا اعتراف جرم نہیں کیا تھا۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ جوشی کے قتل کی پہلی اور دوسری برسی کے موقع پر سنگھ کے جو لوگ اس کی تصویر کو ہار پھول چڑھانے کے لئے اس کے گھر گئے تھے اس سال وہ اس جانب پھٹکے بھی نہیں۔ راج بسٹ بیکری کا مجرم ہے اور گجرات سے فرار ہو کر سنیل جوشی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد سنگھ پریوار نے جوشی خاندان کی جانب سے اپنی نظریں پھیر لیں اور پہلے ہی سے معاشی مشکلات میں گرفتار اس کے خاندان کی مصیبتوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جوشی کی بھانجی چینچل کے مطابق اب تو آر ایس ایس کی جانب سے چلائے جانے والے سرسوتی شیشو مندر نے پانچ سو روپے فیس ادا نہ کرنے کے باعث اس کی بہن کو امتحان میں شریک ہونے سے محروم کر دیا ہے حالانکہ جب جوشی زندہ تھا تو ان کی یہ مجال نہیں تھی حالانکہ اس وقت روپے کی کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ چینچل کے مطابق اب وہ ہندوتوا وادیوں سے نفرت کرتی ہے حالانکہ اس کی دیوار پر اب بھی ساورکر، گولوالکر اور ہیڈ گیوار کی تصویریں آویزاں ہے۔ شاید سنگھ والے سنیل جوشی سے اس لئے بھی ڈرتے

تھے کہ اس نے کانگریس کے رہنما پیارسنگھ نیناما اور اس کے لڑکے کا قتل کردیا تھا اور ہندوستان بھر میں ہونے والی زعفرانی دہشت گردی میں ملوث تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چنچل کے مطابق جس رات جوشی کا قتل ہوا سادھوی پرگیہ اسکے گھر آئی تھی اور ایک صندوق اٹھا کرلے گئی۔ اس نے سنیل کے گھر والوں کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ اس کا قتل ہو چکا ہے بلکہ انہیں بعد میں پتہ چلا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سادھوی کو جوشی کے گھر والوں سے پہلے اس کے قتل کا پتہ کیسے چل گیا؟ اور اس صندوق میں کیا تھا جو اس رات وہ اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ اگر سشما اور ارون اس کا پتہ لگا کر ہندوستان کے عوام کو بتلادیں تو یہ واقعی اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ اپنے پاپوں کا پرائشچت کررہے ہیں۔ نیز سنگھ پریوار کے ایسے خاندان کے ساتھ بی جے پی ایکتا قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیگی جس سے فی الحال سنگھ پریوار نے نظریں پھیرلی ہیں۔

سشما اور ارون کو اگر ایسا لگتا ہے کہ سنیل جوشی کے گھر جانے سے وہ خود دھر لئے جائیں گے اس لئے ایسا کرنا خطرناک ہے تو کم ازکم دیواس کے قریب پتر کھیڈا گاؤں میں جاکر شہراج بی سے ملاقات کریں اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کریں جس کے ۶۵ سالہ شوہر رشید شاہ اور ۲۷ سالہ جوان بیٹے جلیل کو ہندوتوادیوں نے سنیل جوشی کے قتل کے الزام میں زندہ جلادیا تھا نیز ایک لڑکے اور لڑکی کو زخمی کردیا۔ عدالت نے اس کے الزام میں پانچ مجرمین کو عمر قید کی سزادی لیکن ان میں سے بھنورسنگھ اور مہی پال سنگھ کے علاوہ باقی تین ضمانت پر آزاد گھوم رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کررکھی ہے۔ اس کے علاوہ تین ملزمین عجب سنگھ، نارائن سنگھ اور وجے گانی منڈی اس قدر بارسوخ ہیں کہ کھلے بندوں گھومتے ہیں لیکن مدھیہ پردیش کا انتظامیہ انہیں گرفتار کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ جج سی وی سرپر کرنے پولس کی اس معاملے میں سرزنش بھی کی اس کے باوجود اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اگر سشما یا ارون اپنے وزیرِ اعلیٰ چوہان سے کہہ کر انہیں گرفتار کروائیں اور سزادلوائیں تو یقیناً یہ ملک کے اندر اتفاق واتحاد کی جانب ایک اہم قدم ہوگا لیکن بی جے پی کو فضول یاتراؤں سے فرصت ملے تبھی تو وہ ایسا کرسکے گی۔ ایسا کرنے میں اس بات کا خطرہ بھی ہے کہ اسکے اپنے پریوار والے اشوک سنگھل سے لے کر پروین توگڑیہ تک سارے کٹر پنتھی ڈنڈا لیکر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے اس لئے بی جے پی سے فی الحال کسی سمجھداری کی توقع کرنا ایک کارِ دارد ہی ہے۔ یہ پارٹی فی الحال اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کی خاطر شارٹ کٹ تلاش کررہی ہے۔ اس کو لگتا ہے کہ لال قلعہ کا راستہ لال

چوک سے ہوکر جاتا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ بی جے پی والے جب بھی اس راستہ سے لال قلعہ کی جانب کوچ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلتا ہے بقول اروِن جیٹلی۔ ''مرکزی اور ریاستی حکومت نے انہیں روک کر علیٰحدگی پسندوں کے آگے پوری طرح سپر ڈال دی ہے اور نتیجے میں ان کا حوصلہ بڑھا ہے۔'' یہ صد فی صد حقیقت ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا کہ ایسی صورتحال کو کس نے اور کیوں پیدا کیا؟ جس پر قابو پانے کے لئے حکومت کو انتہائی اقدام کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا؟ اگر اس سوال کے جواب کی معرفت بی جے پی کو حاصل نہیں ہوتی تو وہ کبھی بھی لال قلعہ تک نہیں پہنچ سکے گی اور کبھی بھول چوک سے پہنچ بھی جائے تو وہاں زیادہ وقت تک نہ سکے گی۔

# ہندوتوا کی نفسیات اور اسلام کی دعوت

(قسط چہارم)

ہندو دہشت گردی کی پرمپرا پانچ ہزار سال قدیم ہے۔ جب سے آریہ قوم نے سرزمین ہند پر قدم رکھا اسی وقت سے یہ عمل جاری وساری ہو گیا۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے اس ملک میں بسنے والے دراوڑوں کو گنگا کی زرخیز وادی سے بے دخل کر کے جنوب کے پہاڑوں میں کھدیڑ دیا۔ اس کے بعد یہاں کے باشندوں کو ذات ونسل کی بنیاد پر مختلف برادریوں میں تقسیم کیا۔ ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا زہر گھول کر خود ان کے مسیحا بن گئے۔ مذہبی پیشوائی کا فائدہ اٹھا کر مقامی اکثریت کو شودر قرار دے دیا۔ جنگجو کشتریوں کو اپنا ہمنوا بنا کر ان سے جنگی مفادات حاصل کئے اور بدلہ میں ان کے سیاسی مظالم کو دھرم یدھ قرار دے دیا۔ تجارت پیشہ ویش برادری کے ہر معاشی استحصال کی دھرم گرنتھوں سے توثیق کی اور اسے جائز ٹھہرایا تاکہ ان کی لوٹ کھسوٹ میں اپنا حصہ محفوظ رکھا جا سکے اور ورن آشرم کا ایسا مایا جال رچایا کہ اس نے ان کو سماج کے سب سے اعلیٰ اور ارفع چوٹی پر ممیز کر دیا۔

اس پراچین ظلم واستحصال کے خلاف خود سرزمینِ ہند پر گوتم بدھ اور مہاویر جیسے مجدد پیدا ہوئے جنھوں نے اس نظام کے خلاف اپنے اپنے انداز میں بغاوت کی اور بدھ مذہب وجین مت کی بنیاد ڈالی۔ بدھ مت کو ابتدا میں اتفاق سے اشوک جیسے عظیم بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی اس لئے براہمن اس کا بال بیکا نہ کر سکے لیکن آگے چل کر جیسے ہی اقتدار کا سایہ اس کے سر سے اٹھا سناتنی دہشت گردوں نے بودھوں کا دیس نکالا کر دیا یہی وجہ ہے کہ بدھ مت کے ماننے والے چین، جاپان اور سری لنکا میں ہندوستان کی بنسبت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بودھوں کے معبدوں کو نیست و

نابود کر دیا گیا یہاں تک کہ گیا میں پائے جانے والے بودھ ویہار کو بھی (جہاں گوتم بدھ نے نروان حاصل کیا تھا) وشنو کا مندر قرار دے دیا۔ جینیوں کو نگلنے کے لئے خود سبزی خور بن گئے ان کو انکی شناخت کو مٹا کر اپنے اندر اس طرح ضم کر لیا کہ اب کوئی فرق ہی دکھائی نہیں دیتا۔

مسلمان ہندوستان میں حاکم کی حیثیت سے آئے تو یہ لوگ ان کی سرکار دربار میں پہونچ گئے لیکن انہیں اپنے سماج سے دور رکھا۔ انگریزوں کی چاپلوسی میں بھی براہمن پیش پیش رہے اور آزادی کے لئے چلنے والی تحریکوں کی بلاواسطہ مخالفت کر کے فرنگیوں کی خوشنودی حاصل کی۔ اس صورتحال میں آزادی سے قبل تقریباً ایک ہزار تک براہمنوں نے اول تو مسلمانوں اور بعد میں انگریزوں سے خوشگوار تعلقات رکھے اور اپنے مفادات کا بھرپور تحفظ کیا۔ لیکن افسوس کے آگے چل کر جمہوریت کی آڑ میں یہی طبقہ ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اس پوری تاریخ میں اپنے سے طاقتور کی غلامی اور اپنے سے کمزور کی آقائی کا کامیاب تجربہ جاری و ساری رہا لیکن گڑبڑ اس وقت ہوگئی جب مسلمانوں نے کمزور ہونے کے باوجود غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک تقسیم ہو گیا تو باقی ماندہ مسلمانوں سے اس بات کی توقع تھی کہ کم از کم وہ غلامی پر راضی ہو جائیں گے لیکن جب ایسا بھی نہیں ہوا تو ہندوؤں کے اندر شدت پسندی اور انتہا پسندی نے جنم لیا جس نے آگے چل کر دہشت گردی کا روپ دھارن کر لیا۔ براہمنی طرزِ فکر میں آنے والی تبدیلی کا اصل محرک اس کا مشرکانہ عقیدہ ہے؟ جب کوئی فرد یا گروہ اس ظلم عظیم کا مرتکب ہو جاتا ہے تو وہ اپنے لئے اس دنیا میں دو انتہائی حیثیتوں کا تعین کرتا ہے۔ اگر اس کے پاس طاقت ہو تو وہ کمزوروں کا خدا بن کر ان کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ پہلے چار ہزار سالوں تک کیا گیا یا پھر طاقتور کی بندگی بجا لانے میں اپنی عافیت و خیریت سمجھتا ہے جیسا کہ بعد کے ایک ہزار سالوں میں ہوا۔ اپنی اس حیثیت کا تعین کرنے کے لئے کسوٹی طاقت کا توازن ہوتی ہے گویا اگر اپنے پاس طاقت ہو تو کمزوروں کے سوامی بن کر اپنی مرضی چلاؤ اور اگر نہ ہو تو طاقتور کے داس بن کر چپ چاپ ملائی کھاؤ۔ تقسیم ہند اور انگریزوں کے چلے جانے کے باعث براہمنوں کو ایسا لگا کہ عرصہ دراز تک ملائی کھانے کے بعد اب مرضی چلانے کا موقع ہاتھ آیا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جس طرح ملوکیت میں طاقت درکار تھی اب جمہوریت میں اکثریت کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ ہر دو صورتوں میں براہمن قوت و اکثریت سے محروم ہی رہے۔ اس لئے پھر ایک بار سازشوں کی مدد لی گئی۔ ہندو دہشت گردی کے حوالے سے حالیہ انکشافات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ لوگ اسلحہ بھی سازشی ذہن کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور انتخاب کے معاملے میں تو خیر ہر کوئی

منافقت کی سہارہ لیتا ہے اس لئے صرف انہیں کو قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔

دورِ جدید میں اپنے اقتدار کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے کی خاطر براہمنوں نے یوروپی فسطائیت کو اپنایا۔ اسی غرض سے معروف ہندو دانشور ڈاکٹر بی ایس مونجے نے بنفسِ نفیس اٹلی کا سفر کر کے مسولینی سے ملاقات کی، دامودر ساورکر نے مونجے کے سیاسی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہندو مہاسبھا قائم کی، ڈاکٹر ہیڈ گیوار کو سماجی سطح پر رائے عامہ کی ہمواری کے لئے آر ایس ایس بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد جب مہاسبھا کا مستقبل تاریک ہو گیا تو سنگھ نے شیاما پرساد مکرجی کے ہاتھوں جن سنگھ کی داغ بیل ڈالی۔ بال ٹھاکرے نے مزید شدت اختیار کرتے ہوئے ہندوتوا میں علاقائیت کی آمیزش کر کے شیوسینا کی بنیاد رکھی، کرنل پروہت کو مسلح جدوجہد کی خاطر ابھینو بھارت کا خیال آیا اور سادھوی پرگیا نے وندے ماترم کا نعرہ لگایا۔ یہ سب کے سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کے چہروں پر واجپائی اور اڈوانی کی طرح مختلف مکھوٹے ہیں لیکن ان کے افکار و خیالات، ان کے مقاصد اور غرض و غایت میں کوئی فرق نہیں ہے بظاہر تمام تر اختلافات کے باوجود یہ سب ایک بولی بولتے ہیں اور نازک گھڑی میں ایک دوسرے کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔

ہندوتوا وادیوں نے اکثریت کو جب اپنا ہمنوا بنانے کا منصوبہ بنایا تو ان کے سامنے نئے مسائل کھڑے ہو گئے۔ ان کا حل براہمنوں کو یوروپی فسطائیت میں نظر آیا۔ اولاً تو ہندو دھرم کے نسلی امتیاز اور ہٹلر و مسولینی کے قومی تفاخر کے درمیان زبردست یکسانیت پائی جاتی تھی اس کے علاوہ کسی مثبت بنیاد پر ہندوؤں کے درمیان اتحاد قائم کرنا ناممکن تھا۔ اتحاد کے لئے مساوات کے قائم کرنے سے ورن آشرم کا خاتمہ ہو جاتا تھا اور نسلی امتیاز کے بغیر اپنا رسوخ باقی رکھنا براہمنوں کے لئے ناممکن تھا لیکن فسطائیت کے منفی نظریہ میں اس مسئلہ کا نہایت آسان سا حل موجود تھا ایک خیالی دشمن پیدا کرو اور لوگوں کو اس سے ڈرا کر اپنا ہمنوا بنالو۔ ہٹلر نے یہودیوں کی مدد سے یہ کام کیا اور ہندو فسطائیوں کو مسلمانوں میں اپنا شکار نظر آیا۔ ہندوتوا وادیوں کی مسلم دشمنی اسی ضرورت کا تقاضہ ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں براہمنوں نے ان کی غلامی کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھا اسی طرح اگر مسلمان بھی ان کی غلامی پر راضی ہو جاتے تو وہ انہیں برضا و رغبت شودروں میں شامل کر لیتے لیکن یہ نہ ہوا مسلمانوں نے اقتدار سے محرومی کے باوجود سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک کشمکش کا آغاز ہو گیا۔

مسلمانوں نے سنگھ کے آگے سپر ڈالنے سے کیوں انکار کیا؟ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ ایک تو مسلمانوں کا عقیدہ توحید اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو اللہ بزرگ و برتر کے علاوہ کسی اور کے آگے کسی طور پر سر تسلیم خم کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اسلام ہندوستان میں تلوار کے علاوہ دعوت کے ساتھ داخل ہوا تھا مگر بدقسمتی سے یہ دو تلواریں مختلف ہاتھوں میں تھیں۔ حکمرانوں کو جن کے پاس اقتدار تھا دعوت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور صوفیا جن لوگوں نے اپنی زندگی کو دعوت کے لئے وقف کر دیا تھا اقتدار سے محروم تھے۔ لیکن صوفیا نے جس انداز میں مشرف بہ اسلام ہونے والے مسلمانوں کی تربیت اور تزکیہ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان فطرتاً آزادی و خودداری کو سخت کوشی اور ابتلا و آزمائش پر ترجیح دینے لگے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے سلطان الہند خواجہ نظام الدین چشتیؒ کی زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۱۴ رجب ۵۳۶ ہجری کو جنوبی ایران کے علاقے سیستان کے ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جس زمانے میں آپ کی ولادت ہوئی وہ بڑا پر آشوب دور تھا سیستان اور خراسان لوٹ مار کی زد میں تھے ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اس وقت ۱۳ سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد خواجہ غیاث الدین حسین سے پوچھا خون مسلم کی یہ ارزانی کب تک جاری رہے گی۔ تو وہ بولے یہ خونی ہوائیں اہل ایمان کے لئے آزمائش ہیں تمہیں صبر سے کام لیتے ہوئے اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ ۱۵ سال کی عمر میں صبر کی تلقین کرنے والا باپ بھی دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ والد کی رحلت کے بعد والدہ بی بی نور نے بیٹے کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے علم و فضل میں کمال حاصل کرنے کی تلقین کی۔ مگر ایک سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ آپ ۵۸۶ ہجری کو دعوت و تبلیغ کی غرض سے جب ہندوستان کی جانب چلے تو پہلے ملتان میں پانچ سال تک قیام کیا اور سنسکرت زبان سیکھی۔ چونکہ آپ کو ہندو قوم کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرنا تھا اس لیے مقامی لوگوں کی زبان جاننا ضروری تھا۔ ملتان کے بعد دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں اپنے مرید حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو چھوڑ کر خود اجمیر شریف کے خطہ زمین کو تبلیغ کے لئے منتخب فرمایا۔ اس وقت اجمیر پر پرتھوی راجہ چوہان کی حکمرانی تھی۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر شہر کے نواح میں گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی اس جھونپڑی میں نماز کا مصلیٰ، پانی کا برتن اور ایک جوڑا لباس شہنشاہ معرفت کا کل اثاثہ تھا۔ شروع شروع میں مقامی لوگ آپ کو جوگی یا سادھو سمجھتے رہے لیکن جب لوگوں نے آپ کو قریب سے دیکھا تو وضع

قطع کے اعتبار سے آپ ہندوسنیاسیوں سے مختلف دکھائی دیئے۔ پھر ایک دن کچھ راجپوت آپ کی جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ آنے کی وجہ پوچھی "آپ کون ہیں؟ اور یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟" آپ نے جواباً فرمایا کہ میں مسلمان ہوں اور تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے آیا ہوں۔ مسلمان کا نام سن کر راجپوت چونک اٹھے۔ کیا تم شہاب الدین غوری کی قوم سے ہو؟ ہاں وہ میرا دینی بھائی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ غوری تو اپنے ہمراہ ایک لشکر جرار لے کر آیا تھا۔ مگر میں تو تمہارے درمیان تنہا ہوں۔ پھر بھی تمہیں خدا کا پیغام سناؤں گا اور تمہیں وہ پیغام سننا ہوگا۔ اگر تم اپنے کان بند کرلو گے تو تمہاری سماعتوں میں شگاف پڑ جائیں گے۔ وہ پیغام تمہارے ذہن ودل کی گہرائیوں میں اتر کر رہے گا۔ اگر تم اپنے گھروں کے دروازے بند کرلو یا دل ودماغ پر پہرے بٹھا دو تب بھی روشنی کی لکیر آہنی دروازوں سے گزر کر تم تک پہنچ جائے گی۔ یہ ایک بڑا دعویٰ تھا جو ایک سرکش قوم کے درمیان کیا جارہا تھا۔ ایک راجپوت کو آپ کی بات ناگوار گزری اس نے تلخ لہجے میں کہا کہ ہم اپنی زمین پر یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ زمین اللہ کی ہے اگر کسی انسان کی ملکیت ہوتی تو تمہارے باپ دادا موت کا ذائقہ نہ چکھتے یا زمین کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ آپ کا یہ جواب سن کر راجپوتوں نے کہا کہ ہم کسی اللہ کو نہیں جانتے زمین وآسمان پر ہمارے دیوتاؤں کی حکومت ہے یہاں تمہارے رہنے کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ تم دوبارہ اپنی زبان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لاؤ گے۔ اس پر آپ نے فرمایا "میں تو اسی کے نام سے زندہ ہوں اور تمہیں بھی اسی کے نام کی برکت سے زندہ کرنے آیا ہوں۔" ایک راجپوت نے اللہ کا وہ پیغام سننے کی فرمائش کی جسے لیکر آپ تشریف لائے تھے۔ آپ نے سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ترجمہ سنسکرت زبان میں سنایا۔ اور فرمایا کہ اللہ کو سب سے ناپسند اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش ہے۔ مٹی کے جو بت ایک جگہ سے دوسری جگہ خود حرکت نہیں کرسکتے وہ تمہاری مدد کیا کریں گے۔ یوں آپ نے اجمیر میں پہلی بار اسلام کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ کی زبان سے اپنے بتوں کے خلاف ادا ہونے والے الفاظ سن کر راجپوت غصے میں لال پیلے ہوگئے اور تلواریں بے نیام ہوگئیں۔ وہ آپ کو تہہ تیغ کردینا چاہتے تھے کیونکہ آپ نے ان کے روبرو ان کے بتوں کی نفی کی تھی۔ مگر آپ کے جلال سے راجپوتوں کے جسم پر خوف طاری ہوگیا۔ تلواریں ہاتھ سے چھوٹ گئیں پھر وہ لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ راجپوت فرار ہوتے ہوئے چیخ رہے تھے کہ یہ تو جادوگر ہے۔

اس کے بعد راجپوتوں کی ایک اور جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ کے پیغام

کوسنا اور اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک ایسے مذہب میں داخل ہو گئے جس کی نگاہ میں اچھوت، کھتری، شودر، ویش، راجپوت اور برہمن سب برابر تھے۔ کفر کے قلعے میں پہلا شگاف پڑ چکا تھا۔ مذہبی اجارہ داروں کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئیں۔ ہندو دھرم کے رکھوالوں نے نومسلمین کو طلب کیا اور پوچھا "آخر تمہیں اس اجنبی کے پیغام میں کیا کشش محسوس ہوئی تم نے اس کے خدا کو دیکھا ہے؟" دین اسلام میں داخل ہونے والے مسلمانوں نے کہا ہم کچھ نہیں جانتے ہمارے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ بولتا ہے۔ بس ہم مجبور ہو گئے۔ کچھ ناعاقبت نااندیشوں نے راجہ پرتھوی چوہان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ باغیوں کی اس مختصر سی تعداد کو قتل کر دیا جائے اور اسلام کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے جان چھڑالی جائے۔ راجہ پرتھوی نے یہ تجویز قبول نہیں کی اس لئے کہ مسلمان ہونے والوں میں بہت سے بااثر ہندو قبائل کے لوگ بھی شامل تھے اس طرح ریاست میں انتشار پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن ان کے معاشی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ جاسوسوں نے پرتھوی راج کو خبر دی کہ معتوب راجپوت نیا مذہب قبول کر کے بہت خوش ہیں تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ پرتھوی راج مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو ہر صورت میں روکنا چاہتا تھا۔ مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ اس مسلمان فقیر کا مقابلہ ہندو جادوگر ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے شادی جادوگر کو اس کے مقابلے پر لایا جائے جو ساحرانہ کمالات میں لاثانی ہے۔

شادی جادوگر کو دربار میں طلب کر کے حکم دیا گیا کہ اپنے جادو کی طاقت سے دیوتاؤں کی بستی کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کر دے۔ مہاراج کی طرف سے حکم ملتے ہی شادی جادوگر نے اپنے چیلوں کو نئے منتر سکھائے اور ساحروں کی فوج لے کر آگے بڑھا۔ جادوگروں کی یہ جماعت اپنے منتر پڑھتے پڑھتے اچانک ایک جگہ ٹھہر گئی جب شادی جادوگر نے انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ ان میں آگے بڑھنے کی طاقت نہیں ہے۔ شادی جادوگر اپنے منتر پڑھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں منہ سے بھڑکتے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کا وجود غم و غصہ سے دہک رہا تھا۔ حضرت معین الدین چشتیؒ نے اپنے خادم کے ہاتھ پانی کا ایک پیالہ بھر کر بھیجا جیسے ہی شادی جادوگر نے پیالے کا پانی پیا تو کفر کی ساری تاریکیاں اس کے دل و دماغ سے جاتی رہیں۔ اسلام کی رحمت و خیر خواہی نے اس کے قلب و ذہن کو مسخر و منور کر دیا اور اس طرح خدا پرستوں کی صف میں ایک اور کلمہ گو کا اضافہ ہو گیا۔

سلطان الہند خواجہ نظام الدین چشتیؒ نے دعوت اور کردار کے نور سے ایک ہزار سال قبل

ہندوستان میں توحید کا چراغ روشن کرتے ہوئے اپنے مخاطبین سے کہا تھا" قدرت بار بار سرکشوں کو مہلت نہیں دیا کرتی۔ اس سے پہلے کہ تمہارے آباواجداد کی زمین تم پر تنگ ہو جائے بت پرستی چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لے آو۔ ورنہ دوزخ کی دہکتی آگ کے لئے تیار ہو جاو" آج وہ بات سچ ثابت ہو رہی ہے۔ سرکشوں کی مہلت کے دن ختم ہو رہے ہیں زمین ان کے لئے تنگ ہوتی جا رہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کے علمبردار اسی تیاری اور دلیری کے ساتھ دعوت دین کا کام کر رہے ہیں جیسا کہ سلطان الہند نے کیا تھا؟ اس سوال کا مخاطب سنگھ پریوار نہیں بلکہ امت مسلمہ ہے۔

# اختلافات کے چکرویوہ میں نام نہاد مختلف پارٹی

وکی لیکس کی بدولت آئے دن سیاسی حلقوں میں ایک نہ ایک ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس حقیقت کو جانچا اور پرکھا جائے۔ وکی لیکس کی حیثیت دراصل سفارتکاروں کے لکھے ہوئے ذاتی ملفوظات سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور پھر یہ امریکی سفارتکار جن کے پیغامات منکشف ہوتے رہتے ہیں کوئی منکر نکیر تو ہیں نہیں کہ ان کو سب کچھ سچ سچ دکھلائی دیتا ہو اور وہ جو کچھ دیکھتے ہوں اسے من وعن لکھ ڈالتے ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ سفارتکار کچھ لوگوں سے گفتگو کر کے ان کا ذہن ٹٹولتے ہیں۔ اب جن سے بات چیت کی جاتی ہے ان کو کچھ معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں ہوتا۔ جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس میں سے کچھ صحیح ہوتا ہے کچھ غلط ہوتا ہے۔ اپنی ناقص معلومات میں سے کچھ تو وہ لوگ بتلاتے ہیں اور کچھ چھپا لیتے ہیں۔ جو کچھ بتلاتے ہیں اس میں کچھ سچ ہوتا ہے اور کچھ جھوٹ ہوتا ہے۔ یہاں تک تو بولنے والے کا معاملہ ہوا۔ اب سننے والا کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ جو سمجھتا ہے اس میں سے کچھ صحیح سمجھتا ہے کچھ غلط سمجھتا ہے۔ جو صحیح سمجھتا ہے اس میں سے کچھ اسے یاد رہ جاتا ہے اور کچھ وہ نوٹس لکھنے تک بھول جاتا ہے۔ جو کچھ لکھتا ہے اس میں نہ جانے کیا کچھ اپنی طرف سے دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ملا دیتا ہے۔ اس طرح وہ دستاویز عالمِ وجود میں آتی ہے۔ اس کی تصدیق کا کوئی اہتمام کسی بھی مرحلے میں نہیں کیا جاتا اور اس پر اکثر کوئی اقدام بھی نہیں کیا جاتا لیکن جب یہ وکی لیکس کے ویب سائٹ پر شائع ہوجاتی ہے تو اس پر ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ جو لوگ اس آسیب کا شکار ہوتے ہیں وہ تو اپنا دفاع کرنے کی غرض سے مندرجہ بالا منطق اور دلائل کا سہارا لیتے ہیں لیکن ان کے مخالفین وکی لیکس کے انکشافات کو الہام کا درجہ دے کر پھیلانے لگتے ہیں اور اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے میں جٹ جاتے ہیں۔

من موہن سنگھ کے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے حوالے سے وکی لیکس کے انکشافات سامنے آئے تھے تو بی جے پی والوں نے اسے خوب اچھالا اور کانگریس پارٹی اپنے بچاؤ میں لگ گئی۔ کانگریس نے اپنی سرکار کو گرنے سے بچانے کے لئے روپے تقسیم کئے یہ ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے اس کے لئے کسی وکی لیکس کی چنداں ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ کانگریس نے ایسا نہ پہلی بار کیا ہے اور نہ یہ آخری بار ایسا ہوا ہے بلکہ کانگریس کیا بی جے پی والوں نے بھی اپنی سرکار بچانے کے لئے لکشمی دیوی کو سونے کا تلک لگایا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شری کرشنا نے کروکشیتر کے میدان میں جو گھوشنا کی تھی کل یگ میں اس کے معنی بدل چکے ہیں بھارتیہ جن تنتر میں جب جب اقتدار کو خطرہ لاحق ہوتا ہے دھن دولت کا مایا جال سدرشن چکر بن حرکت میں آجاتا ہے اور رن بھومی پر چھا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں غلاموں کے بازار لگتے تھے اور انہیں خریدا اور بیچا جاتا تھا آج کل ممبران پارلیمان کی منڈی لگتی ہے جہاں وہ بذاتِ خود اپنے ضمیر کا سودہ کرتے ہیں اپنی وفاداریاں درہم و دینار کے عوض نیلام کردیتے ہیں آج کل یہ اس قدر معمولی بات ہوگئی ہے کہ ایسا کرنے سے نہ ہی بکنے والے کے اندر کوئی احساسِ ندامت ہوتا ہے اور نہ ہی ان رائے دہندگان کو جنھوں نے اپنا قیمتی ووٹ دے کر انہیں ایوان اقتدار میں بھیجا تھا اس پر شرم محسوس ہوتی ہے ورنہ وہ دوبارہ ایسوں کو اپنے حلقہ انتخاب سے کامیاب و کامران نہ کرتے۔

وکی لیکس کا آسیب گزشتہ ہفتے ارون جیٹلی سے چمٹ گیا ہے اور پتہ چلا کہ انہوں نے کسی زمانے میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک سے یہ کہہ دیا تھا کہ ہندوتو کا نظریہ تو بی جے پی کے لئے بس ایک سیاسی موقع پرستی ہے گویا یہ ایک سیاسی ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اب کانگریس والے اس نعمت غیر مترقبہ پر بغلیں بجانے میں لگ گئے۔ سونیا گاندھی سے لے کر کپل سبل تک سبھی نے بی جے پی کی منافقت پر جم کر تنقید کی حالانکہ اس میں حیرت کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے لئے اشتراکیت کی اور کانگریس کے نزدیک سیکولرزم کی جو وقعت ہے۔ بی جے پی کے لئے ہندوتوا کی بعینہ وہی حیثیت ہے۔ وطنِ عزیز کی تمام سیاسی جماعتیں نظریہ کو ٹائلٹ پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں اپنے جسم سے لگی غلاظت کو اس کے ذریعہ پونچھ کر اسے کوڑے دان میں پھینک دیتی ہیں۔

ارون جیٹلی چونکہ وکیل پہلے اور سیاستدان بعد میں ہیں اس لئے انہیں خوف ہے کہ مبادہ رابرٹ نے ان کے بیان کو ٹیپ کر رکھا ہو نیز تردید کی صورت میں ممکن ہے ان کی آواز ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے لگے اس لئے انہوں نے مفہوم کے بجائے الفاظ کی تردید پر اکتفا کیا۔ جس کے معنی یہ

ہیں کہ اسی مفہوم کو ادا کرنے ق کے لئے انہوں نے دوسرے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ارون جیٹلی کو ایسی متنازعہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ اس سوال کا بلاواسطہ جواب اسی وکی لیکس کے کیبل میں درج ہے۔ جیٹلی کا کہنا تھا کہ اڈوانی جی آئندہ دو تین سال سے زیادہ بی جے پی کی قیادت نہیں کر سکیں گے اور اس کے بعد نئی نسل کے پانچ میں سے کسی ایک کو لیڈرشپ کی ذمہ داری اٹھانی پڑے گی۔ یاد رہے یہ بات ۲۰۰۵ء کی ہے اور اس لحاظ سے اڈوانی جی کے دن کب کے لد چکے ہیں بی جے پی نے ایوان زیریں یعنی لوک سبھا میں پارٹی کی رہنمائی کے فرائض سشما سوراج اور ایوان بالا یعنی راجیہ سبھا میں پارٹی کی قیادت ارون جیٹلی کے حوالے کر کے اس کا عملی اعتراف کر لیا ہے۔

جیٹلی نے نئی نسل کے جن پانچ لوگوں کا ذکر کیا ہے اس میں سرفہرست خود ان کی نظر میں ان کے اپنے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا گویا انہیں اب پارٹی کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے اپنے چار حریفوں کا صفایا کرنا ضروری ہے اور وہ اس کام میں بڑی تندہی سے لگے ہوئے ہیں۔ گزشتہ مرتبہ انہوں نے پارٹی انتخاب سے قبل آسام میں پارٹی کے مشترک نگراں سدھانشو متل کا بونڈر کھڑا کر کے مجلس عاملہ کے اجلاس کا بائیکاٹ کر ڈالا اور پارٹی کے صدر راج ناتھ سنگھ کے لئے مشکلات کھڑی کر دیں لیکن یہ بازی الٹی پڑی آر ایس ایس نے راج ناتھ کو ناتھ کر کے ان کی جگہ نوسکھیے نتن گڈکری کو پارٹی کی ڈگدگی تھمادی تاکہ نیا صدر اپنے سنگھی آقاؤں کے اشارے پر تماشہ لگاتا رہے۔ ویسے ارون جیٹلی کے لئے بھی یہ کمزور صدر کسی قدر قابل قبول رہا ہوگا اس لئے کہ اگر مودی یا سشما آجاتیں تو ان کو چیلنج کرنا ناممکن ہو جاتا بلکہ وہ لوگ سب سے پہلے ارون جیٹلی ہی کا ٹکٹ کاٹ کر انہیں بلا ٹکٹ آسام جیسی کسی ریاست میں بن باس پر روانہ کر دیتے۔ بی جے پی میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ان کے عظیم دانشور گووندا چاریہ عرصہ دراز سے شمال مشرق کی خاک چھانتے چھانتے اب گمنامی کے اندھیرے میں غرق ہو چکے ہیں۔

ارون جیٹلی سے ترغیب حاصل کر ان کی حریف اول سشما نے اس بار بی جے پی کی مجلس عاملہ سے قبل اپنا سدرشن چکر چھوڑا اور کہہ دیا کہ کرناٹک کے ریڈی برادران کی ترقی وخوشحالی میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے بلکہ جس وقت ان کو وزیر بنایا گیا اس وقت یدورپا وزیر اعلیٰ تھے اور ارون جیٹلی ریاست میں نگراں کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے اس لئے وہ دونوں لوگ اس کے لئے ذمہ دار قرار پاتے ہیں ان کا یہ کہنا تھا کہ ذرائع ابلاغ نے سشما اور ریڈی خاندان کی تصاویر شائع کرنا شروع

کر دیں حالانکہ سشما سوراج کی بات بالکل صحیح ہے۔ ریڈی برادران نے اپنی غیر قانونی کان کنی سے کروڑوں کا کالا دھن جمع کر رکھا ہے وہ اپنی ذاتی ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ ان کی خوشحالی میں سشما کا حصہ ہے سراسر غلط بات ہے بلکہ اگر ٹھیک سے تحقیقات کی جائیں تو ممکن ہے ایسے شواہد ہاتھ لگیں جن سے پتہ چلے سشما کی خوشحالی میں ریڈی برادران کا حصہ ہے۔

کرناٹک میں ہونے والی غیر قانونی کان کنی اور اس میں بی جے پی کے افراد کا ملوث ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس کا اعتراف وزیر اعلی یدورپا کھلے عام کر چکے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سشما سوراج ریڈی برادران کو ۱۹۹۹ء سے جانتی ہیں جب انہوں نے بیلاری سے سونیا گاندھی کے خلاف انتخاب لڑا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جبکہ اتر پردیش میں بی جے پی کا غلغلہ تھا اور کانگریس والوں کو رائے بریلی تک کی سیٹ محفوظ نہیں لگتی تھی اس لئے سونیا نے اپنی ساس اندرا گاندھی کے نقش قدم پر جنوب کا رخ کیا تھا اور ان کے خلاف بی جے پی نے دیسی بہو کے طور پر سشما کو میدان میں اتارا تھا۔ فی الحال بی جے پی ریڈی برادران کے احسان تلے اس قدر دبی ہوئی ہے کہ سشما تو کیا اگر اڈوانی بھی مخالفت کریں تب بھی ان کو وزیر بننے سے نہیں روکا جا سکتا۔ ریڈی برادران نے اپنے علاقے کے ۳۰ میں سے ۲۳ نشستوں پر بی جے پی کو کامیابی دلائی اور آزاد امیدواروں کی وفاداری حاصل کرنے کے لئے کئی کروڑ روپے خرچ کئے اور بدلے میں دو بھائی تو وزیر بن گئے اور تیسرے کو ایسے سرکاری ادارے کا سربراہ بنایا گیا جسے وزیر کی مراعات حاصل ہیں۔ اس لئے سشما کو ریڈی برادران کے عروج کے لئے کوئی بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس کے باوجود پارٹی میں اپنا قد بڑھانے اور ارون جیٹلی کو نیچا دکھلانے کی خاطر سشما سوراج نے یہ کیچڑ اچھالا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موقع پر راج ناتھ جن کو ارون جیٹلی نے ٹھکانے لگایا تھا آگے آئے اور ریڈی برادران کو وزیر بنانے کی ذمہ داری از خود قبول کر لی۔

بی جے پی کے اندر فی الحال جو مہا بھارت چھڑی ہوئی ہے وہ اس وقت تک جاری رہیگی جب تک کہ ان پانچوں میں سے کوئی ایک اپنے تمام حریفوں کا مکمل خاتمہ کر کے خود بلا شرکت غیرے پارٹی کی باگ نہیں سنبھال لیتا۔ اس صورتحال کو سنبھالنے میں لال کرشن اڈوانی مہا بھارت کے شری کرشن کا کردار ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ دوبارہ وزیر اعظم بننے کا خواب وہ ترک کر دیں اور طالبعلموں کی صف سے اٹھ کر گرو جی کی استھان پر براجمان ہو جائیں لیکن اپنے تمام تر تحفظات و مجبوریوں کے باوجود وہ ہنوز امید سے ہیں کہ کبھی نہ کبھی ان کی گود ہری ہوگی اور وہ ہندوستان کے

تخت طاؤس پر کسی نہ کسی طرح براجمان ہوں گے۔ اقتدار کی یہی حرص و ہوس نہ صرف اڈوانی جی بلکہ بی جے پی کا سب سے سنگین مسئلہ ہے۔

گووندا چاریہ جو کسی زمانے میں اڈوانی جی کے خاص مشیر ہوا کرتے تھے انہوں نے اسی سال ماہ مارچ کے اندر ایک انٹرویو میں اس صورتحال پر بڑا تفصیلی اور نہایت بے باک تبصرہ کیا تھا۔ اس انٹرویو میں ان لوگوں کے لئے بہت سامان عبرت ہے جو سنگھ پریوار کے نقوش پر اپنی سیاسی حکمتِ عملی وضع کرنے کے خواہش مند ہیں۔ گووندا چاریہ کے مطابق بی جے پی میں فی الحال زبردست کنفیوژن پایا جاتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ آپسی رسہ کشی نے اس مسئلے کو مزید الجھا دیا ہے۔ اڈوانی جی کالے دھن کے معاملے کو اہمیت دیتے ہیں اور جیٹلی اس مسئلے پر بیان دینے سے پارٹی ترجمان کو روک دیتے ہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ کوئی سنجیدہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اڈوانی جی کی حالت گھر میں موجود ضعیف و نحیف بزرگ کی سی ہوگئی ہے جس کا احترام تو سبھی کرتے ہیں لیکن کوئی ان کی بات سنتا نہیں ہے۔ ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۹ء کی ناکامیوں نے اڈوانی جی کو توڑ کر رکھ دیا ہے اب تو یہ حالت ہے کہ وہ پارٹی کے اندر کسی معقول آدمی کو اپنے ورد میں بھی شریک نہیں کر سکتے اور گرومورتی جیسے لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنے سمیت پارٹی کو رسوا کر بیٹھتے ہیں۔ اس سنگین صورتحال کا بڑا دلچسپ حل گووندا چاریہ نے ۲۰۰۵ء میں اڈوانی جی کو سمجھایا تھا ان کا مشورہ یہ تھا کہ قیادت نوجوانوں کو سونپ دی جائے یا پارٹی کو ختم کر دیا جائے جیسا کہ اٹل جی نے جن سنگھ کے ساتھ کیا تھا اور اگر جذباتی لگاؤ کے باعث ایسا ممکن نہیں ہے تو اسے واپس آر ایس ایس کے حوالے کر کے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ ان میں سے کسی مشورے پر عمل نہ ہوگا اور ویسا ہی ہوا۔

گووندا چاریہ نے اس جماعت کے حوالے سے جو کبھی ایک مختلف قسم کی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی تھی اس قدر سخت موقف کا اظہار کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب ان کے انٹرویو میں موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظریاتی سطح پر بی جے پی نے اب بالکل ہی مخالف سمت کو اختیار کر لیا ہے۔ کانگریس اور بی جے پی دونوں ہی امیروں کی حامی اور کارپوریٹ کی ہمنوا ہیں۔ اسی کے ساتھ بازار کی قوتوں پر معیشت کے چلنے کی حمایت کرتی ہیں۔ بدعنوانی کے معاملے میں بھی بی جے پی کانگریس سے الگ نہیں ہے اس طرح کانگریس اور اس کے درمیان کوئی خاص فرق باقی نہیں بچا ایسے میں زبردستی تیار کی جانے والی اس کاربن کاپی پر اصلی دستاویز کا فائق ہونا ایک فطری امر ہے۔

گووندا چاریہ کا کہنا یہ بھی ہے کہ بی جے پی کے اندر کارکنان کا اپنے رہنماؤں پر سے اعتماد

اٹھ چکا ہے۔ پارٹی ایک انتخابی مشین میں تبدیل ہوگئی ہے جس کا ہدف صرف اور صرف اقتدار کا حصول بن گیا ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ بی جے پی اب ایک مقصدِ عظیم کے حصول کی خاطر کام کرنے والے کارکنوں کی جماعت کے بجائے اقتدار کے حصول میں سرگرداں امیدواروں کی جماعت بن گئی ہے۔ جس کے باعث نظریاتی معاملے میں سنجیدہ کارکنان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ بی جے پی کے معاملے میں جو رابطے اور تنظیم کا کام آر ایس ایس کر سکتی ہے اس کا مظاہرہ پچھلے پانچ سالوں میں نظر نہیں آیا جس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ آر ایس ایس خود بے دست و پا ہوگئی ہے وہ اس مخمصے میں گرفتار ہو کہ آیا بی جے پی کی سرپرستی کی جائے یا اسے عاق کر دیا جائے۔ گوونداچاریہ کے خیال میں آر ایس ایس بی جے پی کی محتاج نہیں ہے۔ آر ایس ایس کو چاہئے کہ وہ کردار سازی اور قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے پر اپنی ساری قوت اور وسائل کو صرف کر دے۔ یہ ایک مشکل کام ضرور ہے لیکن اسی کو کرنے میں اس کے لیے سکون واطمینان ہے۔ اس لئے کہ یہی آر ایس ایس کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ گوونداچاریہ کا بیان ہندوستان کی ساری نظریاتی تحریکات کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

# بی جے پی کی رامائن سے مہابھارت کی جانب رتھ یاترا

وکی لیکس کی مثال پنڈورا نامی اس صندوق کی سی ہے جس کے بطن سے نئے آئے دن نت نئے آسیب نمودار ہوتے تھے اور یہ غیر یقینی مخلوق کب کس سے لپٹ جائے اس کی بھویشیہ وانی مہارشی ویاس کے لئے بھی ممکن نہیں ہوسکتی تھی حالانکہ سنا ہے ویاس جی انتریامی تھے۔ انہوں نے دواپر یگ میں بیٹھ کر تریتا اور ست یگ کے حالات معلوم کر لئے اور نہ صرف ویدوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ان کی تدوینِ جدید کا عظیم کارنامہ انجام دے ڈالا بلکہ ۱۸ پرانوں کی تصنیف کر گزرے جس میں لاکھوں اشلوک پائے جاتے ہیں۔

وکی لیکس کے حالیہ انکشاف کے بعد جس میں ارون جیٹلی کے حوالے یہ کہا گیا تھا کہ انہوں نے ہندوتوا کو محض ایک سیاسی ابن الوقتی قرار دیا ارون جیٹلی سمیت سنگھ پریوار یہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ بات سراسر غلط ہے لیکن بی جے پی والے یہ نہیں کہہ رہے کہ ہندوتوا اگر سیاسی ڈھکوسلہ نہیں ہے تو آخر کیا ہے؟ یہ مسئلہ نہ صرف اس نظریہ کے ساتھ ہے بلکہ اس دھرم کے ماننے والوں کے ساتھ بھی ہے۔ ہندوستان کا دستور تک اس ہندو کی تعریف بیان کرنے سے قاصر ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ جو مسلمان، عیسائی، جین، بدھ یا سکھ نہیں ہے وہ ہندو ہے۔ سناتن دھرم کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی حقیقت حکایات میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح یہ مذہب انسانوں کو چار طبقات میں ذات پات کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے اسی طرح یہ انسانی تاریخ کو بھی چار ادوار میں بانٹتا ہے۔ ست یگ، تریتہ، دواپر اور کل یگ۔ تریتا یگ تک اس مذہب کی بنیاد وید وں پر تھی جن پر یہ لوگ برہما کے اپنے الفاظ کی حیثیت سے ایمان رکھتے تھے لیکن دواپر یگ میں ویدوں کو چار عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح یجر وید، سام وید، اتھر وید اور رگ وید مرتب ہوئے۔ اس دوران ان تعلیمات میں کس قدر خلط ملط

ہوا اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے بعد ویدوں کی تعلیمات کو آسان بنانے کی خاطر ہندو رشی منی ان کی تفسیر بیان کرنے میں جٹ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۸ اپنشد تصنیف کر ڈالے گئے لیکن اس کے باوجود ویدوں اور اپنشدوں کو عوام میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا تو پھر قصے کہانیوں سے مدد لی گئی اور رزمیہ کتھاؤں پر مشتمل پُران لکھے جانے لگے اس طرح ۱۸ پُران عالمِ وجود میں آ گئے جن میں سے وشنو پُران سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ وشنو پُران کے اندر وشنو دیوتا کے دنیا کو ظلم سے پاک کرنے کی خاطر اور یہاں سے برائیوں کے خاتمے کی غرض سے اوتار بن کر آنے کا بیان پایا جاتا ہے لیکن ان کے تمثیلی و علامتی قصہ ہونے پر سارے ہندو علماء کا اجماع ہے۔

وشنو پُران ہندو عوام کے اندر خاصے مقبول ہو گئے جن میں وشنو کے آٹھ اوتار کا ذکر اور ایک کی پیشن گوئی ملتی ہے۔ ان کہانیوں کے اندر ایک خاص ارتقاء اور تدریج کا عمل کارفرما دکھلائی دیتا ہے مثلاً پہلے چار اوتار ست یگ کے ہیں ان میں سے تین تو مکمل طور سے جانور کے بھیس میں اور چوتھا نصف انسان اور نصف شیر گویا آدھا جانور اور آدھا انسان۔ پہلی کہانی حضرت نوحؑ کے واقعہ سے متاثر ہے جس میں ساری کائنات کے عظیم سیلاب کی نذر ہو جانے کا اور وشنو کے مچھلی بن کر اسے بچانے کا قصہ ملتا ہے۔ دوسری میں وشنو کچھوا بن کر آتے ہیں اور اس کچھوے کی پیٹھ پر کھونٹہ گاڑ کر دیو اور دانو ارتھ (زمین کا) منتھن کرتے ہیں تاکہ اس میں سے امرت کشید کیا جا سکے۔ تیسری کہانی میں وشنو خنزیر کے بھیس میں تشریف لاتے ہیں اور ساری دنیا کو اپنے سونڈ نما منہ پر اٹھا کر سمندر کی طہ میں چلے جاتے ہیں اور چوتھی میں نرسمہا جو آدھا شیر اور آدھا انسان ہے اپنے دشمن کو پھاڑ کھاتا ہے۔ اب ظاہر ہے اس طرح کی کہانیوں کو مقبول ہونا ہی تھا سو ہو گیا۔

تریتا یگ کے تینوں اوتار اتفاق سے انسان ہیں سب سے پہلا پستہ قد بونا جس کا نام وامنا ہے اپنی چالبازی اور چمتکار کی بنیاد پر دشمن کو زیر کر لیتا ہے۔ وہ تین قدم زمین کا وردان مانگتا ہے اور اپنے قدموں کو پھیلا کر ساری دنیا کو اس کے احاطے میں لے لیتا ہے۔ یہاں کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا۔ دوسرا اوتار پرشورام اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے دشمن کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے یہاں تشدد تو ہے سیاست نہیں ہے۔ تیسری کہانی مشہور و معروف رام چندر جی کی رامائن ہے جس میں سیاست اور جنگ دونوں ہے لیکن یہ ایک صاف ستھری داستان ہے جو جنس زدگی سے پاک صاف ہے۔ اس میں راون کی بہن سپرنکھا لکشمن کو شادی کی پیش کش کرتی ہے اس کے باوجود وہ اس کی ناک کاٹ کر اس سے دور ہو جاتا ہے۔ راون جیسا ولن سیتا کا اغوا کرنے کے باوجود اس پر دست درازی کی جرأت نہیں کرتا لیکن

کیکئی کی سیاست بہرحال رامائن کو اپنے پیش رو حکایات سے ممتاز کر دیتی ہے۔

دواپر یگ میں رام لیلا کرشن لیلا میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مہابھارت اس کو بیان کرتی ہے جو ان سب سے آگے نکلی ہوئی ہے۔ یہ جنگ و جدال، سیاسی چال اور جنس پرستی سے مالا مال طلسم ہوشربا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رامانند ساگر کی رامائن کو بی آر چوپڑہ کی مہابھارت نے مقبولیت میں مات دے دی اور اس کے بعد دوبارہ سنجے دت نے اسے بنایا اور وہ بھی خاصی کامیاب رہی گویا لوگ ایک ٹی وی ڈرامے میں جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں وہ سارا مسالہ اس میں موجود ہے۔ ویسے ادی شنکراچاریہ نے بودھ مت کو نگلنے کی خاطر گوتم بدھ کو بھی وشنو کا اوتار قرار دے دیا اور اس طرح وشنو کا نواں اوتار کل یگ میں نمودار ہو گیا لیکن بہت سارے ہندو اب بھی اس کو صحیح نہیں مانتے اور بودھ تو اپنے دین کو ہندو مت سے بغاوت قرار دیتے ہیں جو صد فی صد حقیقت ہے۔

رامائن اور مہابھارت کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر کہانی میں دشمن غیر ہے اور موخر الذکر داستان میں ساری کشمکش اپنوں کے درمیان ہے۔ راون کی ذات برہمن ہے جبکہ رام شتری، رام ہندوستانی ہے راون سری لنکا کا باشندہ گویا ایک شمال تو دوسرا جنوب۔ اس کے برعکس مہابھارت میں ساری سیاست اور ساری جنگ و جدال ایک خاندان کے اندر برپا ہے۔ کورو اور پانڈو چچازاد بھائی ہیں اور ارجن و کرن تو ایک ہی ماں کنتی کے دو پتر یعنی آپس میں سگے بھائی اس کے باوجود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار۔ کرشنا اپنے ماما کنس کو قتل کرتا ہے تو شکنی اپنی بہن کے سسرال والوں کو رسوا کرتا ہے گویا ایک خانہ جنگی ہے جو ہر سو برپا ہے۔ سنگھ پریوار کو اگر ہندو دھرم کے تناظر میں دیکھا جائے ایسا لگتا ہے کہ جن سنگھ کا زمانہ اس کا ست یگ تھا اس کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کے پہلی ربع صدی اس کا تریتہ یگ تھا جس میں بی جے پی کی پہلی نسل نے رام مندر کی تحریک چلائی اور اس کے بعد کا زمانہ یعنی ۲۰۰۵ء کے آگے دواپر یگ جس میں آپسی سر پھٹول اب خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی ہے اس مرحلے میں ضعیف اور دھرندر آر ایس ایس گرو درونا چاریہ کی مانند کوروں کے ساتھ ہے کرشنا کا کردار نائیڈو اور نتیش کمار جیسے لوگ ادا کر رہے ہیں۔

تریتا یگ کی کیفیت اس سے یکسر مختلف تھی اس وقت پارٹی کی توجہ پوری طرح باہر کے راون یعنی کانگریس کو شکست دینے پر مرکوز تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اس دوران بھی آر ایس ایس نے کیکئی کا کردار ادا کرتے ہوئے بڑے بیٹے اٹل بہاری واجپائی کو درمیان ہی میں بن باس پر روانہ کر دیا اور اپنے منظورِ نظر اڈوانی کو پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے لئے بی جے پی

کو ہنومان اور اس کی وانر سینا کی حاجت ہوئی تو وی ایچ پی اور بجرنگ دل کو میدان میں اتارا گیا لیکن اس کے باوجود کانگریسی راون کو شکست دینے میں کامیابی نہیں ہوئی اور ۱۳ دن کی جنگ میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس ناکامی کے باوجود پارٹی کے حوصلے بلند تھے اب راون کے بھائی وبھیشن کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع ہوئی اور جارج فرنانڈیس نے اس خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رام سینا کا حامی بن گئے لیکن یہ سودے بازی خاصی پیچیدہ تھی۔ راون کے ساتھی اپنی شرائط لیکر آئے تھے۔ راون کی لنکا کو خاکستر کر کے جب رام سینا ایودھیا نگری میں داخل ہوئی تو باہر والوں کے اصرار پر بھرت کو سنگھاسن سے ہٹا کر اصلی رام یعنی اٹل جی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جب دوبارہ انتخاب میں کامیابی درج کرنے کے لئے شری رام اپنے اشومیگھ پر سوار ہو کر نکلے تو نئی نسل کے مہاجن اور مودی نے لو اور کش کی مانند نادانستہ وجیے یاترا کو روک دیا۔ اس سارے مرحلے میں سازشوں کے جال تو بنے جاتے رہے لیکن کوئی بغاوت یا خانہ جنگی کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ گویا کل یگ کی رامائن کا ماحول بھی تریتا یگ کا سا تھا یعنی نہ ست یگ اور نہ کل یگ بلکہ دونوں کے درمیان مگر ست یگ سے قریب تر۔

رامائن کے بعد ہندوتوا کے اس قافلے کو مہا بھارت سے دوچار ہونا تھا سو وہ بھی ہو گیا۔ اٹل جی کی بیماری اور اڈوانی جی کی پے در پے ناکامیوں نے بی جے پی کو تریتا سے دواپر یگ میں پہنچا دیا۔ ارون جیٹلی کی رابرٹ بلیک سے گفتگو اور سشما سوراج کا ریڈی برادران کو لے کر موجودہ تنازعہ اسی مہا بھارت والی خانہ جنگی کا شاخسانہ ہے۔ مہا بھارت ویسے تو نہایت دلچسپ رزمیہ داستان ہے مگر اس کا انجام بڑا دردناک ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ رامائن اور دیگر وشنو پرانوں سے مختلف ہے۔ کروکشیتر میں لڑے جانے والے آخری معرکے میں سارے کورو مارے جاتے ہیں۔ اپنے بیٹوں کی بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر ان کی ماں گندھاری کرشن کو شراپ (بد دعا) دیتی ہے اور اسے اس خون خرابے کے لئے ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ گندھاری کے مطابق کرشنا ایسی مابعد طبعی قوتوں کا مالک تھا کہ جنگ کو ٹال سکتا تھا لیکن اس نے اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا آج کل لال کرشن اڈوانی کا بھی یہی حال ہے کہ وہ پارٹی کے اندر برپا ہونے والے خلفشار کو ٹال سکتے ہیں لیکن گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہے ہیں۔ گندھاری کی بد دعا ۳۶ سال بعد پوری ہوتی ہے اور کرشنا اپنے خاندان کو اسی طرح تباہ و تاراج ہوتا دیکھتے ہیں اور خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور کرشن کی دوارکا نگری سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔ یادو نسل کی بربادی کی خبر سن کر راجہ یدھشٹر کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے

بھائیوں کے ساتھ رہبانیت اختیار کرتے ہیں اور اپنا تخت وتاج چھوڑ کر ہمالیہ کی جانب کوچ کرتے ہیں اور کیلاش پربت کے راستے میں ایک ایک کر کے چار بھائی اور دروپدی راستے میں گر جاتے ہے ۔ان کے گرنے کی وجہ دھرتراشٹر یہ بتلاتے ہیں کہ انہیں اپنی طاقت ،فن یا حسن وجمال پر کبر غرور تھا ہاں دروپدی اپنے امتیازی سلوک کے باعث نجات سے محروم رہتی ہے۔بی جے پی کی دوسری نسل کے رہنماؤں کے اندر بھی کبروغرور کی برائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے انہیں چاہئے کہ مہابھارت کے انجام سے سبق لیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ارون جیٹلی نے بھی لیڈرشپ کے لئے پانچ دعویداروں کا ذکر کیا جن میں سے ایک خاتون یعنی سشما سوراج ہے۔مہابھارت کے آخر میں صرف دھرتراشٹر کو موکش (نجات) پراپت ہوتا ہے جو اس جنگ اور خون خرابے کا سخت مخالف تھا۔بی جے پی کے معاملے میں اگر کوئی کردار دھرتراشٹر سے مشابہ ہے تو وہ اٹل بہاری واجپائی ہے جو اپنی عمر اور مرتبے کے لحاظ سے بھی دھرتراشٹر کی مانند ہے۔بی جے پی لحہ بہ لحہ مہابھارت کے مختلف مراحل سے گزر کر اپنے قرار واقعی انجام کی جانب رواں دواں ہے۔

عالمِ اسلام

# جب تاج اچھالے جائیں گے، جب تخت گرائے جائیں گے

فلسطینی انتخابات پر نظر رکھنے کی خاطر مشاہد کے طور پر آنے والے وفد میں سابق صدر جمی کارٹر بھی شامل تھے اور انہوں نے بانگ دہل اس بات کی توثیق کردی کہ انتخابات غیر جانبدارانہ طریقے پر منعقد ہوئے ہیں لیکن جب اس میں حماس کی کامیابی کی اطلاعات آنے لگیں تو سابق خارجہ سکریٹری کونڈالیزا رائس نے حیرت سے کہا اوہو یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں تو ہرگز اس کی توقع نہیں تھی۔ مصر کی موجودہ صورتحال پر نہ صرف موجودہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہلیری کلنٹن بلکہ سارے اوبامہ انتظامیہ کا یہی حال ہے۔ کون جانتا تھا کہ ابھی حال میں غزہ جانے والے ایشیائی قافلہ سے جس فرعون خصلت حکمران نے ایرانی رضا کاروں کو رعونت کے ساتھ اتار دیا تھا وہ خود جلد اقتدار پر بنے رہنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے کے لئے اس قدر مجبور ہو جائیگا۔ جن بے گناہ لوگوں کو برسوں سے اس نے جیل میں ٹھونس رکھا ہے وہ آزاد ہو جائیں گے۔ اس کا لاؤ لشکر بے دست و پا ہو جائیگا اور وہ خود اپنے محل میں محصور ہو جائیگا۔ کون جانتا تھا کہ فیض احمد فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' کے مناظر اس طرح چشم زدن میں ہمارے سامنے آ جائیں گے

جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے

ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

اور اہل حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی

## بس رحم کرے گا اللہ ہی
## جو طاقت بھی ہے قادر بھی

دنیا کے مفکرین و دانشوران حالات کو دیکھ کر ششدر و حیران ہیں لیکن قادر مطلق رب ذوالجلال نے تو سورہ ابراہیم کی ۲۶ ویں آیت میں صاف صاف فرما دیا ''کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اُس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔'' باطل کے اس درخت کو شیطان نہایت خوشنما اور جاذب نظر بنا کر پیش کرتا ہے جس سے اچھے اچھوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ شجر اسی وقت تک لہلہاتے ہیں جب تک کہ مالک اجل کا فیصلہ نہیں آجاتا مگر جب صور پھونک دیا جاتا ہے تو یہ بے قرار درخت روئی کے گالوں کی مانند ہوا میں تیرنے لگتے ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا جیسی کہ حالت زار تیونس کے سابق سربراہ زین العابدین بن علی یا مصر کے حکمراں حسنی مبارک کی ہے۔ کون جانے کہ جب تک آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہوں اس وقت تک فرعونِ وقت کو بھی تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکا جا چکا ہو۔

قرآن حکیم میں شجر خبیثہ کے ساتھ ساتھ شجر طیبہ کا بھی ذکر ملتا ہے فرمان خداوندی ہے ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔'' (ابراہیم ۲۵۔۲۶)

حسنی مبارک کے بالمقابل اگر اخوان المسلمون کو دیکھا جائے تو گویا اس آیت کی زندہ تفسیر نظر آجاتی ہے۔ یہ اس صدی کا معجزہ ہے کہ ایک صالح تحریک کو مٹانے کی کوشش کرنے والے ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے۔ شاہ فاروق اور سعد زغلول کو تاریخ کی دیمک چاٹ گئی۔ جمال عبدالناصر کو قدرت نے اپنے بدترین دشمن اسرائیل کے ہاتھوں رسوا کر کے رخصت کیا، انور سادات خود اپنے ہی فوج کے چند خوددار سپاہیوں کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچا اور اب اس کے جانشین حسنی مبارک کو ملک کے عوام ہر دن ذلت و رسوائی کے گڑھے کی جانب ڈھکیلتے جا رہے ہیں۔ ساری دنیا اس شخص پر لعنت بھیج رہی ہے سوائے ملعون قدیم اسرائیل کے کہ وہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ دونوں کے اندر فرعون کی روح کارفرما ہے۔

اس نازک صورتحال میں نائب صدر سلیمان نے جب حزب اختلاف کو بات چیت کے لئے

بلایا تو اس میں سر فہرست اخوان المسلمون کا نام تھا۔ یہ وہی سلیمان ہے جو بدستور اخوان کے خلاف زہر افشانیاں کرتا رہا ہے۔ ابھی حال میں وکی لیکس کے ذریعہ افشا ہونے والے دستاویز کے مطابق اس امریکی پٹھو نے ۲۰۰۸ء میں امریکی سفارتکار فرانسس ریکیارڈو کے سامنے یہ جھوٹ گھڑا تھا کہ اخوان کے تحت ۱۱ دہشت گرد تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ اس سے قبل ۲۰۰۶ء میں اخوان کی انتخابی کامیابیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا یہ لوگ پابندی کے باوجود ایک زبردست قوت بن کر ابھرے ہیں اور مصری معاشرے میں ان لوگوں نے اپنی جڑیں گہری کر لی ہیں یہ افسوس ناک ہے۔ ویسے امریکی سفیر کے سامنے اس بات کو تسلیم کرنے سے بھی سلیمان نہیں چوکا کہ اخوان نہ تو صرف ایک سیاسی تنظیم ہے اور نہ ہی سماجی یا مذہبی گروہ بلکہ یہ ان تینوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بات ایک حقیقت پسندانہ اعتراف تھا اس لئے کہ اسلامی تحریک کو ایسا ہی ہونا چاہئے چونکہ اسلام کا تعلق نہ صرف زندگی کے ان تین شعبوں سے ہے بلکہ یہ دین تمام ہی شعبہ ہائے حیات پر محیط ہے اسی لئے اسے مکمل نظام حیات بھی کہا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے مصری ایوان کے لئے ۲۰۰۵ء میں ہونے والے انتخابات کے وقت اخوان المسلمون پر پابندی تھی۔ اس لئے اس کے امیدواروں کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ حکومت نے چھاپے مار کر بے شمار رہنماؤں اور کارکنان کو گرفتار کر لیا تھا اور دوران انتخاب بھی زبردست دھاندلی کی اس کے باوجود اخوان کے ۸۸ امیدوار کامیاب ہو گئے اور دیگر حزب اختلاف کی جماعتوں کو صرف ۱۴ نشستوں پر اکتفا کرنا پڑا گویا جن کو پال پوس کر رکھا گیا اخوان کو ان کے مقابلہ ۶ گنا زیادہ کامیابی حاصل ہوئی جبکہ اخوان المسلمون پر گزشتہ ۵۰ سالوں میں جو روح فرسا مظالم ہوئے ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بقول محمد علی جوہر۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
جتنا بھی دباؤ گے اتنا ہی یہ پھیلے گا

پچاس سال تک پابندو سلاسل رکھنے کے بعد پہلی مرتبہ ایک غیر قانونی تنظیم اخوان المسلمون کو مذاکرات میں شامل کرنا اسرائیل، امریکہ اور یوروپ سب کے لئے ناگوار تھا لیکن حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ کوئی اس پر تنقید نہ کر سکا سورہ فتح کی آخری آیت میں اس بشارت کی منظر کشی انجیل کے حوالے سے کی گئی ہے" اور انجیل میں اُن کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی، کاشت کرنے

والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار اس کے پھلنے پھولنے پر جلیں" اس صورتحال نے نہ صرف مومنین کے سینوں کو ٹھنڈک بخشی بلکہ کافروں کے دلوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اسی کو انگریزی ادب میں فینکس نامی ایک شاہین صفت پرندہ سے تشبیہ دی جاتی ہے جو تباہی و بربادی کے مرقد سے اس وقت نمودار ہوتا ہے جب ظلم کے شعلے آسمان کو چھو رہے ہوتے ہیں لیکن آسمان کی بلندیوں پر پہونچ کر جب وہ اپنے پر پھیلاتا ہے تو امن وسکون کی بادِ بہاری چلنے لگتی ہے اور عدل وقسط کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی اور شاہ فواد کو بادشاہ بنا دیا۔ فواد برطانوی سامراج کا اسی طرح باجگذار تھا جیسا کہ آزادی سے قبل ہندوستان کے نواب اور راجہ ہوا کرتے تھے لیکن جلد ہی وہاں بھی کانگریس جیسی ایک وفد پارٹی وجود میں آگئی اور اس نے انگریزوں کی غلامی کے خلاف جنگ آزادی چھیڑ دی۔ سعد زغلول کو پہلے انگریزوں نے قید و بند میں ڈالا اور پھر اس سے معاہدہ کر لیا گویا مصر میں برطانیہ جیسی ملوکیت نما جمہوریت قائم ہوگئی لیکن بادشاہ اور وفد کے درمیان تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ زغلول کی موت کے بعد اس کی جگہ نحاس پاشا نے لی اور فواد کے بعد اس کا بیٹا فاروق بادشاہ بن گیا۔ اسی دور پرفتن میں حسن البناء شہید نے اخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۸ء میں ۱۹ افراد نے مل کر اس تحریک کا آغاز کیا اور ۱۹۳۶ء تک اس کے ممبران کی تعداد ۸۰۰ ہوگئی لیکن ۱۹۳۸ء کے آتے آتے یہ تعداد دو لاکھ تک جا پہنچی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اخوان المسلمون کے رضا کاروں نے اسرائیل کے خلاف جہاد میں عملاً حصہ لیا تھا اور اس جاں نثاری کا بدلہ حکمرانوں نے یوں دیا کہ تحریک کے روح رواں حسن البناء کو شہید کر دیا گیا گویا اخوانیوں پر آزمائش وابتلاء کا آغاز ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود اخوان المسلمون کا زور نہیں ٹوٹا اور ۱۹۵۰ء کے آتے آتے اخوانیوں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی اور یہ تحریک نہ صرف مصر بلکہ عرب دنیا کے چپے چپے میں پھیل گئی۔

تحریک اسلامی پر ظلم توڑنے والی ملوکیت نما جمہوریت کچھ زیادہ دن ٹھہر نہ سکی ۱۹۵۲ء میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ قدرت نے اس کو چلتا کر دیا۔ اس بغاوت کے کرتا دھرتا جمال عبدالناصر اور انور سادات تھے۔ بادشاہوں اور سیاستدانوں کی جگہ فوجی وردی میں ملبوس اشترا کیت نواز لوگ بر سر اقتدار آگئے لیکن اخوان کے دن نہیں بدلے۔ جمال عبدالناصر نے سید قطب شہید کے پاک خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنے کی جسارت کر دی سید قطب تو شہادت کا جام پی کر سرخ رو ہو گئے لیکن مشیت نے عرب قوم پرستی کے نام پر اترانے والے جمال عبدالناصر کو اسرائیل کے ہاتھوں ذلیل کر دیا نتیجہ

یہ ہوا کہ عرب لیگ کی سربراہی سے اسے الگ کر دیا گیا اور اسی صدمہ میں وہ جان بحق ہو گیا۔

جمال عبدالناصر کے بعد ان کے دست راست انور سادات نے اقتدار سنبھالا اور اخوانیوں پر مظالم جاری رکھے لیکن اپنی سیاسی ساکھ کو قائم کرنے کے لئے شام کے ساتھ مل کر اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں انہیں ابتدائی کامیابی حاصل ہوئی لیکن بالآخر جب امریکہ نے اسرائیل کی حمایت میں اپنی رسد روانہ کی تو جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور شام و مصر دونوں کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد انور سادات نے اشتراکی چولہ اتار کر پھینک دیا اور سرمایہ دار امریکیوں اور صیہونی یہودیوں سے ہاتھ ملا لیا تا کہ اپنے فلسطینی بھائیوں کے حقوق کا سودہ کر کے اپنی کھوئی ہوئی زمین حاصل کر سکیں۔ لیکن یہ پینترے بازی انور سادات کے کوئی کام نہ آئی اور جس فوج کی وردی پہن کر وہ آیا تھا اسی فوج کے خوددار سپاہیوں نے اس کو سر عام سلامی لیتے ہوئے گولیوں سے بھون دیا۔ انور سادات کی موت پر امریکہ اور اسرائیل میں صف ماتم بچھ گئی امریکہ کے تین سابق صدور نے جنازے میں شرکت کی ریمبو کہلانے والا رونالڈ ریگن حفاظت کے ڈر سے نہیں آسکا لیکن ساری مسلم دنیا نے انور سادات کی موت پر سکون کا سانس لیا اس لئے کہ اس نے امت کی پیٹھ میں خنجر آزمایا تھا۔

انور سادات کے بعد ان کا نائب حسنی مبارک کا نامبارک ظہور ہوا جو تیس سال تک امریکہ اور اسرائیل کے تلوے چاٹتا رہا۔ اسرائیل کو سستے داموں پر گیس فراہم کرتا رہا اور نہ صرف غزہ کے فلسطینیوں بلکہ مصر کے اسلام پسندوں کا بھی گلا گھونٹتا رہا۔ اس دوران اس نے مصری عوام کے تمام حقوق کو ایک ایک کر کے پامال کیا۔ ان کا سماجی اور معاشی استحصال کیا عوام غربت و افلاس کی چکی میں پستے رہے اور یہ خود ۷۰ بلین ڈالر کے اثاثہ کا مالک بن گیا اپنی عمر کے ۸۳ ویں سال میں وہ اپنے بیٹے جمال مبارک کی تاجپوشی کی تیاری میں مصروف تھا کہ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ تیونس میں برپا ہونے والے انقلاب سے ترغیب حاصل کر کے سڑکوں پر اتر آئے اور اب مبارک لوگوں کے سامنے گڑ گڑا رہا ہے۔ میں دوبارہ انتخاب نہیں لڑوں گا۔ میرا بیٹے نے بھی استعفیٰ دے دیا ایسی دہائی دے رہا لیکن عوام کو اس مگر مچھ پر اعتبار نہیں وہ اسکو بھگانے بلکہ اب تو اس پر اسکے جرائم کے لئے مقدمہ چلانے پر تلے ہوئے ہیں۔ فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس کے نامزد کردہ وزیر اعظم کو عوام نے دفتر میں داخل ہونے سے روک دیا اور اس کی قومی جمہوری پارٹی کے سارے دفاتر کو پھونک دیا گیا ہے۔

مصر کے موجودہ صورت حال پر محتاط ترین تبصرہ واشنگٹن میں موجود مصری سفیر سامع شکری نے کیا۔ وہ بولے مستقبل کا مصر بہر صورت موجودہ مصر سے مختلف ہوگا۔ اس احتیاط کی وجہ یہ ہے سامع

اب بھی اسی حکومت کے ملازم میں ہیں جو اقتدار سے جونک کی طرح چپکا ہوا ہے اور چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے کے اصول پر کارفرما ہے۔ بدقسمتی سے اس کی کھال اس قدر موٹی ہے کہ لاکھ ادھاڑے جانے پر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی یہ کھال دراصل ایک مایا جال ہے کہ جو اس سے چمٹ جاتا ہے وہ پہلے تو مالا مال ہوتا ہے اور بعد میں کنگال ہو کر رخصت ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں قارون کی مثال دی گئی ہے وہ بنی اسرائیل کے اندر پیدا ہوا لیکن اپنے مفاد کی خاطر فرعون کا حواری بن گیا نتیجہ میں اس کی دولت میں اضافہ ضرور ہوا لیکن بالآخر اسے اپنے مال و اسباب کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا گیا۔ نہ اس کا مال اس کے کسی کام آسکا اور نہ فرعون کی سرپرستی اسے تباہ و برباد ہونے سے بچا سکی فی الحال حسنی مبارک کے پاس خطیر اثاثہ ہے اور اسرائیل سمیت امریکہ، یوروپ اس کی تباہی پر آنسو بہار ہے ہیں لیکن اس کا اقتدار دن بدن ذلت و رسوائی کے دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ فنا کے شعلے اس کی چاروں طرف لپک رہے ہیں اس صورتحال پر کیا خوب تبصرہ ترکی وزیر اعظم طیب ارغدان نے کیا انہوں نے حسنی مبارک سے کہا ہم میں سے کسی کو حیات جاودانی حاصل نہیں ہے ہر ایک کو اس دنیا سے لوٹ کر جانا ہے لیکن بعد از موت ہم کو ان اعمال کا حساب بھی دینا ہے جو ہم اس دنیا میں کر کے لوٹیں گے۔ اس موقع پر حسنی مبارک کے لئے اوبامہ سے بہتر نصیحت ارغدان کی ہے۔ یہی بات فیض احمد فیض نے اپنی نظم ''ہم دیکھیں گے'' میں کہی تھی۔

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
ہم دیکھیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
وہ خالق بھی ہے مالک بھی

گزشتہ نوے سالوں میں مصر کے اندر تمام قسم کے سیاسی تجربات کئے جا چکے ہیں۔ ملوکیت کے ساتھ جمہوریت کو آزمایا گیا۔ اشتراکی آمریت بھی آئی اور چلی گئی۔ سرمایہ دارانہ استحصال کا مزہ بھی لوگوں نے چکھ لیا۔ ان تمام نظاموں کو چلانے والے سیکولر لوگ تھے جو قوم پرستی پر ایمان رکھتے تھے۔ مغرب سے تعلیم یافتہ اور مغرب کے رحم و کرم پر انحصار کرتے تھے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہاں

حقیقی جمہوریت نہیں قائم ہو سکی اس لئے مسئلہ ہوا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ امریکہ، اسرائیل اور ہندوستان ان تینوں ممالک میں حقیقی جمہوریت موجود ہے اور اسکے باعث خود ان ممالک کے عوام کو کیا مل رہا ہے نیز ساری دنیا میں اس کی وجہ سے کس قدر فتنہ بپا ہے یہ جاننے کے لئے کسی تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مصر اور عالم انسانیت کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ مختلف باطل نظریات کو تو آزمایا جاتا ہے لیکن اسلام سے کنی کاٹ لی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے آئینہ وہی رہتا ہے چہرے بدل جاتے ہیں۔ اس مرتبہ مصر کے عوام آئینہ بدلتے ہیں یا چہرہ؟ اس سوال پر ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ سارے لوگ دیکھ رہے۔ آپ اور میں بھی ان دیکھنے والوں میں شامل ہیں ہم سب کی حالت فیض جیسی ہے جس کا کہنا ہے۔

جب تاج اچھالے جائیں گے، جب تخت گرائے جائیں گے
ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

# بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

انسانی تاریخ وتمدن کا قافلہ سخت جان فتح وشکست کے دو پہیوں پر اپنی منزل کی جانب مسلسل رواں دواں ہوتا ہے۔ لہروں کے مدوجزر کی مانند توانائی بھی برقناطیسی شعاعوں کی مدد سے بل کھاتی لہراتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اس میں ہر نشیب کے ساتھ ایک فراز ہوتا اور ہر چڑھاو کے بعد ایک اتار آتا ہے۔ اسی حرکت وعمل کا نام زندگی ہے جس دن کائنات کی یہ دھڑکن بند ہو جائیگی قیامت برپا ہو جائیگی۔ شکست وریخت سے جب بھی اہل ایمان کا پالہ پڑتا ہے انہیں سب سے پہلے خدا یاد آتا ہے۔ یہ اسی قدر فطری امر ہے جیسا کہ بچے کا گرتے ہی اپنی ماں کی جانب مڑکر دیکھنا۔ اس کے لئے کسی بچہ کو نہ تو تلقین ونصیحت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی تربیت وتزکیہ کی بس اس کے نفس کا فطرت پر ہونا اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ننھا طفل اپنی مادر حقیقی کو خوب جانتا ہے لیکن بڑے بوڑھے اس امر میں دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اکثر سوتیلی کو سگی ماں سمجھ بیٹھتے ہیں اگر یقین نہ آتا ہو پیر حقیر حسنی مبارک کو دیکھ لیجئے اس نے اقتدار کو چھوڑنے سے قبل اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اسرائیلی قانون ساز بن یامین بین الیزر سے فون پر طویل گفتگو کی۔ اس کام کے لئے اسے ساری دنیا میں کوئی اور نہ ملا یہ وہی بن یامین ہے جو نہ صرف وزیر صنعت وحرفت اور معیشت ومحنت رہ چکا ہے بلکہ اسکو وزیر دفاع اور نائب وزیر اعظم بننے کا بھی موقع ملا ہے۔ اس شخص نے مبارک کی حمایت میں بیان دیتے ہوئے بڑی صفائی سے یہ تسلیم کیا تھا کہ اگر انتخابات کرائے جاتے ہیں تو حزب اختلاف اخوان کامیاب ہو جائے گی۔ بقول بن یامین کے "مبارک نے امریکہ کو برا بھلا کہنے کے بعد مجھے جمہوریت کا درس دیتے ہوئے کہا مشرق وسطیٰ کا مقدر یہی ہے کہ یہاں امریکہ کے ذریعہ جمہوریت کی حمایت ایران میں تو کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکی

ہاں غزہ میں حماس کو ضرور کامیاب کر گئی اور مصر میں بھی انتہا پسند اسلام کو جنم دیگی لیکن یہ معاملہ مصر تک محدود نہیں رہے گا بلکہ خلیج کے دوسرے عرب ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور اس کے نتیجہ میں اگر مستقبل میں اسلامی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے تو مجھے (یعنی مبارک کو) کوئی حیرت نہیں ہوگی۔" یہ بات صحیح ہے لیکن کون اس سے کس قدر متاثر ہوگا اس کا دارومدار اس کے امریکہ اور اسرائیل سے تعلقات پر منحصر ہے بقول بشرالاسد شام پر اس کے خاطر خواہ اثرات نہ ہوں گے اس لئے کہ مصر کے برعکس اس کے اسرائیل سے دوستانہ تعلقات نہیں ہیں وہ اسرائیل و امریکہ نواز محمود عباس کے بجائے حماس کا ہمدرد ہے نیز وہ معیشت کے میدان میں امریکہ پر انحصار نہیں کرتا۔

بن یامین کے مطابق حسنی مبارک باعزت طریقہ پر نکل جانا چاہتا تھا وہ بار بار دوہراتا تھا میں نے اپنے ملک کی ۶۱ سال خدمت کی ہے اس کے باوجود مظاہرین چاہتے ہیں کہ میں فرار ہو جاؤں۔ میں نہیں بھاگوں گا۔ وہ مجھے اٹھا کر پھینک دینا چاہتے ہیں میں نہیں چھوڑوں گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں قتل ہو جاؤں گا لیکن حسنی مبارک کی یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی اور اسے بے آبرو ہو کر جانا ہی پڑا اس موقع پر اسرائیلی وزیر اعظم بن یامین تن یاہو نے تشویش جتاتے ہوئے کہا کہ مصر میں ایران جیسا اسلامی انقلاب آیا چاہتا ہے جس میں اقتدار اخوان کے ہاتھوں میں چلا جائیگا۔ یہ وہی بات ہے جو رائے ہنانیہ نے یروشلم پوسٹ میں لکھی "موجودہ صورتحال میں اسرائیل کے ساتھ امن کوئی مبارک جیسا آمر ہی قائم کر سکتا ہے۔ اگر عوام کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی تو وہ امن معاہدے کے خاتمہ کا مطالبہ کریں گے۔" اسرائیل کو لگتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو غزہ کی غیر قانونی گھیرابندی اپنے آپ ختم ہو جائیگی۔

اسرائیل کو مصر سے رعایتی قیمت میں ملنے والی گیس سپلائی کے بند ہو جانے کی فکر بھی ستاتی ہے یہ ستم ظریفی ہے کہ یہ معدنی گیس مصر سے نکل کر اسرائیل تو پہنچتی ہے لیکن غزہ کے مظلوم اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اس خدمت کے عوض جس پر حسنی مبارک کو بڑا ناز ہے امریکہ مصر کو ڈیڑھ بلین ڈالر کی مدد دیتا ہے اس میں سے ۱.۳ بلین ڈالر تو ہتھیاروں کی نذر ہو جاتے ہیں یعنی واپس امریکہ چلے جاتے ہیں باقی ۲۰۰ ملین حسنی مبارک اور ان کے اقربا کی جیب میں چلے جاتے تھے اس لوٹ پاٹ نے حسنی مبارک کو دنیا کا سب سے امیر فرد بنا دیا ہے، فوربس کے مطابق میکسیکو کے کارلوس کا اثاثہ ۵۴ بلین ڈالر ہے اور بل گیٹس کا صرف ۵۳ بلین جبکہ حسنی مبارک کے پاس بغیر کسی کاروبار کے تقریباً ۷۰ بلین ڈالر موجود ہیں لیکن ابھی تازہ خبر یہ ہے کہ سوئیس بنکوں نے اس اثاثے کو منجمد کر دیا

ہے گویا چوروں کا مال سب چور کھا گئے والی کہانی جو شاہ ایران کے حوالے سے سامنے آئی تھی وہ پھر ایک بار دوہرائی جانے والی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ شاہ ایران کو کسمپرسی کے عالم مصر کی سرزمین نے نگل لیا اب دیکھنا یہ کہ حسنی مبارک کی خاک کس مٹی میں ملتی ہے۔

اقتدار سے بے دخل ہونے کے بعد حسنی مبارک کا محل وقوع پراسرار ہو گیا ہے اور طرح کی طرح افواہیں گرم ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے قاہرہ سے بھاگ کر شرم الشیخ گیا لیکن وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ آنے کے فوراً بعد وہ کسی خلیجی ملک کی جانب پرواز کر گیا۔ ایک خبر یہ بھی آئی کہ اس کی صحت نہایت نازک ہے کینسر سے وہ پریشان ہے، سنا ہے اپنا آخری بیان ریکارڈ کرواتے ہوئے وہ دومرتبہ بے ہوش بھی ہوا تھا اور اب اپنے علاج کے لئے جرمنی پہنچ گیا ہے۔ لیکن وزیراعظم مرکل کے ترجمان نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ آیا ہے اور نہ آرہا ہے، اسے اب جرمنی جانے کے لئے ویزے کی ضرورت ہوگی اس لئے کہ اب وہ صدر تو ہے نہیں نیز اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کیا جارہا ہے کہ اثاثہ منجمد ہو جانے کے بعد علاج کے اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے؟ دنیا کے امیر ترین شخص کے حوالے سے ان خدشات کے اظہار نے حسنی مبارک کو فرعون کی مانند سامانِ عبرت بنادیا ہے۔ ویسے ان متضاد افواہوں کے درمیان کوئی بعید نہیں کہ کل کو یہ خبر بھی جگہ پالے کہ حسنی مبارک تل ابیب کے اندر اپنے دیرینہ دوست ایریل شیرون کے بغل میں موت وزیست کے درمیان لٹکا ہوا ہے۔

مصائب کی گھڑی میں مومن کے قدم زمین پر ہوتے ہیں اور پیشانی رب عظیم کے آگے خم ہوتی ہے لیکن جب مشکل کے بعد آسانی تشریف لاتی ہے تو انسان ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ خطرہ اس وقت سنگین ہو جاتا ہے جب خزاں کے بعد بادِ بہاری چلنے لگتی ہے۔ گویا سورہ نصر کی مصداق ''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے۔'' تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نئی آزمائش سے انسان کیسے نمٹے؟ یہ صورتحال اس لئے نازک ہوتی ہے کہ عام طور پر انسان سرے سے اسے آزمائش تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ تو یہ سوچ کر شاداں وفرحاں ہوتا ہے اب آزمائش کے دن ہمیشہ کے لئے لد گئے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غم کی طرح خوشی کو بھی دوام حاصل نہیں ہے سورہ رحمٰن کی آیات اعلان کررہی ہیں کہ ''پس ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے (۲۶) اور صرف تیرے رب کی جلیل وکریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔'' (۲۷) اس موقع پر عالمِ غفلت میں مبتلا ہو کر پھلجھڑیاں چھوڑنے سے اپنے آپکو محفوظ رکھنے کا نسخہ بھی بتلایا دیا گیا ''تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح

کرو، اور اُس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (۳)

حسنی مبارک کی قبیل کے طاغوت کا رویہ اللہ بزرگ و برتر کی کبریائی بیان کرنے کے بجائے خود اپنی تعریف و توصیف کروانے کا ہوتا ہے وہ لوگ اس حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں کہ اس کائنات کے حقیقی و ابدی اقتدار کا مالک خدائے ذوالجلال کی ذاتِ والا صفات ہے اسی لئے سورہ آل عمران میں حکم دیا گیا'' کہو اخدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔۔۔'' (۲۶) گویا انسانوں کو حاصل ہونے والا اقتدار عارضی ہوتا ہے۔ اور اسی کو حاصل ہوتا ہے جسے اللہ چاہتا ہے اور اسی وقت تک اس کے پاس رہتا جب تک کہ اللہ چاہتا ہے۔ گویا اس کا ملنا اور چھننا دونوں انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں آئے دن رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی ان سے عبرت نہیں پکڑتا۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملوکیت میں اقتدار اولاد کے حصہ میں اپنے آپ آجاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ آمریت میں بھی یہ ہوتا ہے حافظ الاسد کا بیٹا بشر الاسد شام کا فرمانروا بنا ہوا ہے۔ جمہوریت میں بھی یہ عمل ہوتا رہتا ہے۔ پنڈت نہرو سے لیکر راہل گاندھی تک سارا خاندان اس بات کا گواہ ہے۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کی جمہوریت بھی بیٹیوں کو نوازتی رہی ہے۔ جارج بش کے بیٹے کو امریکی جمہوریت بھی نہ صرف ایک بلکہ دو دوبار اقتدار میں آنے سے نہیں روک سکی گو کہ اس کی نااہلی اظہر من الشمس ہو گئی تھی۔ ویسے اقتدار کا انسانوں کی مرضی کے خلاف کسی اور کومل جانا بھی کئی بار کھل کر سامنے آجاتا ہے مثلاً اندرا گاندھی کا راجیو کے بجائے سنجے کا اس کام کے لئے انتخاب کرنا اور راجیو گاندھی کا جس نے شادی سے قبل خود کو سیاست سے کنارہ کش کر لیا تھا نہ صرف وزیراعظم بن جانا بلکہ ان کی پردیسی بیوی سونیا کا ہندوستانی سیاسی افق پر سب زیادہ طاقتور سیاسی محور بن کر ابھرنا۔ پاکستان میں آصف علی زرداری کا بینظیر کو دوبارہ سیاسی بکھیڑے میں پڑنے سے روکنا اور خود صدر بن جانا۔ یہ تمام واقعات سیاسی مبصرین کے وہم و گماں سے پرے تھے لیکن ان کے رونما ہونے سے یہ ثابت ہو گیا کہ اقتدار مختلف راستوں سے حاصل ہوتا ہے اور مختلف طریقوں سے چھین بھی لیا جاتا ہے اور یہ اقتدار کا آنا اور جانا خود صاحب اقتدار کے قبضہ قدرت میں نہیں ہوتا۔

حسنی مبارک کے سر پر سے جب امریکہ کا سایہ التفات اٹھ گیا تو فوج اس کے سر پر استعفیٰ کی تلوار لے کر پہنچ گئی۔ اس وقت مبارک نے قوم سے خطاب کرنے کی اپنی آخری خواہش کا اظہار

کر دیا۔ فوجی سربراہان نے سوچا شاید یہ اپنی بچی کھچی ساکھ کو کسی طرح سنبھال کر لے جانا چاہتا ہے اس لئے ایک اور موقع کی بھیک اس کی جھولی میں اچھال دی گئی لیکن اس احمق نے اسے بھی گنوا دیا۔ اس نے نہ تو اپنے کرتوتوں کے لئے قوم سے معافی مانگی اور نہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ملک کے مفاد میں عظیم قربانی دینے کا ڈھونگ رچایا حالانکہ اگر وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا اس کے برخلاف اقتدار سے چپکے رہنے کے اپنے عزم کو دوہرایا۔ لوگوں نے جوتے اچھال کر اس کا جواب دیا۔ مبارک نے اپنے آپ پر غالب کا مصرعہ "بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" بذات خود چسپاں کر لیا۔ اول تو اس کے اقتدار نے اسے ذلیل کیا اور پھر اقتدار کے اصرار نے اس کی رسوائی میں چار چاند لگا دیئے مشیت ایزدی اسی طرح کام کیا کرتی ہے فرمایا ''تو جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے بھلائی تیرے اختیار میں ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۲۶)

حسنی مبارک جیسے لوگ جب اپنی ذلت و رسوائی کا شکوہ کرتے ہیں تو ان کے جواب میں فرمایا جاتا ہے ''مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔'' (۲۸) استشنائی رخصت مظلوم افراد کو تو حاصل ہے لیکن جو باغی و طاغی حکمران اپنا اقتدار بچانے کی خاطر اللہ کے دشمنوں پر بھروسہ کرتے ہیں، اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے اہل ایمان والوں کے بجائے ان کے دشمنوں کو اپنا رفیق و دمساز بناتے ہیں ان کو انہیں کے دوست نما دشمنوں کے ذریعہ سر بازار برہنہ کر دیا جاتا ہے۔ حسنی مبارک کے قریبی یہودی دوست بن یامین کے ذاتی ٹیلی فون کے طشت از بام ہونے کی مثال اوپر گذر چکی ہے۔

اہل ایمان یوں تو ہر وقت رسول کریم ﷺ کی یاد سے اپنے قلب کو معطر رکھتے ہیں لیکن ماہ ربیع الاول میں آپؐ کے ذکر کی خوشبو چہار جانب پھیل جاتی ہے اور اس موقع پر نبی کریمؐ کے رحمت اللعالمین ہونے کی بات بڑی کثرت سے دوہرائی جاتی ہے۔ لیکن سورہ انبیاء کی اس آیت کو اگر سیاق وسباق کے ساتھ دیکھا جائے تو اس میں مصر کے موجودہ حالات پر تبصرہ و رہنمائی بھی ہے فرمایا ''اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے (۱۰۵) اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔'' (۱۰۶) گو یا وقتی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ قبطیوں جیسا کوئی جابر و طاقتور اقتدار زمین کے کسی خطہ پر قائم ہو جائے لیکن بالآخر زمین کی وراثت

کے حقدار اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔ اس بات کا ذکر زبور میں موجود ہے اور یہودی خود اسے دیکھ سکتے ہیں نیز بنی اسرائیل کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے ان دو آیات کے بعد فرمایا کہ ''اے محمدؐ، ہم نے جو آپ کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔'' (۱۰۷) گویا اب آپ کے ذریعہ نیک بندوں کو اقتدار سونپا جائیگا اور مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اللہ نے نبی پاکؐ اور ان کی امت کے نیک بندوں کو زمین کا وارث بنایا لیکن اس کے بعد والی آیت میں آئندہ کے مراحل کا ذکر ہے فرمایا ''(ان سے کہو) میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا خدا صرف ایک خدا ہے، پھر کیا تم سر اطاعت جھکاتے ہو؟'' (۱۰۸) اس دعوت کو صاف صاف پیش کر دینے کے بعد اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ ''میں نے علی الاعلان تم کو خبردار کر دیا ہے اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب ہے یا دور۔'' اسی کے ساتھ جس ڈھیل کے باعث اکثر طاغوتی طاقتیں اپنے بارے میں زبردست خوش فہمی کا شکار ہو جاتی ہیں انہیں خبردار کیا گیا کہ ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ (دیر) تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت خاص تک کے لیے مزے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔'' (۱۱۱) دنیا نے دیکھا کہ حسنی مبارک کی رسی کو ۳۰ سال تک دراز کیا گیا لیکن وہ اپنی بغاوت سے بعض نہیں آیا یہاں تک کہ اس پر اس سلسلے کی آخری آیت چسپاں ہوگئی۔ (رسول نے کہا) ''اے میرے رب، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور لوگو، تم جو باتیں بناتے ہو اُن کے مقابلے میں ہمارا ربِّ رحمان ہی ہمارے لیے مدد کا سہارا ہے۔'' (۱۱۲)

# سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری قدرت کیا

اقوامِ عالم کی امامت کے منصبِ جلیل پر کسی قوم کے فائز ہونے کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ وہ ساری دنیا کی توجہات کا مرکز بن جاتی ہے کسی کے لئے اس کی جانب سے صرفِ نظر کرنا مشکل تو کجا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات دیگر قوموں پر پڑنے لگتے ہیں اور لوگ اس کی مثالیں دینے لگتے ہیں نیز اس کے معاملات میں مداخلت کرنے سے گھبراتے ہیں ۔اس کسوٹی پر اگر اقوامِ عالم کو پرکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ زمانہ اگرچہ کہ امت مسلمہ اس منصب پر پوری طرح فائز نہیں ہوئی ہے لیکن بڑی تیزی کے ساتھ اس جانب پیش قدمی فرمارہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کی نظریں یوروپ اور امریکہ کی جانب لگی ہوتی تھیں۔ ہر کس و ناکس مغرب کی نقالی کو اپنے لئے باعثِ فخر و سعادت سمجھتا تھا بلکہ حالت یہ تھی کہ مغرب میں برف باری ہوتی تھی تو ایشیا خاص طور پر وسط ایشیا میں حکمرانوں سمیت عوام کو زکام ہو جاتا تھا اور بیجا مداخلت کا یہ عالم تھا کہ محض انتخاب میں اپنی مقبولیت کے اضافہ کی خاطر معصوم مسلمانوں پر بمباری کرنے سے دریغ نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب حالات خاصے بدل گئے ہیں گزشتہ چند ماہ سے بین الاقوامی خبروں میں مسلمانوں کا بول بالا ہے ہر کوئی عالمِ اسلام کی جانب متوجہ ضرور ہے لیکن کسی کی مجال نہیں ہے کہ مداخلت کرنے کی جرأت کرے۔

ماضی کے برخلاف حالیہ تبدیلیوں کے پس پشت کوئی بیرونی طاقت یا اس کا مفاد کارفرما نہیں ہے۔ ان سارے تغیرات کی زمام کار صرف و صرف امت مسلمہ کے ہاتھ میں ہے اور ساتھ ہی اب یہ حالات ساری دنیا پر اپنا اثر ڈالنے لگے ہیں لوگ مسلم عوام کی جانب رشک و تحسین کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ چین جیسے ابھرتے ہوئے سپر پاور نے اس زلزلے کے جھٹکے محسوس کر لئے ہیں اور وہاں کے

حکمرانوں نے اپنے عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا ہے یہ سوال بھی کیا جانے لگا ہے کہ امریکہ کب تک اس طرح کی بغاوت کو ٹال سکے گا نیز اس اندیشے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ معاشی بحران اس انقلاب کی راہ کو بڑی تیزی کے ساتھ ہموار کر رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب امریکی عوام بھی مضطرب ہو کر سڑک پر اتر آئیں گے۔ امریکہ کے معروف ماہرین معیشت جن میں ٹرینڈ ریسرچ کے چیف ایگزیکٹیو جیرالڈ کلینیٹی بھی شامل ہیں نے ۲۰۱۲ء کے آتے آتے امریکہ میں خوارک کی خاطر فسادات کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ظاہر کر دیا ہے ان کے مطابق بے روزگار عوام ملازمت کی خاطر سڑکوں پر اتر آئیں گے اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیں گے اس لئے کہ ان کے پاس اس کی سکت ہی نہ ہوگی ۔ جیرالڈ کے اندازوں کو اس لئے آسانی کے ساتھ ٹالا نہیں جا سکتا کہ ماضی میں سویت یونین اور مشرقی ایشیا کے معاشی بحران کے حوالے سے ۱۹۸۷ء میں جو قیاس آرائی اس نے کی تھی وہ صحیح ثابت ہو چکی ہے ۔ ۲۰۰۸ء میں عالمی کساد بازاری کی پیشن گوئی وہ کر چکا تھا اور اسی وقت اس نے خوراک کے دنگوں کی بات کہی تھی ۔ امریکہ میں مصر کی طرح کے انقلاب کا امکان اس لئے بھی بہت روشن ہے کہ قدرتی اور انسانی وسائل سے ایشیا پہلے ہی سے مالامال ہے اس پر طرہ یہ کہ صنعتی پیداوار کا محور بھی فی الحال امریکہ اور یوروپ سے نکل کر ایشیا کی جانب کوچ کر چکا ہے۔

امریکہ کی داخلی صورتحال سے زیادہ اس کی خارجہ پالیسی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئی ہے جس کا اعتراف صدر اوبامہ کے نامزد کردہ مشرق وسطیٰ کے مشیر ڈینس روس اپنے حالیہ بیان میں کیا۔ انہوں نے کہا اسرائیلی حکومت کو مصری انقلاب سے یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ فلسطینیوں کے معاملے میں موجودہ صورتحال ناپائیدار ہے اور اس طرح کے غیر مستحکم حالات خطرناک ہو سکتے ہیں۔ مصر میں وقت کے ساتھ جس طرح بے اطمینانی میں اضافہ ہوتا رہا اسی طرح حالات سے فلسطین بھی دوچار ہوگا اور آگے چل صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ ڈینس نے مصر کو اسرائیلی امن کا سب سے اہم ستون قرار دیا اور کہا کہ امریکہ اپنی معاشی مشکلات کے باوجود اسرائیل کی امداد جاری رکھے گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شاخِ نازک ہی ٹوٹ جائیگی تو اس ولدالحرام کے لئے خود اپنے خنجر سے خودکشی کے علاوہ کون سا چارۂ کار باقی بچے گا؟

مصر سے مشابہ ترین صورتحال اگر کسی ملک میں پائی جاتی ہے تو وہ ہندوستان ہے۔ ان دونوں ممالک کا انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا، عرصہ دراز تک بظاہر غیر جانبداری کا دکھاوا اور بباطن دائیں بازو کی جانب واضح جھکاؤ نیز اسرائیل سے دشمنی اور پھر پلٹا کھا کر نہ صرف امریکی غلامی کو قبول

کرنا بلکہ اسرائیل سے پینگیں بڑھانا یہ تمام مشترک عناصر ہیں۔ ایک فرق ضرور ہے کہ ہندوستان میں انتخابات ہوتے رہے ہیں فوجیوں کے بجائے شہری اقتدار پر فائز رہے ہیں جبکہ مصر میں بھی انتخابی ڈرامہ کے باوجود فوجیوں کی مسلسل حکومت رہی اور حسنی مبارک سے قبل مصر کے دونوں سربراہ مرکز اقتدار سے دستبردار ہوئے ویسے یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ہندوستان کے پہلے مقبول و معروف وزیر اعظم پنڈت نہرو کا انتقال جس طرح چین کے ہاتھوں شکستِ فاش کے صدمہ سے ہوا اسی طرح ان کے عزیز دوست صدر جمال عبدالناصر کی موت اسرائیل کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں پسپائی کے بعد ہوئی نیز اندرا گاندھی کو جس طرح ان کے حفاظتی دستہ نے ہلاک کیا اسی طرح انور سادات کو ایک فوجی نے قتل کر دیا۔ انتخابات کے اندر دھاندلی تو دونوں ممالک میں ہوئی لیکن ان کی کمیت میں فرق ضرور رہا۔ ان دونوں ممالک کے درمیان ایک معمولی سا فرق یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد بیشتر عرصہ اقتدار کا تاج نہرو خاندان کے قدموں میں رہا درمیان میں کبھی کبھار کچھ اور لوگوں کو بھی موقع ملتا رہا جبکہ ایسی کوئی خاندانی حکومت مصر میں قائم نہ ہو سکی حسنی مبارک اپنے بیٹے جمال مبارک کو صدارت پر فائز کرنے سے پہلے چلتے کر دیئے گئے۔ نظریاتی سطح پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دونوں ممالک کے رہنماؤں کو اپنے سیکولر، سوشلسٹ اور قوم پرست ہونے پر بڑا ناز تھا۔ ان سارے مشترک عوامل کے پیش نظر ہندوستان میں مصر کی بڑی گونج سنائی دی اور کمیونسٹ پارٹی سے لے کر بی جے پی تک سبھی ہندوستان کے اندر بھی مصر جیسی بغاوت کی پیشن گوئی کرنے لگے ہیں۔ کانگریس ایسا کہنے سے اس لئے گریز کر رہی ہے کہ وہ برسر اقتدار ہے کل کو اگر ان سے اقتدار چھن جائے تو وہ بھی یہی کہیں گے۔

سماجی سطح پر مشابہت تلاش کی جائے تو سرِ فہرست بدعنوانی دکھائی دیتی ہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ سوئس بنکوں میں ہندوستانی سیاستدانوں کا جملہ کالا دھن مصریوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ٹوجی گھوٹالہ کی رقم میں صفر گنتے گنتے غریب گنتی بھول جاتا ہے۔ کلماڈی سے لیکر ڈالمیا تک بدعنوان اقتدار کے مہرے کھیل کھیل میں ارب پتی بن گئے ہیں اور ہزاروں شہادتوں کے باوجود ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں انتخابات کے بعد حکومتیں ضرور تبدیل ہوتی ہیں لیکن جو بھی حکمران ایک اقتدار پر قابض ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی حسنی مبارک یا معمر قذافی سے کمتر نہیں سمجھتا بلکہ اڈوانی اور مودی تو ان سے دو قدم آگے نکلے ہوئے ہیں۔ حسنی کو تین سو افراد کی ہلاکت کے نتیجے میں اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا جبکہ مودی ہزاروں کو قتل کرنے باوجود اقتدار سے چپکا ہوا ہے۔

من موہن سنگھ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ نہایت صاف ستھری شخصیت کے حامل ہیں لیکن ان کے دورِ حکومت میں جس طرح کی بدعنوانیوں میں خود ان کی اپنی پارٹی وزراء اور وزرائے اعلیٰ ملوث پائے گئے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ حالیہ دنوں میں ایک بدعنوان افسر تھامس کو مرکزی ویجلنس کمیشن کا سربراہ بنا کر جس کا مقصد ہی بدعنوانی پر لگام لگانا ہے انہوں نے جس ڈھٹائی کا ثبوت دیا اس کی نظیر پیش کرنا محال ہے۔ حزبِ اختلاف کے اعتراض کے باوجود ایک ایسے شخص کو جس کے خلاف عدالت میں گھپلے بازی کا مقدمہ درج ہے سی وی سی کی سربراہی کے اہم ترین منصب پر فائز کرنے کی جرأت کوئی سردار ہی کر سکتا ہے۔ عدالت عالیہ نے تھامس کی تقرری کو کالعدم قرار دے کر وزیرِ اعظم کے ساتھ ساتھ وزیرِ داخلہ کی بھی سرزنش کر ڈالی لیکن دیگر کئی معاملات میں خود عدالت بھی اقتدار کے ہاتھوں کا کھلونا بنی رہی۔

اس سال جبکہ ساری دنیا میں عالمی یومِ خواتین منایا جا رہا تھا دارالخلافہ دہلی کی سڑکوں پر دن دہاڑے ایک طالبہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ کوئی اکا دکا واقعہ نہیں ہے شہر دہلی میں ۲۰۰۹ء کے اندر ۴۵۹ عصمت دری کے واقعات ہوئے تھے جبکہ ۲۰۱۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۴۸۹ ہو گئی حالانکہ دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت ہیں اور کانگریس کی زمامِ کار سونیا گاندھی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لوگ خواتین کے لئے ریزرویشن کا قانون بنا رہے ہیں جبکہ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے واقعات گزشتہ سال ۵۲۸ سے بڑھ ۵۸۵ کر ہو گئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے اس طرح کے اکثر سانحات پولس تھانے میں درج نہیں ہوتے روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے مطابق ایک جائزے سے پتہ چلا ہے کہ دہلی شہر کی ۶۶ فیصد خواتین گزشتہ سال ۲ تا ۵ مرتبہ چھیڑ خوانی کا شکار ہوئی ہیں۔

ہندوستان کی خوشحالی کا ساری دنیا میں ڈنکا بج رہا اس خوشحالی کا چراغ روشن رکھنے کی خاطر گزشتہ سال تین مرتبہ شہر ممبئی کے باندرہ علاقے کی جھگی جھونپڑیوں کو پھونک دیا گیا۔ پچھلے ہفتہ لگنے والی آگ نے ۲۰۰۰ گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کا چراغ انہیں جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے باشندوں کے دم سے روشن ہے ورنہ محلوں اور کوٹھیوں کے امراء تو اسی وقت ووٹ دینے کے لئے آتے ہیں جب ذرائع ابلاغ کے لوگ ان کی تصویر کشی کے لئے موجود ہوتے ہیں ورنہ وہ پولنگ بوتھ پر آنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے لیکن غریبوں کے ووٹ سے کامیاب ہونے والے سیاستدان بلڈرس سے مل کر انہیں مسکینوں کا جہاں پھونک دیتے ہیں۔ یہ تو شہروں کی حالت زار ہے گاؤں کی حالت تو اور بھی بیکار ہے۔

ایک مطالعاتی جائزے کے مطابق بھارت کی آٹھ ریاستوں میں رہنے والے غریب افراد کی تعداد سب صحارہ افریقہ کے غریب ترین ۲۶ ممالک سے زیادہ ہے۔ اس رپورٹ میں جنوبی ایشیائی اور افریقی ممالک میں غربت کا موازنہ کیا گیا ہے۔ مطالعاتی جائزے میں غربت کی پیمائش کے لیے صحت، تعلیم، پینے کے صاف پانی تک رسائی اور بجلی کی دستیابی جیسے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ آکسفورڈ پاورٹی اینڈ ہیومن ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر سبینا الکائرے اس مطالعاتی جائزے کی شریک مصنف ہیں۔ ان کے مطابق سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ ایک ارب ۷۰ کروڑ کی آبادی کے علاقے جنوبی ایشیا میں تقریباً ۵۱ فی صد افراد غربت کے دائرے میں آتے ہیں۔ افریقی ممالک سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ دنیا کے تقریباً ایک چوتھائی غریب براعظم افریقہ میں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ افریقہ کے ۲۶ غریب ترین ملکوں سے بھارت کا موازنہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس ملک میں بھی عوام اسی قدر غربت اور محرومی کا شکار ہیں جتنا کہ افریقہ کے۔ بلکہ بھارت میں غربت کی شدت افریقی ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہ پہلو بہت چونکا دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن کسانوں کی خودکشی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں گزشتہ ۱۳ سالوں میں تقریباً دو لاکھ کسانوں نے خودکشی کی گویا ہر آدھے گھنٹے میں ایک سانحہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

قانون کی بالادستی پر ہم ہندوستانیوں کو بڑا فخر ہے مگر بابری مسجد کے مقدمہ میں عدلیہ نے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کر کے اپنا اصلی چہرہ دکھلا دیا۔ وہ زخم ابھی بھرا بھی نہیں تھا کہ گودھرا کا فیصلہ آ گیا۔ گودھرا میں پہلے ٹرین جلی پھر اس کا بہانہ بنا کر ریاست بھر کے مسلمانوں کو آگ میں جھونک دیا گیا اور اب عدالت کے فیصلے نے دستور کے تقدس کو جلا کر راکھ کر دیا۔ سابرمتی ایکسپریس میں آگ کیسے لگی؟ اور کیوں لگی؟ اس سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ اس آگ میں صرف ۵۹ افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے جواب میں ۹۴ افراد کو گرفتار کر کے ۹ سال تک جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اس ساری سازش کے سرغنہ کے ملزم مولانا عمرجی سمیت ۶۳ افراد کے ساتھ رہا کر دیا گیا اور ۳۱ کو سزا سنائی گئی اور سزا بھی ایسی کہ ۱۰ کو پھانسی اور ۲۱ کو عمر قید۔ گویا بابری سے لیکر گودھرا تک ہر جگہ دو تہائی اور ایک تہائی کا فارمولا چلتا رہا۔ مسجد کی زمین تین حصوں میں تقسیم ہوئی دو تہائی ہندوں کو اور ایک تہائی مسلمانوں کو۔ یہاں دو تہائی رہا ایک تہائی کو سزا۔ سزا میں دو تہائی کو عمر قید اور ایک تہائی کو پھانسی۔ کیا یہ سب محض اتفاق ہے؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ جن بے گناہوں کو نو سال تک قید و بند کی

مشقت برداشت کرنی پڑی اسکے لئے قصوروار کون ہے؟ اور اسکو کون سزا دے گا؟ اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے جن لوگوں کو گواہی پر یہ سزا سنائی گئی وہ کون لوگ ہیں؟ وشواھندو پریشد کے ۹ گواہوں سے متعلق خود جج پی آر پٹیل نے اعتراف کیا کہ وہ سب جھوٹے ہیں؟ پٹیل کے مطابق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پلیٹ فارم پر کارسیوکوں کی خدمت کررہے تھے جبکہ ان میں سے کسی کے پاس پلیٹ فارم ٹکٹ نہیں تھا؟ ان کا تعلق سندھی سماج سے ہے جو مسلمانوں کے تجارتی حریف ہیں۔ وہ لوگ اس بات کا جواب بھی نہ دے سکے کہ ان کو گاڑی کے تاخیر سے آنے کی اطلاع کیسے ملی؟ نیز ان سب پر آتشزنی کے بعد فساد کے دوران قتل وغارتگری میں ملوث ہونے کے سنگین الزامات ہیں۔ اسکے باوجود ان کی کہانی پر گودھرا میں معصوموں کو سزا سنادی گئی تاکہ اس کی مدد سے نریندر مودی آئندہ انتخاب جیت سکے۔ اس معاملے کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ ۵۹ لوگوں کو ہلاک کرنے کے الزام میں ۳۱ مسلمانوں کو سنگین سزا جبکہ تقریباً ۲۰۰۰ مسلمانوں کو شہید کرنے والے ہندوؤں کو کوئی سزا نہیں۔ حالانکہ فسادات میں حصہ لینے والے ہندو رہنما تہلکہ جریدے کے کیمرے کے سامنے اپنے جرائم کا ڈھٹائی کے ساتھ اعتراف بھی کرچکے ہیں۔

ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں پر مظالم مولانا وستانوی کے چہیتے مودی ہی کے راج میں ہوتے ہوں ایسا نہیں ہے۔ اس سے پہلے مہاراشٹر میں فسادات کے دوران ۱۰۰۰ مسلمانوں کو ہلاک کرنے والے مجرمین کو چھوڑ دیا گیا جبکہ ممبئی بم بلاسٹ جس میں ۳۵۰ ہندو ہلاک ہوئے تھے اس الزام میں کئی معصوم مسلمان گزشتہ دس سالوں سے جیل کی چکی پیس رہے ہیں۔ اسیمانند کے اعتراف جرم کے باوجود مالیگاؤں بلاسٹ میں گرفتار ہونے والے مسلم نوجوانوں کو ہنوز رہائی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ جن لوگوں کو قانون کی یہ ناانصافی نہیں سمجھ میں آتی انہیں چاہیئے کہ ایک بار پھر منوشاستر کا مطالعہ فرمالیں۔ اس ہندو صحیفہ کے مطابق ایک شودر کی جان لینا کسی مینڈک، کوے یا الو کو ہلاک کرنے سے کم سنگین جرم ہے کسی کتے یا بلی کو مارنے کی سزا شودر کو مارنے کے برابر ہے۔ شودر کو براہمن کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جہاں تک قانون کی نظر میں عدم مساوات کا تعلق ہے منوسمرتی کہتی ہے کہ اگر کوئی کشتریہ براہمن کو گالی دے تو اسے ۱۰۰ اشرفی جرمانہ اگر ویشیہ دے تو ۲۰۰ اشرفی لیکن اگر شودر ایسی جرأت کربیٹھے تو اسے سزائے موت جبکہ اسکے برخلاف اگر براہمن کسی کشتری سے بدسلوکی کرے تو اسے ۵۰ اشرفی ہرجانہ اور ویشیہ سے کرے ۲۵ اشرفی لیکن اگر شودر کے ساتھ بدسلوکی کی جائے تو سزا گھٹ کر ۱۲ اشرفی ہوجاتی ہے۔ منو کے زمانے میں کم از

کم ۱۲ اراشرفی تو سزا ہوتی لیکن جمہوری ہندوستان میں تو یہ بھی نہیں ہوتا۔

منوشاستر میں جس طرح انسانی معاشرے کو چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا اسی طرح مغرب نے بھی مشرقی ممالک کے حکمرانوں کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے غالباً ان کو یہ ترغیب اپنے کتے پالنے کے شوق سے ملی ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں کتا ایک معیوب جانور سمجھا جاتا مغرب میں ایسا نہیں ہے بلکہ وہ ان کا پسندیدہ پالتو چوپایہ ہے شاید یہ شرف کتے کو اپنی وفاداری کے سبب سے حاصل ہے۔ یہ ایک طرف تو اپنے آقا کے وفادار ہوتے ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے کے غمگسار نہیں ہوتے۔ یہ اپنی گلی میں شیر کی طرح گرجتے اور برستے ہیں اپنے عوام پر مظالم توڑتے ہیں مگر اپنے آقاؤں کے آگے بھیگی بلی کی مانند دم ہلاتے ہیں۔ اہل مغرب اپنے باجگزار حکومتوں سے اسی وفاداری کی توقع رکھتے ہیں۔ ان چار قسموں میں ایک تو آوارہ کتے ہوتے ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ان کے باعث نا کسی کا کوئی خاص فائدہ اور نہ کسی کو کوئی خطرہ۔ وہ یونہی سڑکوں اور راستوں پر زبان لٹکائے پھرتے رہتے ہیں۔ کھانے اور سونے کے علاوہ اپنی نسل کو باقی رکھنا یہی ان کی زندگی کے مقاصد ہوتے ہیں۔ عاشقوں کی طرح راتوں کو جاگنا اور کبھی دل کرے تو شعر و نغمہ انکی تفریح کا سامان ہوتا ہے۔ ہندو پاک اور ان جیسے بے ضرر ممالک اسی زمرے میں آتے ہیں۔ دوسری قسم پالتو نمائشی کتوں کی ہے جن کو وہ لوگ بہت عزیز رکھتے ہیں بلکہ ان کی خاطر جس طرح میاں بیوی میں طلاق کی نوبت آجاتی اسی طرح ان ممالک کے رشتے بھی دیگر ممالک سے بگڑ جاتے ہیں ان میں تیونس، فلسطین کا مغربی کنارہ اور یمن جیسے ممالک شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تیسری قسم شکاری کتوں کی ہے مثلاً اسرائیل، مصر یا جنوبی کوریا ان کے ذریعہ وہ لوگ اپنے دشمنوں کو ڈرانے دھمکانے کا بلکہ کاٹ کھانے کا کام لیتے ہیں اور آخری قسم پاگل کتے کی ہے مثلاً کرنل معمر قذافی جو اپنی اس عوام کو کاٹ کھانے کے لئے دوڑتا پھر رہا ہے جس نے اس احمق کو برسوں تک اپنا خون جگر پلا کر تندرست و توانا کیا لیکن اب وہ پوری طرح سے باؤلا ہو چکا ہے۔ اس لئے اس سے کسی قسم کی دانشمندی تو کجا احسانمندی کی بھی توقع ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ یوسف القرضاوی جیسے نرم مزاج عالم دین کو اس کے قتل کا فتویٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا اور انہوں نے صاف طور پر فرما دیا کہ جس فوجی کو بھی موقع میسر آجائے بلکہ اگر کسی شہری کو بھی موقع ملے تو وہ قذافی کا کام تمام کر دے۔ اس شخص نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے کتے کی عبرت ناک موت کا انتخاب کر لیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب طرابلس کی سڑکوں پر اس کی بے گور و کفن لاش پڑی ہوئی ہوگی اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہوگا۔ جس وقت سے

عبرتناک منظر ٹی وی کے پردے پر دکھلایا جارہا ہوگا پس پردہ کرنل معمر قذافی کے ۲۰۰۹ء میں قطر کے اندر دیئے گئے بیان کے الفاظ گونج رہے ہوں گے "میں عالمی رہنما ہوں، عربوں کا سفید ریشں بزرگ قائد، افریقی بادشاہوں کا شہنشاہ اور مسلمانوں کا امام" اور ناظرین حیرت کررہے ہوں گے کہ کیا وہی شخص ہے جس نے کبھی بزعم خود اپنے بارے میں اس طرح کا بلند بانگ دعویٰ کیا تھا۔

ہندوستان کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ یہاں مصر جیسی کوئی "سمپورن کرانتی" آئے جس کا خواب جے پرکاش نارائن نے ایمرجنسی کے بعد دیکھا تھا اس لئے کہ جب بھی ایسا موقع آئے گا غالب کی مصداق عوام کو انتخابات میں الجھا دیا جائیگا اور کٹھ پتلیوں کے کھیل سے بہلا دیا جائیگا۔ لوگ کرداروں کی تبدیلی کو عظیم انقلاب سمجھ کر مطمئن ہو جائیں گے لیکن اگر فرض کریں کہ عوام کے صبر کا پیمانہ واقعی لبریز ہو جاتا ہے اور بناوٹی تبدیلیوں پر راضی نہیں ہوتے تو اس صورت میں جنوبی ہندوستان کی ریاستیں تیونس بن جائیں گی۔ وہاں کے حکمران بہت جلد اپنی مال و متاع سمیت کرزین العابدین کی طرح رفو چکر ہو جائیں گے۔ شمالی ہندوستان کے حکمران آسانی سے نہیں مانیں گے بلکہ حسنی مبارک کی طرح مزاحمت کریں گے لیکن بالآخر انہیں بھی پسپا ہو کر اقتدار چھوڑنا پڑے گا۔ وسطی ہندوستان یعنی گجرات، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، بہار، اڑیسہ اور بنگال کی صورتحال نہایت نازک ہوگی۔ ان ریاستوں میں بنگال کو چھوڑ کر سارے مقامات پر بی جے پی حالیہ یا سابقہ حکومتیں ہیں۔ بنگال کے کمیونسٹ بھی سفاکی میں کسی طور بی جے پی سے کم نہیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان علاقوں میں نکسلوادی نہ صرف مسلح بلکہ سرگرم بھی ہیں اس لئے ممکن ہے وسطی ہندوستان لیبیا جیسی خانہ جنگی کا شکار ہو جائے۔ ویسے مستقبل میں کیا ہوگا اور کیا نہیں یہ تو کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا بقول علامہ اقبالؒ۔

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

# میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

(قسط اول)

''تمہیں زندہ رہنے کا استحقاق حاصل نہیں ہے کیونکہ تم قذافی کے دشمن ہو''۔ اس جملے کے ساتھ ۱۹۹۶ء میں لیبیا کے پولس اہلکاروں نے سالم جدران کو بن غازی سے قریب اجدابیہ شہر سے گرفتار کیا تھا۔ سالم کرنل سید جدران کے ان پانچ بیٹوں میں سے ایک تھا جنہیں ۶ سال قبل گرفتار کر کے ایسے نامعلوم مقامات پر پہنچا دیا گیا جہاں کوئی پرندہ بھی بلا اجازت قذافی پر نہیں مار سکتا تھا۔ لیبیا کے رہنے والے جدران برادران اور ان جیسے ہزاروں نوجوانوں کا قصور اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا کہ وہ دین دار مسلمان تھے۔ ان لوگوں نے اپنی اس جہادی روایت کو برقرار رکھا ہوا تھا جس نے خلافت عثمانیہ کا دفاع کیا۔ ان لوگوں نے لیبیا پر قائم ہونے والے اطالوی تسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ یہ لوگ افغانستان اور عراق کے جہاد میں بھی شریک ہوئے نیز اپنے ملک لیبیا سے آمریت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ ان کا تعلق لیبیا کے اسلامی مزاحمتی گروہ سے تھا اور یہ اخوان المسلمون سے متاثر تھے۔ ایسے میں جبکہ جدران قبیلے کے لوگ اپنے نونہالوں کی رہائی سے پوری طرح مایوس چکے تھے پھر ایک بار قذافی کے خلاف اٹھنے والی مزاحمت نے زور پکڑا۔ اس دوران سید جدران کو انتظامیہ کا پیغام موصول ہوا: ''ہم تمہارے بیٹے تمہیں لوٹا دیں گے بشرطیکہ تم خاموش بیٹھے رہو (گویا مزاحمت میں حصہ نہ لو)۔'' لیکن قید و بند کی صعوبتیں جن کے حوصلے پست کرنے میں ناکام رہی تھیں وہ بھلا احسان کے اس دام میں کیونکر گرفتار ہوتے۔ اجدابیہ کے حریت پسند عوام نے انتظامیہ کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور کہا جب تک سارے قیدی آزاد نہیں ہو جاتے اس وقت تک کوئی گفت و شنید نہیں ہوگی۔ ۱۷ فروری کو جب اجدابیہ میں ہونے والے حکومت مخالف مظاہرے پر قذافی کی حامی فوجوں

نے حملہ کر کے تین افراد کو شہید کر دیا تو اس کے جواب میں سارے شہر سے سرکاری اہلکاروں کو نکال باہر کیا گیا اور یہ شہر قذافی کے چنگل سے آزاد ہو گیا اس طرح جدران برادران سمیت سارے قیدی رہا ہو گئے اور عامر عثمانی کا یہ شعر پھر ایک بار زندہ و تابندہ ہو گیا۔

کہیں سماعت شکن دھماکے، فضا میں حل ہو کے رہ گئے ہیں
کہیں حوادث کی تند آندھی نئے شگوفے کھلا رہی ہے

اجدابیہ میں برپا ہونے والا یہ انقلابِ زمانہ کوئی بالکل نئی اور انوکھی واردات نہیں ہے۔ انسانی تاریخ دراصل تغیر اور تسلسل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے انگریزی میں اسے چینج وتھ کنٹی نیوئی (change with continuity) کہا جاتا ہے۔ عالمِ انسانیت گویا ایک خلائی جہاز میں وقت کے افق پر روزِ ازل تا ابد رواں دواں ہے حالانکہ اس قدیم و عظیم رتھ کے دونوں پہیے تغیر و تسلسل ایک دوسرے کے مخالف سمتوں میں گھومتے ہیں اس کے باوجود سفر آگے ہی آگے کا ہوتا ہے۔ اصحاب بصیرت اس سفر کی رنگینیوں میں محو نہیں ہوتے بلکہ وہ مستقبل کے خواب سجاتے ہیں اور مشیت ایزدی ان کی اس جسارت پر خوش ہو کر ان کی نگاہوں کو عالمِ غیب کے جلوے دکھلاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں علامہ اقبال اس کیفیت میں کیا فرماتے ہیں۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

جس زمانے میں اقبال نے مسجد قرطبہ کا سفر کیا تھا وہ تقریباً سو سال پرانی بات ہے اور اس وقت امت مسلمہ اپنے تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی زوال کی انتہائی سرحدیں عبور کر چکی تھی۔ یاس و ناامیدی کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ عروج و سربلندی محض خواب و خیال بن کر رہ گیا تھا۔ دنیا کے نقشے پر عالم اسلام ایک کھیل تماشے کی چیز بن گیا تھا۔ مغربی طاقتیں مل بیٹھ کر کچھ خطوط کھینچ دیتی تھیں تو نئے ممالک وجود میں آجاتے تھے کچھ نام لکھ دئیے جاتے تھے جو سربراہ مملکت کہلاتے تھے اور پھر وہ ان ممالک کو سربراہان سمیت آپس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور ایسا کرتے وقت وہاں کے عوام تو کجا ان کے نام نہاد امراء و سلاطین تک کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ ایسی دگرگوں صورتحال مندرجہ ذیل راز جستی وہی بیان کر سکتا ہے جس کی نگاہوں میں آنے والی سحر کے مناظر کو بے حجاب کر دیا گیا ہو۔

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

آج کل ہم جو انقلاب زمانہ دیکھ رہے ہیں وہ دراصل گزشتہ صدی میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کا تسلسل ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز جنگ عظیم کی تیاری سے ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں کسے شکست ہوئی اور کون فاتح رہا اس سے قطع نظر جس نے سب سے زیادہ خسارہ اٹھایا وہ مسلمان تھے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ جنگ عظیم کے دونوں فریقوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی اور تاریخ نے اس بات کو ثابت کر دیا وہ تمام حریف آگے چل کر مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہی امت کی شکست وریخت کی سب سے بڑی علامت تھی ۔ دوسری جنگ عظیم کے آتے آتے مسلمان اس قدر تقسیم ہو چکے تھے کہ اقوام عالم کے نزدیک ان کی کوئی وقعت وحیثیت باقی نہیں بچی تھی اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب نے قلب اسلام میں اسرائیل نام کا خنجر پیوست کر دیا۔ اسرائیل کے توسط سے مغرب نے مسلمانوں کو میدان جنگ میں یکے بعد دیگرے دو مرتبہ شکست سے دو چار کر کے اپنی جنگی برتری کا لوہا منوالیا۔ بقول عامر عثمانی صورتحال یوں تھی ۔

فضا میں ہر سو تنے ہوئے ہیں، دھوئیں کے تاریک شامیانے
زمیں پہ جنگ وجدل کی دیوی، بساط ماتم بچھا رہی ہے

فلسطینیوں کے ساتھ مظالم کا بازار گرم کر کے مسلمانوں کے اندر مجبوری و بے چارگی کا ایسا شدید احساس پیدا کیا گیا کہ وہ کبھی بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کریں ان پر اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ تم خود اپنی سرزمین پر بھی آزاد و خودمختار نہیں ہو۔ فلسطینیوں کو نہ صرف اپنے گھروں سے نکل کر پڑوسی ممالک کے مہاجرین کیمپوں میں رہنے کے لئے مجبور کیا گیا بلکہ ان کیمپوں پر بھی بمباری کر کے معصوم عوام کو شہید کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیا گیا اور اس سفاکی کے جواب میں مسلم ممالک زبانی جمع خرچ سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام نہ کر سکے۔ پہلے اردن سے فلسطینیوں کی بیخ کنی کی گئی۔ پھر تیونس سے انہیں اکھاڑ پھینکا گیا اور بالآخر غزہ کو ایک قید خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ غزہ کے عوام فی الحال ان حقوق سے بھی محروم ہیں جو سزا یافتہ قیدیوں کو جیل کی چہار دیواری کے اندر حاصل ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی سیاسی شکست تھی۔ سفارتی سطح پر مسلم حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر انہیں اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور کیا گیا اس طرح مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ حربی، سیاسی، سماجی اور سفارتی میدان میں جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں مسلم حکمرانوں نے قبلۂ اول کی بازیابی کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔ گویا خلافت عثمانیہ کے بعد نصف صدی

مسلمانوں کے شکست وریخت کا تاریخی تسلسل تھا لیکن پھر ایک بار تغیر کی ہوائیں چلنے لگیں اور پیام اقبال کی گونج سنائی دینے لگی۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

امت مرحومہ نے اپنا احتساب کیا اور قضا کے ہاتھ میں تلوار بن گئی۔ بے جان امت کے اندر اسلام کی روح بیدار ہوگئی اور ایران کے اندر انقلاب کی کشمکش اپنا رنگ دکھلانے لگی۔ شاہِ ایران دراصل مغربی سرمایہ داری کی سب سے طاقتور علامت تھے جسے اسرائیل اور امریکہ دونوں کی پشت پناہی حاصل تھی لیکن ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام کی آندھی کے سامنے شاہ اور اس کے ہمنوا خس و خاشاک کی مانند اڑ گئے گویا لات ومنات کی جوڑی میں سے ایک بت ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اس کے بعد افغانی مسلمانوں نے سوویت یونین کا پنجہ اکھاڑ کر پھینک دیا اور اسے ایسی شکستِ فاش سے دوچار کیا کہ نہ صرف اس کی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں بلکہ اشراکیت کا نظریہ اور سوویت یونین کا سامراج دونوں کا بیک وقت خاتمہ ہوگیا۔ عامر عثمانی کی نظم کا ایک اور شعر افق کی پیشانی پر چمکنے لگا۔

وہ بھیڑیئے جن کے ناخنوں پر لگی ہوئی تھی لہو کی مہندی
مہیب رو، کرگسوں کی ٹولی انہیں کی لاشوں کو کھا رہی ہے

جس وقت ''لاشرقیہ لاغربیہ۔ اسلامیہ اسلامیہ'' کا نعرہ سارے عالم میں گونج رہا تھا اس مرحلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ایران کے اشتراکی بنام مجاہدین خلق، اسلامی مجاہدین کے ہم رکاب تھے اور افغانستان میں مجاہدین اسلام کو مغربی سرمایہ داری کی حمایت حاصل تھی لیکن آگے چل کر ان دونوں نے اپنے چہرے سے خود نقاب نوچ کر پھینک دی۔ ایران کے خلاف چھیڑی گئی جنگ میں صدام حسین کو امریکہ کے ساتھ ساتھ روس کا تعاون حاصل ہوگیا۔ اسی طرح القائدہ کا بہانہ بنا کر امریکہ نے افغانستان میں اپنی مسلم دشمنی کا راز از خود افشا کر دیا اور جب دس سال بعد شکست کے دروازے پر دستک دینے کی نوبت آئی تو روس نے بلاواسطہ اس کی امداد شروع کر دی۔ اسطرح حق کے مقابلے میں باطل کی مصلحت پسندی اور پھر موقع ملتے ہی خنجر زنی بالکل عیاں ہو کر سامنے آگئی لیکن ان بیچاروں کی یہ ابن الوقتی اور باہم اتحاد وتعاون بھی انتشار وافتراق کا شکار امت مسلمہ کا مقابلے میں کسی فیصلہ کن کامیابی کے حصول میں ناکام رہا۔ دور جدید کے ان دونوں نظریات کی حامل سپر پاورس کا یہ حشر ہوگا اس کی توقع کسی نے نہیں کی تھی مگر بقول شاعر۔

چمن کے ہونٹوں پہ ہچکیاں ہیں، دھڑک رہی ہے گلوں کی چھاتی
خزاں کے دامان آستیں میں کلی کلی منہ چھپا رہی ہے

افغانستان اور ایران کے بعد ترکی نے جہاں سے اسلام دشمنی کی ابتدا ہوئی تھی اپنا رنگ بدلنا شروع کیا اور سیاسی سطح پر برپا ہونے والی تبدیلی نے آگے بڑھ کر عدلیہ کو پاک صاف کیا۔ بالآخر فوج کو بھی بے دست و پا کر دیا گیا اور وزارت عظمیٰ نیز کرسی صدارت پر اسلام پسند فائز ہو گئے۔ یہ اسرائیل اور مغرب کے لئے ایک شدید جھٹکا تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ ترکی کی جانب امریکی جہازوں کو اپنی زمین سے اڑنے کی اجازت کا نہیں دیا جانا امر محال سمجھا جاتا تھا اور بھری محفل میں اسرائیلی صدر کو ذلیل کرنے کی بات کوئی سوچ بھی نہیں سکتا لیکن چشم فلک نے یہ نظارے بھی دیکھ لئے۔ افغان، ایران اور ترکی میں برپا ہونے والی تبدیلیاں عجم کے علاقوں تک محدود تھیں جبکہ سرزمین عرب کو مغرب اپنا محفوظ قلعہ خیال کرتا تھا لیکن اب وقت کے دھارے نے اپنا رخ تبدیل کیا۔ ایکطرف حماس کی الفتح پر کامیابی نے یہودیوں کے ایجنٹوں کو شکست سے دوچار کر دیا تھا تو دوسری جانب حزب اللہ نے میدان جنگ میں اسرائیل کو شکست فاش سے دو چار کر کے ساری دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ اسرائیل کو امریکی پشت پناہی کے باوجود ہرانے کی خاطر مسلمانوں کی ایک بے اقتدار تنظیم ہی کافی ہے۔ ۲۰۰۶ء کی جنگ کے بعد امریکہ بہادر کا یہ حال تھا کہ ؎

زمیں پہ اوندھے پڑے ہیں ساغر، اداس و پرنم ہے چشم ساقی
ہوئے ہیں فق میکدے کے چہرے، شراب کو نیند آ رہی ہے

# نگاہِ انساں کو آج فطرت نئے مناظر دکھا رہی ہے

(قسط دوم)

عرب دنیا کے اندر عوامی انقلاب کا آغاز تیونس سے ہوا جو مصر سے ہوتا ہوا اب لیبیا کے دروازے پر دستک دے رہا ہے لیکن یہ معاملہ ان تین ممالک تک محدود ہوتا دکھلائی نہیں دیتا بلکہ اس کی تپش بحرین اور یمن میں کافی تیز دکھائی دے رہی ہے۔ جہاں تک ہلکی آنچ کا تعلق ہے اردن، فلسطین کا مشرقی کنارہ، الجزائر، شام اور سعودی عرب یہ تمام ممالک اس کی لپیٹ میں ہیں۔ اس دوران رونما ہونے والی دو اور تبدیلیاں قابلِ ذکر ہیں ایک تو مسلم دنیا میں ایک نئے مغرب مخالف اتحاد کا قیام اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے میدان میں مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ افغانستان کے بیشتر حصہ پر جہاں طالبانی حکومت عملاً قائم ہے امریکہ کے خلاف برسرِ جنگ ہے پھر ایران ہے اور اسکے آگے عراق وقطر، شمال میں ترکی اور شام، انکے مغرب میں لبنان وغزہ اور شمالی افریقہ میں مصر، سوڈان اور تیونس۔ ان ممالک نے چہار جانب سے اسرائیل کو اپنے درمیان اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اب وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہے حالت یہ ہے کہ جن کے دلوں میں اسرائیل کے لئے نرم گوشہ ہے وہ بھی اب اس کا اظہار کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اب وہ زمانے لد گئے جب نام نہاد مسلم رہنماؤں کی صیہونیوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی تصاویر اخبارات کی زینت بنا کرتی تھیں۔ اسلامی دنیا کی یہ نئی پیش بندی دراصل امریکی رسوخ کے بلادِ اسلامیہ سے مکمل خاتمہ کا پیش خیمہ ہے۔ امریکہ نوازی کے بڑے بڑے سرخیل حرفِ غلط کی مانند مٹائے جا چکے ہیں اور باقی ماندہ پیادے جو کبھی ہوا میں اڑا کرتے تھے اب اپنی راتوں کی نیند گنوا بیٹھے ہیں بقول شاعر ؎

فلک پہ کٹتی تھی جن کی راتیں، وہ منہ کے بل گر کے سو گئے ہیں
جو عیش گاہوں میں سو رہے تھے فضا انہیں گدگدا رہی ہے

اہل مغرب نے مسلمانوں کا جس قدر نقصان اسرائیل کی فوجی پشت پناہی کے ذریعہ کیا اس سے زیادہ نفسیاتی اذیت کا سامان ذرائع ابلاغ کے توسط سے پہونچایا۔ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کی مہم نے مسلمانوں کے حوصلوں کو خوب پست کیا اور ان کے درمیان بے شمار اختلافات کو جنم دیا لیکن پھر الجزیرہ چینل کی آمد نے دنیا کو بتلا دیا کہ آزاد صحافت کس کو کہتے ہیں۔ آج کی تاریخ میں دنیا کا سب سے زیادہ قابل اعتبار چینل الجزیرہ ہے جو ہر طرح کی سرکاری مداخلت سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس نے تمام تر تعذیب وعتاب کے باوجود ہمیشہ ہی ظالموں کے خلاف مظلوموں کا ساتھ دیا یہی وجہ ہے کہ اگر سب سے زیادہ کسی کو قید و بند کی صعوبتوں سے گذرنا پڑتا ہے تو وہ الجزیرہ ہے۔ دوسرے ذرائع مثلاً بی بی سی یا سی این این وغیرہ کو امریکہ بہادر کی مدد سے لگام لگانے کی کامیاب کوشش جابر حکمرانوں نے کی لیکن الجزیرہ پر کسی کا کوئی زور نہ چل سکا۔ الجزیرہ کے صحافیوں نے اپنی مختصر سی مدت میں دلیری و جانبازی کی جو تاریخ رقم کی ہے اس کی مثال پیش کرنے سے مغرب قاصر ہے۔ الجزیرہ کے نامہ نگاروں کا خون عراق سے لیکر لیبیا تک کی سرزمین کو لالہ زار کر چکا ہے اور اس کی برتری کو امریکہ کا نامور میڈیا بھی تسلیم کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ امریکہ نے ذرائع ابلاغ کے میدان میں آزاد و خود مختار صحافت کا جو دعویٰ کیا تھا اب وہ پوری طرح کھوکھلا ثابت ہو چکا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بی بی سی اور سی این این جیسے چینلس پر کوئی اہم خبر سنسر کے بغیر نشر نہیں ہوتی۔ زر پرست یہودیوں کے زیر اثر چلائے جانے والے میڈیا میں کبھی بھی ایسا دم خم نہیں ہوگا کہ وہ اپنے مالکان کے تجارتی مفادات کو داؤں پر لگا کر حق بات کہے نیز جذبۂ شہادت سے عاری مغربی نامہ نگار اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر میدان جنگ میں کود جائیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ایسی توقع تو صرف مسلمان ہی سے کی جاسکتی ہے۔ الجزیرہ کی مغربی ذرائع ابلاغ پر برتری کا بنیادی سبب آئین جوانمرداں ہے جس سے مغرب کے اداکار صحافی یکسر محروم ہیں۔

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مسلم دنیا کے حکمرانوں کے موجودہ حالت زار کی بنیادی وجہ انکے فکر و نظر کی بے راہ روی ہے۔ دنیا کی محبت میں یہ نفس کے بندے اپنے رب کو بھول گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ رب

ذوالجلال نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا اور وہ اپنی اصل حیثیت کو بھول گئے اپنی رعایا کو وہ اپنا بندہ اور غلام سمجھنے لگے اور اپنے آپ کو نعوذ باللہ محکوموں کا آقا۔ ایسے لوگوں کی تنبیہ سورہ آل عمران میں اس طرح کی گئی کہ ''کہو! خدایا ملک کے مالک! تو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔'' گویا اس کائنات کا حقیقی ودائمی اقتدار تو اللہ رب العزت کے ہاتھوں میں ہے انسانوں کو جو مجازی اقتدار دیا جاتا ہے وہ نہ صرف عارضی ہے بلکہ مستعار ہے اور وہ کسی بھی انسان کے پاس اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کہ مالک الملک کی مرضی ہوتی ہے آگے فرمایا ''وہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' ڈھیل دینے اور کھینچ لینے کا مکمل اختیار اسی کے پاس ہے لیکن ساتھ ہی یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ ''تیرے {اللہ} کے ہاتھ میں بھلائی ہے۔'' گویا تمام تر بھلائیوں کا سرچشمہ اللہ کی ذات بابرکات ہی ہے۔ اقتدار سے نوازنے اور اسے چھین لینے کی ہر دو صورت حاکم ومحکوم دونوں کے لئے باعثِ خیر ہے جب ظالم کو ڈھیل دی جاتی ہے تو اسے اپنی اصلاح کا موقع ملتا ہے اور مظلوموں کے درجات کو صبر و ثبات کی منازل سے گذار کر بلند و برتر کیا جاتا ہے اور جب ظالموں کو اقتدار سے بے دخل کر کے نشانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے تو ایسے میں مظلوم شکر واحسان کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی دنیا و آخرت سنوارتے ہیں اس الٹ پھیر کی جو تشبیہ قرآنِ عظیم پیش فرماتا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں

''(وہ) رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔'' (آل عمران ۲۸)

زمانۂ عدل کا ظلم کی کالی رات کے اندر سے نمودار ہو جانا اور عدل کے اجالے پر ناانصافی کے اندھیرے کا چھا جانا انسانی تاریخ کے نشیب وفراز کا جزولاینفک ہے۔ اس آیت میں رزق سے مراد ذرائع ووسائل ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس معاملے میں کسی مداخلت کی مطلق سزاوار نہیں ہے۔ اس حقیقت کی معرفت جن کو حاصل ہوتی ہے وہ اقتدار کو امانت خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کے لئے شہنشاہ کے بجائے خلیفہ کا لقب پسند کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت کی نیابت سے بڑی کوئی اور سعادت ان کے لئے نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جب نادان عوام گمراہ طاغوت کو مالک الملک تسلیم کر لیتے ہیں تو مشیت ایزدی ایک جھٹکے میں ان حاکم ومحکوم دونوں کی غلط فہمی کو دور کر دیتی ہے۔ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہ مکافاتِ عمل جاری ساری ہے۔ اس کی زندہ مثال معمر قذافی کی ہے کہ بیالیس سال تک بلا شرکت غیرے حکومت کرنے والا اور آخری فرد اور گولی تک مقابلہ کی دھمکی

دینے والے بزدل کرنل نے "نوفلائی زون" کی تجویز کے منظور ہوتے ہی چارمنٹ کے اندر جنگ بندی کا اعلان کر دیا نیز طرابلس سے بن غازی تک امن مارچ کی باتیں کرنے لگا۔ اپنے ہم وطن نہتوں پر آگ اگلنے والے طیارے دشمنوں کے آگے دم دبا کر بیٹھ گئے۔ مشیت ایزدی اول تو ان ظالموں کو بے نقاب کرتی ہے اور پھر رسوائی کی گہری کھائی میں انہیں دھکیل دیتی ہے۔ اگر قذافی کو یہ ڈھیل نہ دی جاتی تو اسکے اندر پوشیدہ سفاکی و درندگی کا کسے علم ہوتا؟ وہ تو عوام کی خیر خواہی کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ اس دار فانی سے کوچ کر جاتا۔

اپنے آپ کو مالک الملک سمجھنے والے حکمران اقتدار کے نشے میں چور ہو کر نہ صرف قومی وملی مفادات کو داؤں پر لگا دیتے ہیں بلکہ اپنے ضمیر کو بھی سر بازار نیلام کر دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے ہی عوام کے بنیادی حقوق سلب کرنے سے باز نہیں آتے۔ وہ اپنی ذاتی تجوریوں کو بھرنے کی خاطر اپنے ملک کی رعایا کا جی بھر کے استحصال کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اپنوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں اور ان سے خوف کھانے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نہایت دلچسپ صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جس میں یہ احمق حکمران اپنے دوستوں سے اپنی حفاظت کے لئے اپنے دشمنوں سے رجوع کرتے ہیں اور انہیں دوست بنا لیتے ہیں۔ اس دنیا میں اس شخص سے بڑھ کر نادان کون ہوگا جو دوستوں کو چھوڑ کر دشمنوں پر انحصار کرے اور دشمن تو آخر دشمن ہی ہوتا ہے وہ اس وقت تک پشت پناہی کرتا ہے جب تک کہ اپنے عوام پر ان کا زور چلتا ہے لیکن جب وہ اس سے محروم ہو جاتے ہیں تو دشمن بھی اپنا ہاتھ جھٹک کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ چشم فلک اس حقیقت کا مشاہدہ مصر و تیونس کے گلی کوچوں میں کر چکا ہے اور لیبیا میں کر رہا ہے۔

سورۃ الفجر میں تین ایسی سرکش قوموں کا ذکر کیا گیا جو نہ صرف بے حد طاقتور تھیں اور جنھوں نے زمین میں خوب جی بھر کے فساد پھیلایا اور آخر کار قہر خداوندی کے مستحق ہوئے۔ جب عذاب کا کوڑا ان پر برسا تو ان کا سارا کا سارا جاہ و جلال دھرا کا دھرا رہ گیا۔ فرمایا گیا:

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا (٦) اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ (٧) جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ (٨) اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ (٩) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ (١٠) یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی (١١) اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا (١٢) آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا (١٣) حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے

ہوئے ہے۔ (۱۴)

سرکش قوموں کا انجام بیان کرنے کے بعد ان کے معاشرے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی کا تعلق عقائد یا عبادات سے یا حقوق اللہ سے نہیں بلکہ سبھی کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ گویا اللہ رب العزت یقیناً اپنے حقوق کی پامالی کی سزا روزِ قیامت عطا فرمائے گا لیکن جو اس دنیا میں دیگر بندوں کے حقوق سلب کرے گا اس کو دنیا و آخرت میں دوہری سزا ملے گی۔ فرمانِ خداوندی ہے:

''ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے (۱۵) اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے (۱۶) اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو (۱۷) ور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔ (۱۸)

یہ احکامات بظاہر انفرادی نوعیت کے ہیں لیکن جب کوئی قوم مجموعی طور پر ان عیوب کو اپنا شعار بنا لیتی ہے اور جس معاشرے میں یتیموں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے، مسکین کو کھانا تک نہیں کھلایا جاتا یعنی بنیادی ضروریات سے انہیں محروم کر دیا جاتا ہے۔ میراث کے مال کو تقسیم کرنے کے بجائے اسے سمیٹ کر نگل لیا جاتا ہے وہاں اللہ کا عذاب آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اس عتاب الٰہی کا مستحق کیوں بناتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ جب انسان مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو جاتا ہے تو یہ سب کر گذرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ان آیات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ان میں تیونس سے لے کر لیبیا تک کی صورتحال صاف دکھلائی دیتی ہے۔ مغرب ان معاملات کو سیکولر مسائل گردانتا ہے اس لئے کہ ان کا تصورِ دین ناقص و محدود ہے جو عبادات و عقائد سے آگے نہیں جاتا لیکن اسلام حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی یکساں طور پر اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک یہ مسائل خالص دینی نوعیت کے ہیں۔

تغیر و تسلسل کے حوالے سے اللہ کی سنت اور مشیت کو ذہن نشین کروانے کی خاطر سورہ فجر کی ابتدائی آیات میں تین اشیاء کی قسم کھائی گئی ہے گویا ان تینوں کو گواہ کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک طاق اور جفت اعداد ہیں جو گنتی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اعداد کی یہ دو قسمیں اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ایک قبیل کے اعداد کو دو سے تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے کو نہیں۔ اس اختلاف کے باوجود ترتیب کے لحاظ سے ہر دو طاق اعداد کے درمیان ایک جفت اور ہر دو جفت اعداد کے درمیان ایک طاق آ جاتا ہے یہی انقلاب زمانہ کی گواہی ہے ہر دو عروج کے درمیان

ایک زوال اور دو انحطاط کے درمیان ایک ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دس راتوں کی قسم کھائی گئی جو نہایت معنی خیز علامت ہے۔ قمری ماہ کے اندر چاند کے تین پہر ہوتے ہیں پہلے عشرے میں چاند بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن دوسرے عشرے کا نصف عروج اور نصف زوال کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ آخری عشرہ میں چاند سرعت کے ساتھ رو بہ زوال ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایک رات کے لئے ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل تک ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر کی قوموں اور عظیم ترین سلطنتوں کے ساتھ یہی عمل دوہرایا جاتا رہا ہے۔ عروج سے آغاز پھر درمیان میں استحکام و انجماد اور بالآخر دوبرزوال۔ اس سورہ کو فجر سے منسوب کرنے کے بعد رات کے رخصت ہونے اور صبح کے نمودار ہونے کی قسم کھائی گئی جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہر رات کا مقدر بہر حال ایک حسین صبح ہے۔ ایسا لگتا ہے ایک صدی کی ناکامیوں و نامرادیوں کے بعد اب امت کے ساتھ مشیت کوئی اور ہی معاملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اسی لئے۔

نگاہِ انساں کو آج فطرت نئے مناظر دکھا رہی ہے
حریم ظلمت پہ جتنے پردے پڑے ہوئے تھے اٹھا رہی ہے

اگر یقین نہ آتا ہو تو اپنی ۲ سال بعد حاصل ہونے والی رہائی کے بعد نوجوان ابراہیم جدران کے عزائم ملاحظہ فرمائیں ”عوام کو آزادی و حریت سے ہمکنار کرنے کی ذمہ داری اب ہمارے کندھوں پر ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ ہمارا فرضِ منصبی ہے جس قوم کے نوجوانوں کو اپنے فرض منصبی کا شعور حاصل ہو جائے اور وہ اسے ادا کرنے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جائیں تو اسے کوئی زیر نہیں کر سکتا۔“ ابراہیم کے بھائی مفتاح اس حوالے سے کہتا ہے ”قذافی کی آمریت نے ہمارے سامنے دو متبادل رکھے۔ یا تو وہ ہم پر ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے حکومت کریں گے یا ہمیں قتل کر دیں گے۔ لیبیا کے عوام نے اس کے جواب میں یہ پیغام بھیجا ہے کہ ”ہم اس آزمائش سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہیں۔ ہم ۶۰ لاکھ کی تعداد میں ہیں اور ہم میں سے ۵۰ لاکھ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے پس و پیش نہیں کریں گے تاکہ باقی کے دس لاکھ (یعنی آئندہ نسل) عزت و وقار کی زندگی گذار سکیں۔“ ان ایمان افروز جملوں کو پڑھ کر عامر عثمانی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

جہانِ کہنہ کے بحر و بر میں ہوا ہے برپا کچھ ایسا عالم
سماعتیں ڈگمگا رہی ہیں، نظر کی لو تھرا رہی ہے

# کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے

## (قسط سوم)

لیبیا میں ناٹو کی فوجی کارروائی کا آغاز جس روز ہوا، اتفاق سے وہ عراق میں امریکی جارحیت کی آٹھویں سالگرہ بلکہ برسی کا دن تھا۔ اسی لئے شاید امریکی صدر اوبامہ نے اس حوالے سے اپنے بیان میں عراق کے ذکر سے دانستہ گریز کیا۔ اس تجاہل عارفانہ کی اپنی وجوہات ہیں ورنہ مغرب کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کو خوشنما بنا کر پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہے بلکہ دوسروں کی کامیابیوں کا سہرہ بھی اپنے سر باندھنے سے نہیں چوکتا۔ لیبیا کے معاملے میں امریکہ کا انتہائی محتاط رویہ دودھ کے جلے کا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پینے کے مترادف ہے ورنہ امریکی انتظامیہ اقوام متحدہ کے قرارداد کی پاسداری تو کجا اس کی منظوری کا انتظار بھی نہیں کرتا نیز کسی فوجی اقدام کی کمان دوسروں کے حوالے کرنا امریکہ بہادر کا شعار کبھی نہیں رہا۔ فوجی کمان ناٹو کے حوالے کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا "اس کمان کے منتقل ہو جانے سے امریکی ٹیکس دہندہ کے اخراجات وخطرات میں غیر معمولی کمی واقع ہوگی" صدر اوبامہ کو دو سال کے اندر دوبارہ انتخاب لڑنا ہے بشرطیکہ ان کی پارٹی انہیں دوبارہ اپنا امیدوار نامزد کرے۔ اس لئے ابھی سے اپنے رائے دہندگان کا خیال انہیں ستانے لگا ہے اوبامہ کو پتہ چل چکا ہے کہ اس دگرگوں معاشی صورتحال میں عوام کو جنگ وجدال کے نشہ سے پھسلایا نہیں جا سکتا۔ اوبامہ نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ "ہم دنیا بھر کی فوجداری نہیں کر سکتے الا یہ کہ ہمارے قومی مفادات پر آنچ آئے۔" امریکی فکر وعمل میں آنے والی حالیہ تبدیلی اس کا ایک ثبوت ہے کہ افغانستان اور عراق کے معرکہ میں پے در پے

حاصل ہونے والی ناکامیوں نے مغرور و جابر حکمرانوں کا دماغ درست کر دیا ہے۔ کرنل قذافی کو بزور قوت اقتدار سے بے دخل کرنے میں اتحاد کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے اندیشے کا اظہار امریکی صدر نے کیا۔ لیبیا کے حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرنے کے حوالے سے بھی اوبامہ تذبذب کا شکار نظر آئے ''میں نہ تو اس کو خارج از امکان سمجھتا ہوں اور نہ ہی اس پر فیصلہ کر رہا ہوں ہم اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ قذافی کی افواج آگے چل کر کیا کرنے والی ہیں؟''

ان مدافعانہ کلمات کے پہلو بہ پہلو اوبامہ نے چند متضاد باتیں بھی کہیں مثلاً '' کچھ اقوام دوسرے ممالک میں ہونے والے مظالم سے چشم پوشی کر سکتے ہیں لیکن امریکہ ان سے مختلف ہے۔ ہم ایسی صورتحال میں خاموش تماشائی نہیں بن سکتے جبکہ کوئی ظالم اپنے ہی عوام سے یہ کہے کہ ان کے ساتھ رحم نہیں کیا جائیگا اور اس کی فوجیں معصوم مرد و خواتین کو اپنی درندگی کا نشانہ بنانے لگیں۔ جب اپنی آزادی کی خاطر جدوجہد کرنے والے لوگ خود اپنی ہی حکومت کے ذریعہ ہلاک کئے جانے لگیں تو ہمیں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہوگا۔'' اوبامہ تو کیا کسی بھی سربراہ مملکت کی زبان سے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں بشرطیکہ ان کا اطلاق بلا تفریق ظلم و جبر کیخلاف ہو لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس معاملہ میں بڑی جانبداری برتی جاتی ہے۔ تیونس اور مصر میں انقلاب سے پہلے کہی جانے والی بات بعد والے موقف سے مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح کی تنقید کا نشانہ قذافی کو بنایا جاتا ہے ویسی تنقید بحرین اور یمن کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ خاموشی برتی جاتی ہے جبکہ فلسطین کے حوالے سے علی الاعلان صیہونی ظالموں کی پشت پناہی کی جاتی ہے۔ اس غیر مساویانہ رویہ نے مغرب کی منافقت کا پردہ چاک کر کے اسے لا اعتبار بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ہر مثبت و منفی کارروائی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیبیا کے معاملے میں جب کرنل قذافی پر بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو خود امریکہ اس کی حمایت نہیں کر پاتا اس لئے کہ اس نے بین الاقوامی فوجداری عدالت کو ابھی تک تسلیم کر کے اپنے آپکو اس کا تابع نہیں بنایا شاید اسے اندیشہ ہے کہ اس کے اپنے فوجی جرائم کو بنیاد بنا کر اس پر مقدمہ نہ دائر کر دیا جائے۔

لیبیا میں ہونے والی تاخیر سے بہت سارے لوگ اس لئے پریشان ہیں کہ لیبیا کے زمینی حقائق سے خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے۔ لیبیا کی صورتحال مصر اور تیونس سے مختلف ہے۔ تیونس اور مصر کے آمر دیگر عرب سربراہان مملکت اور مغرب دونوں کے منظور نظر تھے ان کو نہ صرف ہمدردیاں حاصل تھیں بلکہ باہم مشترک مفادات بھی تھے۔ اس لئے ابتدا میں یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ وہاں

انقلاب آئے۔اس کے برخلاف کرنل قذافی نے نہ صرف مغرب بلکہ عرب سربراہوں کو بھی ناراض کر رکھا ہے اور کسی کو اس سے ہمدردی نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ لوگ کشادہ دلی کے ساتھ قذافی کی بے دخلی کے حامی نہیں ہیں جس کی اپنی وجوہات ہیں۔مثلاً عرب سربراہان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر لیبیا کے عوام نے فوج کا مقابلہ کرنے کے بعد کامیابی درج کروالی تو عوام کے دل سے ان کی خوف و دہشت کافور ہو جائیگی اور ان کے اپنے ملک کے عوام کو ایسا غیر معمولی حوصلہ حاصل ہوگا جس پر قابو پانا کسی کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔اس لئے یہ لوگ بیک وقت قذافی کا انجام بد بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے اقتدار میں بنے رہنے کے بھی خواہاں ہیں۔بیک وقت یہ متضاد باتیں ناممکن ہیں۔اسی کے ساتھ بین الاقوامی مداخلت کی حمایت بھی ان کے اپنے لئے مستقبل میں خطرے کی گھنٹی ہے عرب سربراہوں کی پریشانی کا یہ دوسرا سبب ہے لیکن اب جو زمانہ آرہا ہے اس کی بہترین ترجمانی مقبول عامر نے اپنے اس شعر میں کی ہے۔

اب کے نہ کوئی قصر، نہ ایوان بچے گا
اب کے جو چلی ہے وہ ہوا تیز بہت ہے

مغرب کے اندیشے عربوں سے مختلف ہیں۔اہل مغرب کو پتہ ہے کہ کرنل قذافی کو اقتدار سے بے دخل کرنا اس لئے مشکل ہے کہ لیبیا میں اب بھی قبائلی نظام باقی ہے۔فوج کی وفاداریاں چونکہ قبائلی عصبیت کے تحت منقسم ہیں اس لئے فوج مصر یا تیونس کی طرح کا کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔اس لئے مغرب کو لیبیا کے اندر پر امن اقتدار کی منتقلی ممکن نظر نہیں آتی۔یہی وجہ ہے کہ قذافی اور اس کا بیٹا سیف الاسلام علی الاعلان خانہ جنگی کی دھمکی دیتے دکھائی دیتے ہیں ۔اس خانہ جنگی کی پیشگی تیاری کرنل معمر قذافی نے کر رکھی ہے۔گذشتہ ۴۲ سالوں میں مختلف قبائل کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے فن میں قذافی ماہر ہے اس لئے لیبیا کے مقدر کا فیصلہ عوامی مظاہرے سے آگے بڑھ کر میدان جنگ تک پہنچ گیا ہے اور اس صورتحال میں حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرنا ناگریز ہو گیا ہے۔لیبیا کے اندر حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرنے کا تدارک امریکہ کی خارجہ سکریٹری ہیلری کلنٹن لندن میں منعقد ہونے والی چالیس ممالک کی کانفرنس میں کر چکی ہیں لیکن امریکی ایڈمرل جیمس سفطا فریڈس نے سینٹ کے سامنے خفیہ اطلاعات کے حوالہ سے یہ کہہ کر ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی کہ اس اسلحہ کے حزب اللہ اور القائدہ کے ہاتھ لگ جانے کا قوی امکان ہے۔یہ فطری بات ہے کیونکہ مجاہدین آزادی آپس میں کسی غیر فطری تفریق کے قائل نہیں ہو سکتے

۔ایسے میں مغرب اسلحہ فراہم بھی کرنا چاہتا ہے اور نہیں بھی جو بیک وقت ناممکن ہے۔

لیبیا کی مزاحمت کے طول پکڑنے کا سبب وہاں کے قبائلی نظام میں مضمر ہے۔ لیبیا کی مقامی آبادی ۵۰ لاکھ ہے نیز وہاں ۱۵ لاکھ غیر ملکی لوگ بستے ہیں اس طرح جملہ ۶۵ لاکھ۔ مقامی آبادی کی اکثریت عربی بولتی ہے ویسے ایک جدید تحقیق کے مطابق ان میں سے ۹۰ فیصد وہ مقامی بربر ہیں جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد عربی زبان کو بھی اپنالیا اور عرب کہلانے لگے۔ لیبیا میں ویسے تو تقریباً کل ۱۴۰ قبائل ہیں لیکن ان میں سے اکثر کسی نہ کسی بڑے قبیلے کی شاخ ہیں اس طرح جملہ ۳۰ بڑے قبائل ہیں۔ ملک کے مغربی علاقہ میں سب سے بڑا قبیلہ ورفلہ ہے جس کی آبادی ۱۰ لاکھ ہے اور جو ۵۲ ذیلی قبائل پر مشتمل ہے۔ وسیع وعریض ضلع مصراتہ میں یہ لوگ آباد ہیں۔ ان کا تعلق بنی ہلال سے ہے جس نے ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام قائم کیا تھا۔ ان کے علاوہ الزینتان، اولاد بوسیف، مصلعطہ، الرجبان اور مجرابہ وغیرہ دیگر قبائل بھی مغربی لیبیا میں آباد ہیں۔

کرنل قذافی کا تعلق وسطی لیبیا کے شہر صرط میں بسنے والے القذاذفہ قبیلے سے ہے۔ معمر قذافی کے اقتدار میں آنے سے قبل اس قبیلے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ قذافی نے المغراعہ نامی بڑے قبیلے کے ساتھ مل کر شاہ سعید السنوسی کو ۴۲ سال قبل اقتدار سے بے دخل کیا تھا۔ سابق وزیر اعظم عبدالسلام جلود اور لاکربی دھماکے کا ذمہ دار عبدالباسط المغراعی دونوں اسی با اثر قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ الریاح، الحربہ اور الزوائد اس علاقے کے دیگر بڑے قبائل ہیں فی الحال یہی علاقہ متحارب قوتوں کے درمیان میدان کارزار بنا ہوا ہے۔ ملک کے مشرقی حصہ میں جہاں آزادی کی لہر بڑے زور شور سے چل رہی ہے الزاویہ سب سے بااثر قبیلہ ہے جو بن غازی اور اجدابیہ کے آس پاس آباد ہے۔ ان کے علاوہ بنوسلیم ہے جو بنی ہلال کے ساتھ فاطمی دور حکومت میں یہاں آیا تھا لیکن مغرب کے بجائے مشرق میں آبسا۔ مصراتہ نام کا ایک قبیلہ بھی یہاں آباد ہے جو مغرب کے ضلع مصراتہ میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے علاوہ الوقیر، تواجیر، رملہ، کرغلہ اور العبادیات اس علاقے کے دیگر قبائل ہیں۔ قذافی سے بغاوت کر کے حریت پسندوں سے مل جانے والے جنرل سلیمان محمود اور میجر عبدالفتاح یونس کا تعلق العبادی قبیلے سے ہے۔ ایک اور قبیلہ فرجان ہے جو اجدابیہ کے اطراف میں آباد ہے اور اس نے موجودہ کشمکش میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان قبائل کے علاوہ خانہ بدوش بر بر قبیلے مثلاً طوارق جنوبی لیبیا میں آباد ہیں اور ہنوز قذافی کی حمایت کر رہے ہیں۔

کرنل معمر قذافی نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اس قبائلی عصبیت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ

پروان چڑھایا اور آپسی انتشار کے سائے میں اپنے اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا گیا۔ قذافی نے اس منتشر فوج کے ہوائی دستہ کو ہمیشہ ہی اپنے وفادار قبیلے کے پاس رکھا اسی لئے ساری دنیا نے دیکھا کہ لیبیائی ہوائی فوج نے اپنے ہی نہتے عوام پر بے دریغ بمباری کی یہ دراصل قبائلی عصبیت کا شاخسانہ تھا تیز جیسے ہی نو فلائی زون کی تجویز منظور ہوئی اپنے لوگوں کو بچانے کی خاطر آناً فاناً قذافی نے جنگ بندی کا اعلان بھی کر دیا۔ سرکاری فوج کے علاوہ قذافی نے اپنی حفاظت کے لئے تین اور انتظامات کئے ایک تو عوامی ملیشیا کے نام پر ایک مسلح دستہ لیبیا میں موجود ہے جو ملک کے عوام کے بجائے قذافی خاندان کی وفاداری کا دم بھرتا ہے۔ اس کے علاوہ قذافی کے بیٹے خمیس کی اپنی مسلح بریگیڈ ہے جو اس کے علاوہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ کرنل قذافی کا چھوٹا بیٹا تو غنڈوں کی فوج کا سرغنہ ہے لیکن اس کا بڑا بیٹا سیف الاسلام جس نے ٹیلی ویژن پر خانہ جنگی کی دھمکی تھی اور آخری گولی تک لڑنے کے عزم کا اظہار کیا تھا لندن کے مشہور و معروف اسکول آف اکنامکس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکا ہے ویسے یہ حسن اتفاق ہے کہ اس کی تھیسس کا عنوان ''آمرانہ نظام حکومت میں جمہوریت کا فروغ'' تھا۔

اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے تیسرا انتظام قذافی نے یہ کیا تھا کہ غیر ملکی جنگجو بھی مہیا کر رکھے تھے جنہیں عام طور پر مرسینری کہا جاتا ہے، اس دستہ میں بھرتی کا آغاز ویسے تو ۱۹۸۰ء میں ہوا تھا لیکن مصر اور تیونس میں ہونے والی تبدیلیوں کے بعد اس کام میں بڑی تیزی آئی اور سیکڑوں غیر ملکی درندوں کو خود اپنے عوام کے خلاف استعمال کی غرض سے درآمد کیا گیا۔ یہ لوگ چونکہ دولت کی خاطر آئے ہیں اس لئے بلا کسی اخلاقی حدود و قیود کے سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن موجودہ صورتحال میں غیر قانونی باشندوں کی حیثیت یرغمال کی سی ہوگئی ہے۔ جب قذافی کے ہاتھوں میں اقتدار کی ڈور کمزور ہو جائیگی اور ان کی تنخواہ بند ہو جائیگی تب یہ کہاں جائیں گے کوئی نہیں جانتا ۔حریت پسندوں کا کہنا ہے کہ ان پر بین الاقوامی فوجداری عدالت میں مقدمہ چلایا جائیگا۔ قذافی کی جانب سے کئے گئے ان تمام انتظامات کے باوجود لیبیا کی آزادی کے متوالے اس شعر کو گنگناتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں ۔

اب اس کے بعد ترا اور کیا ارادہ ہے

کہ میرا صبر ترے جبر سے زیادہ ہے

لیبیا کی سرزمین سے وہاں کی جہاد آزادی کا آغاز ہوا اور اب اس کی کمان ''قومی

کونسل'' کے ہاتھوں میں ہے اس کا تعلق نہ امریکہ سے ہے اور نہ یورپ سے اس کے رہنما شلابی یا کرزئی کی طرح اوپر سے مسلط نہیں کئے گئے بلکہ عوام میں سے آگے آئے ہیں۔ اس ۳۰ رکنی کونسل میں سے کسی کو غیر ملکیوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنے کا شوق نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ خود لڑیں گے لیکن اس کے لئے یا تو عالمی برادری ہمیں اسلحہ سے لیس کر کے قذافی کی فوج کے ہم پلہ کر دے یا اس کی فوج کو تکنیکی اعتبار سے ہمارے برابر کر دے باقی کام خود کرلیں گے۔ ویسے برطانیہ نے اس بات کا پتہ لگانے کی خاطر کہ ان کو کس قدر مرعوب کیا جا سکتا ہے ان سے برطانوی خاتون پولس اہلکار ایوون فلیچر کے قتل کے ملزم عمر احمد سوڈانی کو حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا لیکن کونسل نے اسے ٹھکرا کر یہ جتلا دیا کہ کوئی ان کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس فیصلے سے کونسل کی خودداری اور عزم و حوصلہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لیبیا سے متعلق جو رابطہ کمیٹی بنائی گئی ہے اس کا آئندہ اجلاس قطر میں ہونے جا رہا ہے۔ اس کمیٹی میں اقوام متحدہ کے علاوہ افریقی اتحاد، عرب لیگ، رابطہ عالم اسلامی (او آئی سی) اور یوروپین یونین شامل ہیں نیز اس بات کا بھی فیصلہ ہوا ہے کہ اس کی صدارت کسی ایک ادارے کے پاس نہیں ہوگی بلکہ مختلف اداروں کے درمیان گردش کرتی رہے گی۔ اس سارے عمل سے اگر بالواسطہ کسی کو دور رکھا گیا ہے تو وہ امریکہ ہے۔ یہ عظیم تبدیلی مجاہدین اسلام کی برسوں کی محنت کا ثمر ہے جس کے عالم اسلام پر دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔ بقول شاعر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ دفعتاً نہیں ہوتا

# تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینیوا

علامہ اقبال کے کچھ اشعار پڑھنے کے بعد نہ جانے کیوں ان کے الہامی ہونے کا گمان گذرتا ہے مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ "سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے" تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ہے جو ان کے کانوں میں کچھ بول رہا ہے اور جو کچھ وہ سن رہے ہیں ہم سے بول رہے ہیں۔ مذکورہ بالا مصرع بھی اسی زمرے کا ہے۔ جس زمانے میں علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا اقوام متحدہ نہیں بلکہ لیگ آف نیشن ہوا کرتی تھی اور اس کا صدر دفتر جینیوا میں واقع تھا۔ دوسری جنگِ عظیم لیگ آف نیشن کو کھا گئی اور پھر جو اقوامِ متحدہ بنی تو امریکہ اس کو اغوا کر کے نیویارک لے گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن یہ بے چاری قسمت کی ماری امریکہ کی زرخرید لونڈی بنی ہوئی ہے۔ امریکہ اور روس دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے باوجود جرمنی کے خلاف اتحاد میں شامل تھے اور پھر ماسکو کو یوروپ کا حصہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اقبال ماسکو کو مشرق کا جینیوا نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ مغرب اپنے غرور و کبر کے باعث مشرق کے کسی جینیوا کا رکن نہیں بنے گا۔ لیکن مغرب کے جینیوا کا متبادل وہ تہران کے علاوہ کسی اور مشرقی شہر کو ضرور بنا سکتے تھے۔ مسلم ممالک میں انقرہ، قاہرہ، یروشلم، بغداد یا لاہور اور دیگر ممالک میں ٹوکیو، بیجنگ، ہانگ کانگ یا دہلی ان میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن آج جب ہم عالمی بساط پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا لگتا تھا کہ نہیں۔ تہران کے علاوہ اور کسی شہر میں جینیوا کا متبادل بننے کا دم خم نہیں پایا جاتا ہے۔ حکیم الامت نے کیا خوب پیشن گوئی کی۔

تہران ہو گر عالم مشرق کا جینیوا<br>
شاید کہ اقوام کی تقدیر بدل جائے

فی الحال اقوامِ متحدہ نے ایران کے خلاف معاشی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور مشرق و مغرب

دونوں جانب سے وہ امریکی افواج کی موجودگی سے گھرا ہوا ہے، شمال میں بیٹھا اسرائیل آئے دن اس پر حملے کے خواب دیکھتا رہتا ہے لیکن وہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا اور جس دن اسرائیل ایسی خودکشی کی جرأت کریگا اس کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائیگا۔ ابھی پچھلے ہفتے امریکی دفاعی سکریٹری یوروپ کو آگاہ کر چکے ہیں کہ اس کے کئی شہر ایران کے میزائلوں کی زد میں ہیں اگر ایسا ہے تو اسرائیل کا ہر شہر ایران کی زد میں ہے ویسے بھی اسرائیل کے غاصبانہ قبضے میں کل شہر ہی کتنے ہیں۔ اس امریکی دھمکی سے قطع نظر ایران کے سیاسی وسفارتی تعلقات پر نظر ڈالیں تو ایک دلچسپ صورتحال دکھلائی دیتی ہے۔ ایران کے پڑوس میں عراق ہے جہاں انخلا کے باوجود اب بھی ایک لاکھ سے زیادہ فوج سبز چھاونیوں میں دبکی بیٹھی ہے اس کے باوجود گزشتہ چار سالوں میں عراقی صدر نوری المالکی نے چار مرتبہ تہران کا دورہ کیا۔ اس بار جب مالکی اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہے تب بھی امریکہ اپنی لاکھ کوشش کے باوجود ایاض علاوی کو وزیر اعظم نہ بنوا سکا اور ۷ ماہ کے سیاسی تعطل کے بعد بالآخر صدر طالبانی نے تمام سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک مصالحت کے بعد المالکی ہی کو حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی۔ یہ بیک وقت امریکہ کی بہت بڑی سفارتی ناکامی اور ایران کی کامیابی ہے۔

دوسری جانب افغانستان میں خود صدر حامد کرزئی نے ایک امریکی جریدے سے بات چیت کے دوران اعتراف کرلیا کہ انہیں ایران سے نقد امداد موصول ہوتی رہی ہے اور حکومت کا کام کاج چلانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ صدر کرزئی کو یہ رقم ان کی فوج کا سربراہ عمر داؤدزئی پہونچایا کرتا تھا۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق یہ شخص تہران میں افغانستان کا سابق سفیر ہوا کرتا تھا اور آجکل حامد کرزئی کو مغرب کے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر امریکہ بہادر اپنے پٹھو کرزئی سے کہہ کر اسے فوج کی سربراہی سے ہٹوا کیوں نہیں دیتا؟ اور اگر صورتحال یہ ہے کہ حامد کرزئی جیسے کمزور اور لاچار رہنما سے ناٹو اپنی بات منوا نہیں سکتا تو اس کے تین ممالک کو حاصل سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کس کام کا ہے؟ امریکیوں کا الزام یہ بھی ہے کہ ایران بیک وقت کرزئی اور مجاہدین کی مدد کرتا ہے تاکہ مجاہدین امریکیوں سے لڑیں اور کرزئی ایرانی مفادات کی حفاظت کرے۔ ناٹو کے امریکی کمانڈر جنرل پیٹرسن نے اس معاملے میں حامد کرزئی کو تنقید کا نشانہ بنایا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ امریکی بھی بلاواسطہ مجاہدین کی مدد کرنے پر مجبور ہیں بلکہ گزشتہ دنوں تو یہ خبر بھی آئی کہ ایک ٹھگ نے اپنے آپ کو مجاہدین کا نمائندہ بنا کر امریکیوں سے لاکھوں ڈالر اینٹھ لئے۔ ویسے امریکی سرمایہ دار بھی تو بیک وقت دونوں متحارب سیاسی جماعتوں کو انتخابی چندہ دیتے ہیں اس میں کون

سی نئی بات ہے؟ ایران کا ایک پڑوسی پاکستان بھی ہے اس نے تمام تر امریکی دباؤ کے باوجود ایران پاک گیس پائپ لائن کا منصوبہ منسوخ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ایران کے جوہری توانائی کے مسئلے کو پابندی کے بجائے گفت وشنید سے حل کرنے کا قائل ہے۔ یہ دراصل امریکہ کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔ انڈونیشیا اور ملیشیا سے بھی ایران کے بہترین سفارتی اور ثقافتی تعلقات ہیں چونکہ یہ دونوں غیر جانبدار تحریک کے اہم ارکان اور ایران بھی اس میں شامل ہے اس لحاظ سے ایران کو ہمیشہ ہی انکی حمایت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ ڈی ۸ نامی مسلم ممالک کے اتحاد میں ایران ان کے ساتھ معاشی اشتراک میں شامل ہے۔ ماضی میں اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل میں انڈونیشیا ایران کے جوہری توانائی کے حق کی حمایت کر چکا ہے گزشتہ سال جب ملیشیا کے نمائندے ارشد منظور نے ایران کے خلاف رائے دی تو اس کی سرزنش کی گئی اور واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد ملیشیا کے نائب وزیر خارجہ کو ہلان پلیئ نے اعلان کیا کہ مبینہ اقدام سرکاری موقف کے خلاف تھا۔ اس سال مشرق بعید کے ان دونوں بڑے مسلم ممالک نے ایران پر پابندیوں کی کھل کر مخالفت کی ہے، اس لئے کہ فی الحال ان کے درمیان وسیع تجارتی معاہدے ہیں اور یہ بات یقینی ہے کہ نام نہاد پابندیوں سے یہ معاشی سرگرمیاں متاثر نہ ہوگی۔

شام تو ہمیشہ سے ایران کا دوست رہا ہے۔ متحدہ عرب امارات سے ایران کے تعلقات کبھی بھی خراب نہیں ہوئے، عمان نے عراق کے ساتھ جنگ کے دوران بھی ایران کی حمایت کی۔ فلسطینیوں کے حقیقی نمائندے حماس کے ایران سے تعلقات جگ ظاہر ہیں۔ لبنان کی حزب اللہ روز اول سے ایران نواز رہی ہے۔ ترکی نے ایران کے ساتھ اپنے تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں کئے بلکہ طیب اردغان کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان تعلقات کے اندر خاصی گرمجوشی آئی ہے۔ اور تو اور ملک عبداللہ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سعودی عرب سے بھی ایران کے تعلقات میں بہتر ہوتے رہے ہیں۔ ملک عبداللہ نے جس گرمجوشی کے ساتھ احمدی نژاد کا استقبال کیا تھا اور خود ان کو اپنے ہمراہ حرم کے اندر لیکر گئے تھے وہ مناظر ہنوز تازہ ہیں۔ اسکے بعد سابق صدر رفسنجانی کی مدد سے جس طرح ملی اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم دنیا سے باہر نکلیں تو کیوبا سے لیکر برازیل تک سارے امریکہ مخالف ممالک ایران کے ساتھ ہیں۔ روس علی الاعلان جوہری منصوبے میں نہ صرف ایران کی مدد کر رہا ہے بلکہ جوہری ایندھن بھی فراہم کر رہا ہے۔ چین کے ساتھ ایران کے بہترین تجارتی تعلقات ہیں۔ شمالی کوریا فطری

طور پر ایران کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال جس طرح صدر احمدی نژاد نے امریکہ کی سرزمین پر اقوام متحدہ کے اندر اور باہر اسلام کی دعوت پیش کی اور صدر بش کو خط لکھ کر جس انداز میں اسلام کا پیغام پہنچایا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ یوروپ اور امریکہ کی شدید مخالفت کے باوجود ایران کی سفارتی و سیاسی اثر و رسوخ کا تقابل کسی بھی مسلم ملک سے کیا جائے تو ایران ہی کا پلہ بھاری دکھلائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی حالیہ پابندیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایرانی صدر احمدی نژاد نے بڑے اعتماد سے کہا اس تجویز کی حیثیت ہمارے نزدیک ایک کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں جسے ہم نے کوڑے دان کی نذر کر دیا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جہاں چند ممبران مستقل طور پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں وہیں کچھ کو باری باری سے عارضی طور پر بھی سلامتی کونسل میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ان عارضی ارکان کو ویٹو کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس بار جب ایران کیخلاف پابندی کی تجویز لائی گئی تو بارہ امریکی باجگذاروں نے اس کی حمایت کر دی لیکن برازیل اور ترکی نے اس عالمی پابندی کی مخالفت کی یہ سب عین توقع کے مطابق تھا لیکن جو بات حیرت انگیز تھی وہ لبنان کا رائے شماری میں حصہ نہ لینا تھا۔ لبنان میں فی الحال سعد حریری وزیر اعظم ہیں۔ انکا سب سے بڑا سیاسی حریف حزب اللہ ہے جسے ایران کا حامی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حریری خاندان کے سعودی عرب کے برسر اقتدار آلِ سعود سے نہایت قریبی تعلقات ہیں۔ مرحوم رفیق حریری کے قائم کردہ تجارتی ادارے سعودی اوجر کا صدر دفتر ریاض میں ہے۔ اس کے باوجود لبنان کا ایران کی مخالفت سے گریز کرنا ایک چونکا دینے والا رویہ تھا۔ لیکن بات یہاں رکی نہیں بلکہ چار ماہ بعد ایرانی صدر احمدی نژاد اپنا شام کا دورہ ختم کرنے کے بعد بیروت پہونچ گئے۔ لبنان میں احمدی نژاد کا غیر معمولی عوامی استقبال ہوا۔ یہ اوبامہ کی مانند کوئی نوٹنکی دورہ نہیں تھا، احمدی نژاد نے سرکاری عہدیداران سے ملاقات کرنے کے بعد کسی لعن طعن کی پرواہ کئے بغیر حزب اللہ کے رہنما حسن نصر اللہ سے نہ صرف ملاقات کی بلکہ ان سرحدی علاقوں کا دورہ بھی کیا جہاں سے چار سال قبل اسرائیل کو ذلیل کر کے کھدیڑ دیا گیا تھا اور وہاں پر کئے جانے والے باز آبادکاری کے کاموں کا معائنہ کیا اور تحسین کی۔

احمدی نژاد کے بعد اس ماہ ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردغان لبنان کے دورے پر بیروت پہنچ گئے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان کے دورے سے بیروت میں دو دھماکے ہوئے اور گزشتہ ماہ استنبول میں بم دھماکہ ہوا۔ جب تک ترکی کے اسرائیل سے خوشگوار تعلقات تھے ترکی میں امن و

امان تھا اور جیسے ان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اب تو بم دھماکے ان کا تعاقب بھی کرنے لگے ہیں، اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اس کے باوجود اردغان نے بانگِ دہل وہ بات کہہ دی جس کا اندیشہ اسرائیل کو پریشان کررہا تھا۔ اردغان نے کہا کہ اسرائیل کیا سمجھتا ہے وہ اپنے جدید ٹینکوں اور بمبار طیاروں کے ساتھ لبنان میں داخل ہو کر یہاں کے ہسپتالوں اور اسکولوں کو تباہ کرے گا اور ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے ایسا نہیں ہو سکتا، آئندہ اگر اسرائیلی درندے غزہ پر فاسفورس بم اور کلسٹر بم برسائیں گے اور معصوم بچوں اور خواتین کو ہلاک کریں گے تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ جائیں گے۔ ہم حتی المقدور تمام ذرائع کا استعمال کر کے عدل و انصاف کا دفاع کریں گے۔

ان دو تاریخی دوروں کے بعد لبنانی صدر سعد حریری نے ایران آنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دورہ نہ صرف مشرقِ وسطیٰ بلکہ بین الاقوامی طاقت کے توازن پر زبردست اثرات مرتب کرسکتا ہے اس لئے کہ اسرائیل سے مقابلہ کرنے والی ایک زبردست طاقت حزب اللہ لبنان میں موجود ہے جو اسرائیل کے خلاف ماضی میں تین بڑی کامیابیاں درج کرواچکی ہے۔ اس دورے کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اقوام متحدہ کی جانب سے مرحوم رفیق حریری کے قتل کی تحقیقات بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہیں جس میں اس بات کا امکان ہے کہ امریکہ کے ایما پر حزب اللہ کو موردِ الزام ٹھہرادیا جائے اور سعد حریری پر حزب اللہ کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جائے۔ ایسی صورت میں لبنان پھر ایک بار زبردست سیاسی خلفشار کا شکار ہو جائیگا اور جو مقاصد اسرائیل اپنی فوجی قوت سے حاصل نہ کرسکا اسے خانہ جنگی کے ذریعہ حاصل کرے گا۔ لیکن سعد حریری اس نازک صورتحال سے نمٹنے کے لئے جو پیش بندی کررہے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ ان پر امریکی کانگریس میں الزام لگایا گیا کہ انہیں سعودی حکومت کی جانب سے امداد حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کا استعمال فوجی مقاصد کے لئے کرتے ہیں اس کے باوجود اس موقع پر انہوں نے سعودی عرب یا امریکہ سے تعاون حاصل کرنے کے بجائے ایران کا رخ کیا۔ اس لئے اول الذکر زبانی جمع خرچ سے آگے جا نہیں سکتا اور موخر الذکر کا علاج بیماری سے بدتر ہوتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اسرائیل کی غزہ پر بمباری کی تحقیقات نتیجہ خیز نہیں ہوتیں فلوٹیلا کے اغوا کی رپورٹ کو ویٹو کر دیا جاتا ہے لیکن رفیق حریری کے قتل کے معاملے میں غیر معمولی دلچسپی دکھلائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس شیخ یٰسین جیسے فرشتہ صفت انسان کو دن دہاڑے شہید کر دیا جاتا ہے اور اس کی سزا تو درکنار تحقیقات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اور تو اور

پاکستان کے صدر مرحوم جنرل ضیاء الحق کے قتل کو اس طرح بھلا دیا جاتا ہے گویا وہ فطری موت تھی، بینظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات بھی اقوام متحدہ کے ذریعہ نہیں کروائی جاتی اس لئے کہ اگر ایسا کیا گیا تو شک کی سوئی خود امریکہ بہادر یا ان کے منظورِ نظر پرویز مشرف کی جانب گھوم جائیگی۔ ایسے میں کسی اور کو موردِ الزام ٹھہرا کر اس کا سیاسی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن لبنان میں اسرائیلی مفادات کا تحفظ کرنے کی خاطر یہ ضروری ہے اس لئے اقوام متحدہ کے پس پردہ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن امریکہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ اب وہ زمانے لد گئے جب وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنی من مانی کر لیا کرتا تھا۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ بین الاقوامی سیاست پر اس کے رسوخ میں زبردست کمی واقع ہو چکی ہے اگر یقین نہ آتا ہو تو کوریا کی حالیہ صورتحال کو دیکھ لیجئے جہاں امریکی و چینی حلیف جنوبی کوریا و شمالی کوریا کے درمیان پنجہ آزمائی جاری ہے۔

گزشتہ ہفتے جنوبی کوریا کے ایک جزیرے پر شمالی کوریا نے بمباری کر دی۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون نے جن کا تعلق جنوبی کوریا سے ہے اسے دونوں ممالک کے درمیان جنگ کے بعد کا تلخ ترین واقعہ قرار دیا ہے۔ امریکی صدر نے کہا ہے کہ اس حملے پر انہیں بہت دُکھ ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کی کمانڈ (یو این سی) نے شمالی کوریا کی پیپلز آرمی کے ساتھ ایک اجلاس طلب کر لیا۔ جس کا مقصد معلومات کا تبادلہ اور کشیدگی میں کمی قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی واقعے کی تفتیش کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ کیا یہ ردعمل کسی سپر پاور کے شایانِ شان ہے؟ جبکہ امریکا جنوبی کوریا کی ہر ممکن مدد اور حملے کی صورت میں دفاع کا اعلان کر چکا ہے۔ لیکن یہ گیدڑ بھبکی بیان بازی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسکے برخلاف چین نے اپنے دیرینہ اتحادی شمالی کوریا کے جنوبی کوریا کے حملے پر محتاط ردعمل ظاہر کرتے ہوئے دونوں ملکوں پر تحمل کا مظاہرہ کرنے پر زور دیا۔

اس سال مارچ میں شمالی کوریا نے مبینہ طور پر جنوبی کوریا کا ایک بحری جنگی جہاز تباہ کر دیا تھا اور اس وقت سے دونوں ممالک کے رشتے کشیدگی کا شکار ہیں۔ چھبیس مارچ کو ہونے والے اس حملے میں جنوبی کوریا کی بحریہ کے چھیالیس اہلکار ہلاک ہوئے تھے اس کے باوجود امریکا شمالی کوریا کا بال بیکا نہ کر سکا، الٹے شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر اپنی سمندری حدود کی خلاف ورزی کا الزام عائد کر دیا۔ شمالی کوریا کے سرکاری ٹی وی پر کہا گیا تھا کہ 'جنوبی کوریا کے کٹھ پتلی عسکری گروہ ہمارے پانیوں میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے اور انہوں نے متعدد اشتعال انگیز حرکات کیں۔ اگر جان بوجھ کر اشتعال انگیز حرکات جاری رکھی گئیں تو شمالی کوریا اپنے پانیوں کی حفاظت کے لیے بھرپور عسکری قوت استعمال

کرے گا اور جنگ چھیڑ دے گا"۔ اس قدر جری موقف اختیار کرنے کے باوجود امریکا کی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی اس لئے کہ چین شمالی کوریا کی سرپرستی کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شمالی کوریا علی الاعلان اپنے جوہری منصوبے پر عمل کرتا جاتا ہے۔ ہنری کسنجر کے زمانے میں امریکہ نے شمالی کوریا کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے کی تجویز پر غور کیا تھا لیکن اب وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس لئے کہ جواباً ممکن ہے چین اپنے فوجیوں کو کوریا کی یونیفارم پہنا کر امریکہ روانہ کر دے اور امریکہ کا بیڑا غرق ہو جائے۔

بین الاقوامی سیاسی شطرنج پر چین اور ہندوستان کا موازنہ کرنے کے لئے حالیہ ایشیائی اور دولتِ مشترکہ کے کھیلوں کا تقابل سودمند ہوگا۔ غلاموں کے درمیان تو ہندوستان نے آقائے محترم برطانیہ کو بھی مات دے دی اور آسٹریلیا کے بعد دوسرے نمبر پر آیا لیکن ایشیائی کھیلوں میں منظر بدل گیا۔ وہاں چین کے بعد کوریا دوسرے مقام پر تھا اور جاپان کے بعد ایران چوتھے مقام پر تھا۔ ہندوستان کو قزاقستان کے بعد چھٹے درجہ پر قناعت کرنا پڑا۔ یہ علامات دنیا بھر میں رونما ہونے والے طاقت کے توازن میں تبدیلی کی نشاندہی کر رہی ہیں اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں۔

اٹھو، وگرنہ حشر بپا ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

# ریمنڈ ڈیوس: ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی

(قسط اول)

''خون کا بدلہ خون'' کسی شخص کا اپنی موت سے قبل ان الفاظ کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور خاص طور پر ایسے میں جب کہ وہ فطری طور پر موت کا شکار نہیں ہو رہا ہو بلکہ خودکشی کر رہا ہو۔ یاس ،مایوسی اور محرومیت کی ساری حدوں سے گذر جانے کے بعد شمیلہ فہیم نے زہر کی شیشی کو اپنے حلق سے نیچے اتار لیا اور ہسپتال میں ڈاکٹروں اور پولس اہلکاروں کے سامنے یہ کہہ کر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی کہ ''جس طرح میرے شوہر کو قتل کر دیا گیا اسی طرح ان کے قاتل کو بھی گولیوں سے بھون دیا جائے۔'' کیا یہ کوئی نامعقول مطالبہ ہے؟ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مناسب سوچ رکھنے والی شمیلہ نے آخر خودکشی کیوں کی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کے خاوند کا قاتل ریمنڈ ڈیوس نہ ہوتا تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا خیال اس کے دل میں کبھی بھی نہ آتا؟ اب سوال یہ بنتا ہے کہ یہ ریمنڈ ڈیوس کون ہے؟ ریمنڈ ڈیوس کی شخصیت بالکل رچرڈ ہیڈلی کی طرح ہے کہ جب جب بھی دیکھو کچھ نہ کچھ نیا نظر آجاتا ہے گویا ندا فاضلی کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے کہ۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ریمنڈ کی خوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو بچانے کے لئے امریکی سفارتخانے سے گاڑی اس قدر حواس باختہ ہو کر دوڑ پڑی کہ اس نے ایک معصوم راہگیر کو کچل کر ہلاک کر دیا۔ اس کو پولس سے چھڑانے کے لئے خود سفیر کارمیلا کونزائی علی الاعلان میدان میں کود گئے۔ اس کی رہائی کے لئے پہلے تو ڈیرل عیسیٰ نامی امریکی رکن پارلیمان نے وزیر اعظم گیلانی اور صدر آصف زرداری سے ملاقات کی

اس کے بعد تین بڑے رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد امریکہ سے اسلام آباد آدھمکا اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سے ملاقات کر کے ڈیوس کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ صدر اوبامہ نے ٹی وی پر اس کی حمایت میں نہ صرف بیان دیا بلکہ اپنے دستِ راست جان کیری کو بنفسِ نفیس پاکستان روانہ کیا واضح رہے کیری نے جارج بش کے خلاف گزشتہ انتخاب لڑا تھا اور فی الحال وہ خارجہ امور کی کمیٹی کے سربراہ ہیں۔ اس تمام اتھل پتھل کے علاوہ ڈیوس کی خاطر ڈرون حملوں کے سلسلہ کو بند کر دیا گیا۔ یہ سارا اہتمام کسی معمولی آدمی کے لئے تو نہیں ہوتا؟ گویا ریمنڈ جو کوئی بھی ہے آدمی بہت خاص ہے اور اپنی حکومت کی جانب سے کسی اہم کام پر مامور ہے۔

اب ایک اور سوال پیدا ہو گیا کہ وہ کون سا اہم کام ہے جو ریمنڈ ڈیوس پاکستان میں کرتا رہا ہے؟ ڈیوس کے حوالے سے جس قدر جوابات تلاش کئے جاتے ہیں اسی قدر نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ امریکیوں کے مطابق ڈیوس کی حراست غیر قانونی ہے اس لئے کہ اسے سفارتی مراعات حاصل ہیں اور پاکستان کو ویانا کنونشن کا لحاظ کرتے ہوئے ڈیوس کو رہا کر دینا چاہئے۔ اس بات پر کچھ اور سوال پیدا ہو جاتے ہیں؟ کہ آخر یہ ویانا کنونشن کس بلا کا نام ہے جس سے قاتلوں کے تحفظ کا اہتمام ہو جاتا ہے؟ نیز کیا سفارتخانے میں کام کرنے والا سارا عملہ بلا تفریق ان مراعات کا حقدار ٹھہرتا ہے؟ ان تحفظات کا دائرہ کار کس قدر وسیع ہے؟ کس صورتحال میں ان کا اطلاق ہوتا ہے اور کب یہ ساکت ہو جاتی ہیں؟ امریکہ نے خود اپنی سرزمین پر ان مراعات کی پاسداری کی کیسی مثالیں قائم کی ہیں؟ گویا ریمنڈ ڈیوس سوالات کا آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا ہے اور اس کی گونج سے سارا عالم دہل گیا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے خود ریمنڈ فی الحال جیل کی سلاخوں کے پیچھے عیش کر رہا ہے اسکے برعکس امریکی انتظامیہ و پاکستانی حکومت ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کا ناٹک کر رہے ہیں عدالت و پولس نے کڑا رخ اختیار کر رکھا ہے۔ عوام کے اندر پائی جانے والی بے چینی میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اور امریکہ مخالف جذبات کے شعلے آسمان کو چھو رہے ہیں اس لئے قوی امکان یہ ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کا معاملہ پاک امریکی تعلقات پر دوررس اثرات کا حامل ہوگا۔

ریمنڈ ڈیوس کو جس وقت عوام نے گرفتار کر لیا اس وقت وہ اپنے پستول سے نہیں بلکہ موبائل کیمرے سے شوٹنگ کر رہا تھا۔ لاہور کے موزنگ علاقے میں جہاں سفارتکار تو کجا امریکی سیاح بھی نہیں پھٹکتے ریمنڈ ڈیوس اس کا تعاقب کرنے والے پاکستانی خفیہ ایجنسی کے دو اہلکاروں کو قتل کر چکا تھا گویا کہ پاکستانی خفیہ ایجنسی کے نزدیک وہ ایک مشتبہ غیر ملکی تھا اور اس کی نقل و حرکت پر نظر

رکھنے کی خاطر انہوں نے اپنے آدمی تعینات کئے تھے، یہ پاکستانی حکام کا حق تھا اور مہلوکین اپنی قومی ذمہ داری ادا کر رہے تھے۔ ریمنڈ نے ان پر اپنی کار کے اندر سے آٹھ گولیاں داغیں اور انکی موت کے بعد بھی گولیاں برساتا رہا۔ اس درندگی کے باوجود نہ اس میں ندامت تھی اور نہ خوف اسی لئے وہ اپنی گاڑی دوڑا کر لاشوں کے قریب لے آیا اور موبائل کیمرے سے تصویر کشی کرنے لگا۔ ایسے میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ اسکو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے اور وہیں حساب چکا دیا جاتا لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو ذرائع ابلاغ میں یہ خبر چھپ جاتی کہ طالبانی دہشت گردوں نے ایک امریکی سفارتکار کو بلا وجہ ہلاک کر دیا جس نے مرتے مرتے اپنے دفاع میں دو دہشت گردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسی کے ساتھ نئے سرے سے ڈرون حملوں کا جواز بھی پیدا ہو جاتا لیکن اس بار قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا سو عوام نے سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے اس درندے کو پولس کے حوالے کر دیا لیکن اب اگر امریکی دباؤ ڈالکر اسے چھڑا لیتے ہیں تو اس کے بعد انہیں پاکستانی عوام سے دستوری پاسداری کی توقع کرنے کا حق نہیں رہے گا لوگوں کا عدالتی نظام پر سے اعتماد اٹھ جائیگا اور وہ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے ایسے میں ممکن ہے امریکیوں کے لئے اپنا قونصل خانہ بند کر کے بھاگنے کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہے اور اگر ایسا ہوا تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔

لیٹن روڈ پولس کے افسر منیر احمد نے عدالت میں جو فرد جرم داخل کی ہے اس کے مطابق یہ قتل اپنے دفاع میں نہیں بلکہ عمداً کیا گیا ہے اس لئے کہ مقتولین کے پاس پائی جانے والی بندوقوں کے اندر گولیاں نہیں تھیں انتظامیہ کے مطابق ملزم تفتیش میں تعاون نہیں کر رہا ہے۔ پولس نے ۴۷ عینی شاہدین کے نام بھی پیش کئے۔ گرفتاری کے وقت ڈیوس کے پاس تین قسم کے شناختی کاغذات تھے جن میں سے ایک کے مطابق وہ پشاور کے امریکی قونصل خانے کا ملازم ہے۔ اس کا پس منظر فوجی ہے اور امریکہ کے نجی ادارے جس کے بارے میں ماہرین کی رائے ہے کہ وہ سی آئی اے کی ایک شاخ سے بھی منسلک رہا ہے۔ اسکے پاس امریکہ کے ویٹیرن افیرس محکمہ کے کارڈ کے علاوہ، محکمہ دفاع کے ایک ٹھیکہ دار کا کارڈ بھی برآمد ہوا جس سے یہ انکشاف ہوا کہ دو لاکھ ڈالر فی سال کی اجرت پر اس کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ امریکی حکام عام طور پر مقامی بدمعاشوں کو حفاظتی کمپنیوں کے ذریعہ اپنی خدمت میں لے کر دنیا بھر میں تخریب کاری کا کام انجام دیتے ہیں۔

ڈیوس کے مطابق اسے ہائی پیرین پروٹیکٹیو کنسلٹنٹ نامی کمپنی کے توسط سے ملازمت پر رکھا گیا جس کا پتہ ۵۱۰۰ نارتھ لین، فلوریڈا ہے۔ اس کے پاس اس کمپنی کا تجارتی کارڈ بھی موجود تھا جب

اس کمپنی کے متعلق تفتیش کی گئی تو پتہ چلا مندرجہ بالا پتہ پر نہ تو ایسی کوئی کمپنی موجود ہے اور نہ ہی کبھی ماضی میں اس کا وجود تھا بلکہ اس نام کی کسی کمپنی کا ریاست فلوریڈا کے سرکاری دفتر میں سرے سے کوئی اندارج ہی نہیں پایا جاتا۔ اس فرضی کمپنی کا ایک ویب سائٹ ضرور موجود ہے جس پر لکھے فون پر کوئی جواب نہیں ملتا۔ امریکی سفارتخانے کے مطابق وہ کاونسلر کے دفتر میں تکنیکی صلاح کار تھا بلکہ لاہور قونصل خانے کا ملازم ہے اور اس کے پاس سفارتی پاسپورٹ ہے۔ یہ بات اپنے آپ اس وقت غلط ثابت ہوگئی جب اس کے پاس عام پاسپورٹ پایا گیا جس پر تاجر کا ویزا لگا ہوا تھا۔

اگر اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ وہ سفارتی دفتر کا ملازم تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ موزنگ کس لئے گیا؟ اور اس نے سفارت خانے کی گاڑی کے بجائے کرائے کی نجی گاڑی کیوں استعمال کی؟ اور اس گاڑی میں تین تین موبائل فون کے علاوہ پستول، دوربین اور دیگر اسلحہ کیوں موجود تھا؟ پاکستانی قانون کے مطابق کسی غیر ملکی تاجر کا اسلحہ لیکر چلنا جرم ہے۔ لیکن خود اپنی دنیا میں مست رہنے والے امریکی صدر براک اوبامہ کو شاید ان حقائق کا علم نہیں ہے یا ہوسکتا ہے وہ بھی احمق بلی کی طرح آنکھ میچ کر دودھ پینے کی غلطی کر رہے ہیں لیکن شطر مرغ والی یہ خوش فہمی انہیں یقیناً مہنگی پڑے گی۔ اوبامہ نے اخبار نویسوں سے کہا کہ ہم اسے چھڑانے کی اپنی کوشش جاری رکھیں گے اور پاکستانی حکومت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ویانا کنونشن کا لحاظ رکھے گی ان کے خیال میں اس تحفظ کے بغیر سفارتکار اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکتے۔ ایسا لگتا ہے کہ صدر براک اوبامہ ایک سفارتکار اور تخریب کار کے درمیان فرق نہیں جانتے یا یہ بھی ممکن ہے چونکہ امریکہ کے سارے سفارتخانے اسی خدمت پر مامور ہوں اس لئے یہ فرق ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو تیس سال قبل اسی الزام میں ایران نے امریکی سفارتخانے کو یرغمال بنا لیا تھا اور ایسے ثبوت پیش کر دیئے تھے جن سے امریکہ کی ساری دنیا میں رسوائی ہوئی تھی لیکن لگتا ہے ان لوگوں نے اپنے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اس حادثہ سے محض دو روز قبل امریکی سفارتخانے نے اپنے اہلکاروں کی ایک فہرست حکومت پاکستان کے حوالے کی تھی اور ان میں ریمنڈ ڈیوس کا نام نہیں تھا لیکن بعد میں ایک ترمیم شدہ فہرست جمع کی گئی اور اس میں ڈیوس کا نام شامل کر دیا گیا۔ اس کے باوجود سنا ہے پاکستانی وزارت خارجہ نے وزارت انصاف کو خط لکھ کر تصدیق کر دی ہے کہ اس قاتل کو سفارتی تحفظ حاصل ہے لیکن ایسا کرنے کی خاطر اس بے غیرت حکومت کو خود اپنے باضمیر وزیر خارجہ شاہ محمد قریشی کی برطرفی کرنی پڑی۔ شاہ محمد قریشی کی برطرفی کے باوجود دفتر خارجہ کے ترجمان عبدالباسط نے ان

کی تائید کر ڈالی اور بالآخر یوسف رضا گیلانی کو اپنے سرکاری اہلکاروں پر دستور زباں بندی نافذ کرنی پڑی۔ شاہ محمد قریشی کے مطابق جو ماہرین ویانا کنونشن کا حوالہ دے رہے ہیں انہیں اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ اس معاملے میں دو علیحدہ شقیں رہنمائی کرتی ہیں۔ اسی کے ساتھ اگر ویانا کنونشن کے ذریعہ کچھ مراعات حاصل ہوتی ہیں تو اسی کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں اور اگر کوئی اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کرے تو وہ اپنے آپ خود کو مراعات سے محروم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ویانا کنونشن کو اگر کوئی قتل و غارتگری کی کھلی چھوٹ سمجھتا ہے تو اس کی بہت بڑی غلطی ہے۔ اس کنونشن میں صاف طور سے اعتراف کیا گیا ہے کہ مراعات کا مقصد کسی فرد کا ذاتی مفاد نہیں بلکہ اس کی اپنی سفارتی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سہولت فراہم کرنا ہے اور سفارتکار کی بنیادی ذمہ داری ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کا فروغ ہے۔ کون ایسا شخص ہوگا جو یہ کہے گا کہ ریمنڈ ڈیوس کی اس بہیمانہ حرکت سے پاکستان اور امریکی تعلقات دوستانہ ہوئے ہیں؟

ویانا کنونشن میں سفارتکاروں کو اس ملک کے قوانین کی پاسداری کی بھی تلقین کی گئی ہے جس میں وہ مقیم ہوتے ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کا اسلحہ کے ساتھ سفر کرنا بذات خود پاکستانی قوانین کی پامالی تھا کجا کہ ان کا بے دریغ استعمال کر کے کسی کو ہلاک کر دینا۔ سفارتکار اور سفارتی افسران کے درمیان بھی ویانا کنونشن کے اندر تفریق کی گئی ہے۔ اس تعریف کے مطابق اسلام آباد قونصل خانے کے سفارتی اہلکار کسی نہ کسی درجے میں ان مراعات کے مستحق ٹھہر سکتے ہیں لیکن لاہور یا پشاور کے ذیلی دفاتر سے متعلق لوگوں کو مذکورہ تحفظات خود اقوام متحدہ فراہم نہیں کرتی جس کی دہائی جاہل لوگ بڑھ چڑھ کر دے رہے ہیں۔ ویسے دستور پاکستان کے مطابق صرف سفارتکاروں کو مراعات حاصل ہیں قونصل خانے میں ملازمت کرنے والے دیگر اہلکار اس سے محروم ہیں۔ پاکستان کے دستور میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ سنگین جرائم کا مرتکب ہونے والے کسی شخص کو کوئی تحفظ حاصل نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ ویانا کنونشن کے اندر بھی استثنائی صورت حال کی وضاحت موجود ہے جس کے مطابق قونصل خانے کے افسران کو گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جائیگا الّا یہ کہ وہ کسی سنگین جرم کا ارتکاب کریں اور اس کا فیصلہ مقامی عدالت کرے گی۔ ریمنڈ ڈیوس نے جو جرم کیا ہے وہ امریکی انتظامیہ کے نزدیک تو غیر سنگین ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی انصاف پسند انسان کے نزدیک نہیں۔ عدالتی نظام میں ماضی کے حوالوں کو مثال بنایا جاتا ہے اس لئے کیوں نہ خود امریکہ ہی کی مثال لی جائے۔ ۱۹۹۷ء میں جارجیا کے ایک سفارتکار کو امریکا کے اندر ۱۶ سالہ لڑکی کے قتل کے جرم میں سزا سنائی جا چکی ہے جبکہ ویانا کنونشن ۱۹۶۲ء سے نافذ ہے اور امریکہ اس قانون کی پاسداری کا سب سے بڑا دعویدار ہے۔

# پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

(دوسری قسط)

ریمنڈ ڈیوس سے متعلق سب سے زیادہ چونکا دینے والا انکشاف امریکہ ہی کے ایک موقر ترین جریدے لانگ وار جرنل نے کیا جس کے مطابق ریمنڈ کا تعلق پاکستان میں ڈرون حملہ کرنے والے دستہ سے ہے اگر اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو اس معمہ کی ساری کڑیاں اپنے آپ مل جاتی ہیں۔ ڈرون حملہ آوروں کا فوج اور سی آئی اے سے متعلق ہونا، سفارتخانے کا اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑنا۔ ان کی شناخت کو صیغۂ راز میں رکھا جانا اور اس کا اپنے نشانوں کی تلاش میں اسلحہ بردار مصروف علاقوں میں جانا اور سفاکی سے قتل و غارتگری میں ملوث ہونا سب کچھ عین حسب فطرت محسوس ہوتا ہے۔ اس سے امریکی حکومت کی سخت گیری اور پاکستانی حکام کی نرمی بھی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریمنڈ ڈیوس عالم سکرات میں مبتلا امریکہ کی بیماری کا نہیں بلکہ محض ایک علامت کا نام ہے جبکہ اصل بیماری ہے امریکہ کی افغان حکمت عملی ہے۔ اس پالیسی کو سمجھنے کے لئے افغانستان کے اندر گزشتہ دس سالوں میں رونما ہونے والے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

۲۰۰۱ء کے اوائل میں طالبان نے افیون کی کاشت پر مکمل پابندی عائد کردی اور اس سے خوش ہو کر امریکی انتظامیہ نے ماہ مئی میں افغانستان کے لئے اضافی ۴۳ ملین ڈالر کی امداد کا اعلان کردیا تا کہ افیون کے ذریعہ ہونے والی آمدنی کے بند ہو جانے سے متوقع نقصان کی بھرپائی ہو سکے۔ اس امداد کو کئی حلقوں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن خارجہ سکریٹری کولن پاویل نے اس پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ ۴۳ ملین گو کہ آج کے حالات میں بہت کم محسوس ہوتے ہیں لیکن اس وقت افغانستان کی مجموعی گھریلو پیداوار کل ۲ بلین تھی اس لحاظ سے یہ مدد ۲۰ فی صد سے

زیادہ تھی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ۱۱ ستمبر کا حملہ ہو گیا جس نے جارج ڈبلیو بش کو جنون میں مبتلا کر دیا۔ اس حملے کے بعد دیئے جانے والے بش کے بیانات اس کی بذیانی کیفیت کی دلیل ہیں۔

بش نے کہا تھا امریکہ فی الحال اپنی تاریخ کے تاریک ترین دور سے گذر رہا ہے۔ طالبان کو فوراً اقدام کرنا ہوگا وہ یا تو دہشت گردوں کو ہمارے حوالے کریں گے ان کے مقدر میں حصہ دار بن جائیں گے۔ ہمارا صدمہ غصہ میں اور غصہ عزم میں بدل چکا ہے۔ ہم دشمن کو کیفر کردار تک پہنچا ئیں گے یا انصاف کو دشمن تک لے جائیں گے۔ ان دھمکیوں میں انصاف سے مراد سزا ہے۔ اس دھمکی کے جواب میں افغانستان کے نائب وزیر اعظم عبدالکبیر نے کہا ہم اسامہ بن لادن کی حوالگی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں بشرطیکہ امریکہ اس کے خلاف ثبوت ہمارے سامنے پیش کرے لیکن اس کے لئے امریکہ کو اپنی موجودہ پالیسی بدلنی ہوگی یعنی بمباری کو بند کرنا ہوگا اس کے بعد ہم لوگ مصالحت کر سکتے ہیں اور پھر اسامہ بن لادن کو مقدمہ کی خاطر کسی تیسرے ملک کے حوالے کرنے پر گفتگو ہو سکتی ہے، اس معقول ترین تجویز کا پر تکبر جواب بش نے یہ دیا کہ جب میں نے کہہ دیا کہ کوئی مصالحت نہیں تو اس کا مطلب ہے کوئی مصالحت نہیں۔ ہمیں پتہ ہے وہ مجرم ہے۔ اسے لوٹا دو اس کی معصومیت یا جرم پر گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس دھمکی کے جواب میں پاکستان کے اندر مقیم افغانی سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے کہا تھا ہم یونہی اسامہ بن لادن کو امریکیوں کے حوالے نہیں کریں گے، ہمارا موقف یہی ہے کہ اس کے خلاف جو ثبوت ہیں انہیں ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم شواہد کی بنیاد پر مقدمہ چلائیں گے یا کسی تیسرے غیر جانبدار ملک میں مقدمہ چلے گا۔ ملا ضعیف نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں ہلاک ہونے والوں کے لئے افسوس کا اظہار کیا لیکن امریکہ کو اس کے جواب میں معصوم شہریوں پر بمباری کرنے سے منع کیا اس لئے کہ ایسا کر کے وہ ساری مسلم دنیا کی ناراضگی مول لے رہا تھا۔ ضعیف نے اقوام متحدہ کے ذریعہ ۱۱ ستمبر کے حملے کی تحقیق کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ہم امریکی حملے کے خلاف اپنے ملک کا دفاع کریں گے، اگر وہ اپنا زور دکھلانا چاہتے ہیں تو ہم بھی تیار ہیں ہم کسی صورت زور و جبر کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے بعد پھر ایک بار نئے سرے سے صلیبی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اپریل ۲۰۰۴ء میں جارج بش نے اعلان کیا کہ طالبان کا خاتمہ کیا جا چکا ہے اور القاعدہ بری طرح مجروح ہو چکی ہے اسی کے ساتھ ہم لوگ دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۴ء ستمبر میں بش نے اعلان کیا کہ امریکی فوج کی بدولت طالبان ناپید ہو چکے ہیں اور

افغانستان کے عوام اب آزاد ہیں لیکن اس طرح کے بلند بانگ دعوی کرنے والا جارج بش آگے چل کر اپنی زبان سے مکر گیا اسے جاتے جاتے دسمبر ۲۰۰۸ء میں کابل کی سرزمین پر اس اعتراف کے لئے مجبور ہونا پڑا کہ "میں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا تھا کہ طالبان کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا چکا ہے"۔

آج جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ نظر آتا ہے جو دس سال قبل کوئی مبصر اپنے آگے نہیں دیکھ سکا تھا زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا عزم کرنے والا انمرود وقت جو تا کھا کر جا چکا لیکن اپنے ناپاک ارادوں میں اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ۲۰۰۸ء کے اواخر میں امریکہ کے سب سے بڑے حلیف برطانوی فوج کے کمانڈر بریگیڈیئر مارک کارلٹن اسمتھ نے اعتراف کر لیا کہ ہم افغانستان کی جنگ نہ جیت سکتے ہیں اور نہ یہ ہمارا مقصد ہے یہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کا سا معاملہ تھا اس نے کہا کہ عوام کو کسی فیصلہ کن فتح کی توقع نہیں کرنی چاہئے بلکہ طالبان کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہو جانا چاہئے اس کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ میں اعتراف شکست کی ایک آندھی آ گئی اور جب اس جنگ کی طوالت نے ویتنام کو پار کر دیا تو خود خارجہ امور کے سربراہ جان کیری نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ محض طاقت کے زور سے کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ جان کیری بذات خود ویتنام کی جنگ میں شریک ہو چکے ہیں آگے چل کر اس بات کو صدر اوبامہ نے بھی دوہرایا۔

براک اوبامہ کو پتہ تھا کہ عراق کے بعد افغانستان سے انخلا کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لئے اقتدار میں آنے کے بعد اوبامہ نے یہ اعلان کیا کہ افغانستان سے فوجی انخلا کا آغاز ۲۰۱۱ء میں ہو جائیگا اور اس کا انتظامیہ اب بھی اپنی بات پر قائم ہے نیز یہ عمل ۲۰۱۴ء تک مکمل ہو جائیگا۔ اقوام متحدہ میں سابق مستقل امریکی نمائندے جان بولٹن کے مطابق اوبامہ کا یہ موقف واضح طور پر اپنی کمزوری کا اظہار ہے اور اس سے طالبان والقاعدہ کے حوصلے بلند ہوئے ہیں اب انہیں تو بس یہ کرنا ہے کہ انخلا کا انتظار کریں گویا اسکے بعد تو انہیں کو غالب آنا ہے۔ عوام کی توجہ اس رسوائی سے دوسری جانب مبذول کرانے کی خاطر اوبامہ انتظامیہ نے اپنا رخ افغانستان سے ہٹا کر پاکستان کے سرحدی علاقوں کی جانب کیا پہلے تو پاکستانی فوج کے ذریعہ سوات میں تباہی مچائی اور اسکے بعد ڈرون حملوں کے سلسلے کا آغاز کر دیا بلکہ ایک مرتبہ باقاعدہ فوج کشی کا بھی ارادہ کر لیا لیکن پھر فوجی رسد کی رکاوٹ نے عقل ٹھکانے لگا دی۔

اس دوران بظاہر تو اوبامہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا تماشہ کرتا رہا لیکن پس پردہ اس نے طالبان سے گفتگو کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور ۲۰۰۹ء میں اسی عبدالسلام ضعیف کو طالبان کی نمائندگی

کرنے کے لئے برطانیہ آنے کی دعوت دی گئی جس نے اعلان کیا تھا کہ ہم دفاع کریں گے اور جور وظلم کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ اس گفت وشنید کے لئے جس کو کسی زمانے میں بش نے پوری طرح مسترد کر دیا تھا جس انداز میں فضا ہموار کی گئی وہ بھی نہایت دلچسپ معاملہ ہے۔ اول تو خارجہ سکریٹری ہیلری کلنٹن نے اعلان کیا کہ افغانستان کا مسئلہ صرف اور صرف سیاسی سطح پر حل ہو سکتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہم طالبان اور القائدہ کے درمیان اختلاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بیان بلا واسطہ اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ساری دنیا کی طاقتیں متحد ہو کر بھی افغانیوں کو جنگ کے میدان میں شکست سے دوچار نہیں کر سکتیں۔ اس کے بعد نائب صدر جوزف بیڈن نے کہا ۷۰ فی صد طالبانی محض ذاتی مفاد کے لئے لڑنے والے جنگجو ہیں اس لئے ان سے لڑنے کے بجائے مصالحت کی جا سکتی ہے اور امریکہ اس طریقہ کار کو آزمانا چاہتا ہے۔ بیڈن کو یہ غلط فہمی ہے کہ ۷۰ فی صد طالبانی دولت کے لئے لڑ رہے ہیں بقیہ ۲۵ فی صد کے بارے میں اسے یقین نہیں ہے کہ وہ اپنے جہاد میں کس قدر سنجیدہ ہیں لیکن اس کے خیال میں ۵ فی صد ضرور ایسے ہیں جن کو شکست دینا ضروری ہے گویا بیڈن نے یہ اعتراف کر لیا کہ وہ صرف ۵ فی صد مجاہدین کو شکست دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ بیڈن نے یہ اعلان کیا کہ بغاوت کے خاتمے کی غرض سے صدر اوبامہ نے بات چیت کا دروازہ کھلا رکھا ہوا ہے۔ اس ساری بیان بازی میں آخری جملے کے علاوہ سب کچھ غلط ہے دراصل اس تلخ سچ کی کڑواہٹ کو چھپانے کی خاطر اوپر میٹھا جھوٹ گھڑا گیا ہے۔

ویسے اب تو افغانستان کے حوالے سے بچہ بچہ یہ جان گیا ہے کہ امریکی طالبان سے براہ راست گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود طالبانی حملوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آ رہی اس لئے کہ مجاہدین جانتے ہیں کہ اپنا دباو بنائے رکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ جس چیز نے امریکہ کو مصالحت کی میز پر آنے کے لئے مجبور کیا ہے وہ انکی شرافت نہیں کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے گزشتہ سال ناٹو نے اپنے سات سو فوجیوں کی ہلاکت کو تسلیم کیا جبکہ ۲۰۰۹ء میں یہ تعداد صرف ۵۰۰ تھی گویا چالیس فی صد کا اضافہ اس سال بھی ماہ جنوری کے اندر مرنے والے ناٹو فوجیوں کی تعداد ۴۸ تھی۔ طالبان اور القائدہ کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کی حکمت عملی اب ایک نئے مسئلہ سے دوچار ہو گئی ہے اسلامی دنیا میں تیونس کے بعد مصر میں ہونے والی تبدیلیوں اور بحرین، یمن، الجزائر اور لیبیا میں ہونے والے مظاہروں سے مغرب کے خیمہ میں کھلبلی مچی ہوئی ہے ایسے میں اگر افغانستان میں بسنے والے القائدہ کے مجاہدین کو منتشر کر دیا جاتا ہے اور وہ ان ملکوں میں لوٹ جاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں

مغربی طاقتوں کی مسلم ممالک سے مکمل بیخ کنی ہو جائیگی اوران کی برسوں کی محنت پر یکلخت پانی پھر جائیگا۔ ملا عمر نے امریکی انتظامیہ کو ۱۹۹۸ء میں پہلی اور آخری بار فون کیا تھا جبکہ بل کلنٹن نے دارالسلام، تنزانیہ اور نیروبی میں امریکی سفارتخانے پر حملے کے بعد افغانستان کے اندر القاعدہ کے ٹھکانوں پر بمباری کی تھی۔ ایک متوسط درجہ کے افسر نے ملا عمر کے فون کو لیا تو انہوں نے اطمینان سے مشورہ دیا اس حرکت کے لئے امریکی کانگریس (پارلیمان) کو چاہئے کہ وہ بل کلنٹن سے استعفی طلب کرے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکی حملوں کا الٹا اثر ہوگا اور نتیجہ میں حملے کم ہونے کے بجائے بڑھ جائیں گے۔ ملا عمر نے اس بات پر زور دیا کہ امریکہ کے لئے یہ ان کا بہترین مشورہ ہے۔ کاش کے امریکی انتظامیہ نے ملا عمر کے اس مشورے پر کان دھرا ہوتا اور اس پر عمل کیا ہوتا تو کم از کم آج اس ہزیمت سے محفوظ رہتے اور امریکہ کے عظیم طاقت ہونے کا بھرم قائم رہتا جو کہ پے در پے شکست کے بعد پاش پاش ہو گیا ہے۔ ملا عمر کی خود اعتمادی کی جھلک ظفر علی خاں کے اس شعر میں نظر آتی ہے۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

# جمہوریت کی سفاک سیاست

اسامہ کی ہلاکت نے ۱۱ ستمبر کی شہرت کو مات دے دی۔ انٹرنیٹ پر اس خبر کو اس طرح اچھالا گیا کہ اس سے متعلق چوبیس گھنٹوں میں ۱۵ کروڑ سے زائد مضامین، اور تبصرے آن لائن ہو گئے جس میں ۷۰ ہزار سے زائد نیوز اسٹوریاں تھیں۔ انٹرنیٹ پر موجود مواد میں پندرہ کروڑ دس لاکھ سے زائد مضامین اور خبریں اسامہ بن لادن کے متعلق ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے اس غبار نے ساری دنیا کے عوام کا دماغ ماؤف کر دیا۔ وقتی طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی لیکن اس غبارے کو سوئی لگانے کا کام بھی اس میں ہوا بھرنے والوں نے خود کر دیا اور شکوک و شبہات کے دباؤ میں یہ اپنے آپ سکڑنے لگا۔ مطلع صاف ہو رہا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ زیادہ دیر چل نہیں پاتا۔ جب دھکا لگنا بند ہوتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور اپنے تضاد کے باعث پکڑا جاتا ہے۔ اس نازک ترین معاملے میں قصر ابیض یعنی وہائٹ ہاؤس کی تضاد بیانی ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلا اختلاف تو اس بات پر رونما ہو گیا کہ یہ حملہ آور ہیلی کاپٹر اڑے کہاں سے تھے؟ اس کے بعد جو ہیلی کاپٹر تباہ ہوا اس کے بارے میں اول تو یہ خبر آئی کہ اسے مار گرایا گیا پھر پتہ چلا کیا وہ میکانکی خرابی کے باعث گر گیا اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ حویلی کا درجہ حرارت برداشت نہ کر سکا اور پھٹ پڑا چونکہ یہ سارے بیانات ایک ہی انتظامیہ کے مختلف ترجمان دے رہے ہیں اس لئے کس کو تسلیم کریں اور کسے مسترد کر دیں یہ پیچیدہ سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ حویلی میں داخلے کے بعد کیا ہوا اسکے متعلق بھی تضاد بیانی دلچسپ ہے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ نام نہاد اسامہ نہتا تھا تو دوسرے صاحب ٹیلی ویژن پر فرماتے ہیں اس نے گولیاں چلائیں، کوئی نہتا تو اسی صورت گولی چلا سکتا ہے جبکہ وہ جادوگر ہو لیکن اس کی گولی سے کوئی نہیں مرتا

۔ایک صاحب کہتے ہیں کہ گرفتاری کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا بلکہ صرف قتل کے احکامات دیئے گئے تھے اس لئے دیکھتے ہی گولی چلادی گئی دوسرے کے مطابق زندہ گرفتار کیا گیا پھر ہلاک کیا گیا۔عربیہ چینل پر حویلی سے گرفتار ہونے والی لڑکی کا یہی بیان نشر ہوا ہے۔اب اگر کوئی مجرم گرفتار ہو گیا تو اس پر مقدمہ چلا کر کیوں نہ اس پر الزام ثابت کیا جائے۔انصاف اس کو نہیں کہتے کہ کسی نہتے آدمی کو اس کی بیوی بچوں کے سامنے گولیوں سے بھون دیا جائے لیکن یہ سب مہذب دنیا کی باتیں ہیں جن کا اطلاق امریکی انتظامیہ پر نہیں ہوتا اور پھر جہاں نہ ملزم ہی حقیقی اور نہ الزام ہی سچا تو انصاف کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوتا ہے؟

ایک ترجمان نے ٹی وی پر بتلایا کہ اسامہ نے اپنی بیوی کو ڈھال بنایا اور اس لئے وہ ہلاک ہوگئی دوسرے نے کہا ایسا نہیں ہوا اس کی بیوی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ جو عورت ہلاک ہوئی وہ بیوی نہیں تھی اور کسی کو ڈھال نہیں بنایا گیا تھا۔ہلاک ہونے والے بیٹے کا نام اول تو خالد بتلایا گیا پھر اس میں اصلاح ہوئی اور وہ حمزہ بن گیا۔اس پر دعویٰ کہ اوبامہ خود ٹیلی ویژن پر براہ راست ہر پل کے مناظر دیکھ رہے تھے لیکن ان کے پاس بیٹھے ہوئے پنٹاگون کے سربراہ نے کہا اندر جانے کے بعد ۲۰ تا ۲۵ منٹ تک اندھیرا چھایا رہا اور ہمیں کچھ بھی پتہ نہ چلا۔کیمرہ سنا ہے فوجی کی ٹوپی میں لگا ہوا تھا لیکن تصویروں کو براہ راست نشر کرنے کے لئے کون سی تکنیک استعمال کی گئی اس کی تفصیل کوئی بھی بتلا نہ سکا۔اب جو تصویریں ظاہر کی گئی ہیں اسکو گارجین نے پرانا کہا ہے ان متضاد باتوں کو پڑھ کر عام قاری اگر کنفیوز ہو جائے تو کیا حیرت کہ وہائٹ ہاؤس کے ترجمان جے کارنی نے بھی اپنے کنفیوز ہونے کا برملا اعتراف کرلیا۔اس خلط مبحث کا سبب یہ ہے کہ جب کئی لوگ بیک وقت جھوٹ بولتے ہیں تو انہیں پتہ نہیں چلتا کہ کون کیا کہہ رہا ہے بلکہ فرد واحد بھی یاد نہیں رکھ پاتا کہ اس نے پہلے کیا کذب بیانی کی تھی اسی طرح جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے اور اس کا تضاد باہر آجاتا ہے۔

اس معاملے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس وقت خبروں کی اس سونامی نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ایک ویب سائٹ ایسی بھی تھی جس کو بزور قوت بند کروا دیا گیا ( گویا ہیک کر لیا گیا) اس سائٹ کا نام ہے "اصل میں کیا ہوا" (یعنی واٹ ریلی ہیپنڈ ) ۔ یہ وقتی پابندی تھی جو دو دن بعد اٹھ گئی اور اب اس کی زیارت کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اسے معتوب کیوں کیا گیا۔اس سائٹ پر برسوں سے ایسا مواد جمع کر کے رکھا گیا جن کے مطابق شیخ اسامہ بن لادن کے فطری موت کی تصدیق ہوتی ہے۔ان خبروں میں امریکی فوجی افسران، نامور اخبارات مثلاً گارجین اور معروف ٹیلی

ویژن چینل جیسے فوکس اور بی بی سی پر نشر ہونے والی خبریں اور انٹرویو موجود ہیں۔ قابل ذکر لوگوں میں محترمہ بے نظیر بھٹو، حامد کرزئی اور پرویز مشرف کے بیانات بھی ہیں۔ مصر سے شائع ہونے والے اخبار کا عربی اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے۔ اگر مغرب کو لا اعتبار اور سیاستدانوں کے بیانات کو ناقابل یقین قرار دے دیا جائے تب بھی پاکستان کے معتبر اور بے باک صحافی چودھری ذبیح اللہ بلگن کی بات کو کیسے مسترد کریں گے جنہیں ایک ٹی وی انٹرویو میں کرنل امام نے تین سال قبل بتلایا کہ وہ خود شیخ اسامہ بن لادن کے جنازے اور تدفین میں شریک ہو چکے ہیں۔ اسامہ کو گردے کا عارضہ تھا وہ تمام تر علاج کے باوجود اس مرض سے صحت یاب نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جسد خاکی کو افغانستان کے ایک گاؤں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر ایبٹ آباد میں مارا جانے والا شخص کون تھا؟ اور اوبامہ نے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟ یہ دو سوالات اہمیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کی بات ہے جس سرعت کے ساتھ امریکیوں نے اس لاش کو سمندر برد کر دیا اس سے اسامہ بن لادن کے اس ہم شکل کی اصل شناخت تو ناممکن ہو گئی ہے۔ امریکی انتظامیہ جس طرح اسامہ بن لادن پر مقدمہ چلا کر کوئی الزام عدالت میں ثابت نہ کر سکا اسی طرح اس لاش کو بھی کسی غیر جانبدار لیب میں بھجوا کر اس امر کی تصدیق نہیں کروا سکا کہ آخر وہ شخص تھا کون؟ نیز آئندہ کے لئے بھی تحقیق و تفتیش کے سارے امکانات کو ختم کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر لاش کے خلیات پاکستان سے امریکہ پہنچ گئے وہاں اسامہ بن لادن کی بہن کے خلیات سے ان کا موازنہ بھی ہو گیا اور پلک جھپکتے اوبامہ نے ٹیلی ویژن پر تصدیق کر دی اور ساری قوم خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس طرح کا چمتکار مسلم دنیا کے کسی پسماندہ ملک میں ہو تو مغرب کی جانب سے ہزار سوال اٹھائے جاتے ہیں لیکن اگر امریکہ میں ہو تو ساری دنیا آنکھ موند کر اس کی تائید و حمایت میں جٹ جاتی ہے اس لئے کہ بقول اوبامہ ہم جو بھی چاہیں جہاں بھی چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اوبامہ کے اس جہان میں افغانستان شامل نہیں ہے اسی لئے ایبٹ آباد آنا پڑا۔ اوبامہ نے جو یہ شعبدہ بازی دکھلائی ہے ایسا امریکی انتظامیہ نے پہلی بار نہیں کیا بلکہ یہ ان کی قدیم روایتوں میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے وقت بھی بلا کسی تحقیق و تفتیش کے جارج بش پر ایک گھنٹے کے اندر انکشاف ہو گیا کہ اس حملے کا ماسٹر مائنڈ اسامہ بن لادن ہے جو افغانستان میں بیٹھا ہوا ہے اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ساری دنیا کے ممالک بے چوں چرا اس کی ہمنوائی کرنے لگے کسی نے نہیں پوچھا کہ آخر آپ کے پاس اس بے بنیاد دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اس لئے وہ ہم شکل کون تھا جسے مار گرایا گیا اس پر

وقت صرف کرنے کے بجائے یہ ڈرامہ کیوں رچایا گیا اس سوال پر توجہ ہونی چاہئے۔

اپنی ناکامیوں کی پردہ پوشی اور مقبولیت میں اضافہ اس مشکل سوال کا آسان جواب ہے۔ جارج بش نے بھی اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی اور افغانستان پر چڑھائی کر دی لیکن جب دو سال تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تو اس کے امکانات بھی معدوم دکھلائی دیئے تو اس نے ایک نرم چارہ عراق کو نشانہ بنایا اور صدام پر عمومی تباہی کے اسلحہ رکھنے کا الزام لگا کر حملہ کر دیا یہ الزام آگے چل کر غلط ثابت ہوا لیکن تب تک وہ اپنا دوسری میقات کا انتخاب جیت چکا تھا۔ امریکی عوام کے گلے سے سربراہ کی ناکامی نہیں اترتی۔ وہ ناکام رہنما کو انتخاب میں نامراد کر دیتے ہیں انہیں بے وقوف بنانے کا سب سے آسان نسخہ "مہم سر ہوگئی" (مشن اکمپلشڈ) کا نعرہ ہے جسے سننے کے بعد امریکی عوام اپنے سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ یہ دراصل رائے دہندگان کا جذباتی استحصال ہے جو ہر انتخاب کے وقت مختلف انداز میں کیا جاتا ہے۔ حقیقی نہ سہی تو مجازی مہم چھیڑ دی جاتی ہے اور پھر اسے سر کر لیا جاتا ہے۔ جارج بش نے صدام کو اقتدار سے دستبردار کرنے کے بعد یہی نعرہ لگایا تھا اور بڑے آرام سے انتخاب جیت گیا اوبامہ نے بھی اسی آزمودہ نسخے کو آزمایا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دو سال قبل جس صدر کی مقبولیت ۶۵ فیصد سے زیادہ تھی اور ناراضگی کا تناسب ۲۰ فی صد سے کم تھا اب وہ معاملہ الٹ پلٹ گیا ہے۔ اقتصادی میدان میں اپنی زبردست ناکامی کے باعث حالیہ ضمنی انتخاب میں ڈیموکریٹس کانگریس میں اپنی اکثریت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ماہ اپریل میں اوبامہ کی مقبولیت گھٹ کر ۴۶ فیصد ہوگئی تھی اور ناراضگی بھی اس کو چھو رہی تھی۔ امریکہ میں صدر کو عوام سے پہلے اپنی پارٹی کے ممبران کی حمایت حاصل کر کے امیدواری حاصل کرنی پڑتی ہے تب جا کر عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی نوبت آتی ہے اور اگر موجود صدر کی مقبولیت میں خاصی کمی آجائے تو پارٹی دوسری میقات کے لئے کسی اور کو اپنا امیدوار نامزد کر دیتی ہے۔ یہی خطرہ اوبامہ کو لاحق ہوگیا تھا کہ مبادہ آئندہ انتخاب میں ہیلری کلنٹن ان سے آگے نہ نکل جائیں اس لئے اس نے یہ جوا کھیلا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مہم میں اوبامہ کی زبان سے " مجھے اطلاع موصول ہوئی تھی"۔ "میں نے بذات خود نگرانی کی"۔ "میں نے حکم دیا" اس طرح کے الفاظ بار بار سننے میں آئے حالانکہ اسامہ بن لادن کے سر پر ۲۵ کروڑ کا انعام تھا اس لئے اس میں صدر کو اس قدر دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں تھی جو کوئی بھی ایسا کرتا وہ انعام کا حقدار ہوتا لیکن سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے صدر صاحب اس مہم

میں جٹ گئے اور بالآخر مہم کے سر ہو جانے کا خوش کن اعلان فرما دیا۔

اوبامہ اپنی اس بازی میں کامیاب ہو گئے ان کی مقبولیت کچھ لوگوں کے مطابق اوسطاً ۵ فی صد تک جا پہنچی ہے ریپبلکنس کے خیمے میں ہلچل مچ گئی ہے اس لئے کہ ری پبلکن رائے دہندگان جو ان سے صرف ۹ فی صد راضی تھے اب ۲۴ فیصد تائید کرنے لگے ہیں گویا ۱۵ فیصد کا اضافہ دشمن کے کیمپ سے یہی وجہ ہے کہ کانگریس میں ریپلکن لیڈر نے اس مہم میں اپنی پارٹی کا حصہ لگاتے ہوئے اعلان کر دیا کہ جس کام کو جارج بش نے شروع کیا تھا اسی کو اوبامہ نے پورا کیا۔ رمسفیلڈ نے بھی ہر ایک کو اس کا حصہ دینے کی بات کی بلکہ ان کے مقابلے انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھنے والی بار برا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس واقعہ کے بعد وہ اوبامہ کے خلاف ریپبلکن پارٹی کی جانب سے انتخاب لڑنے کی غلطی نہیں کر سکتیں۔ عام رائے دہندگان کے اندر بھی ۱۱ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ویسے جمہوریت میں کسی کی موت سے فائدے کا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ راجیو گاندھی کی غیر معمولی کامیابی اندرا گاندھی کے قتل اور اس کے باعث حاصل ہونے والی ہمدردی کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ اگر بینظیر زندہ ہوتیں تو آصف زرداری کے لئے صدارت کا خواب دیکھنا بھی محال تھا لیکن ان دو واقعات سے قطع نظر جہاں ہمدردی کے ووٹ ملے تھے مودی نے مسلمانوں کے قتل عام کی بنیاد پر اپنا پہلا انتخاب جیتا۔ اسی بدلے کی بھاونا جس کا اظہار اوبامہ کرتے ہیں مودی بھی کر رہا تھا۔ بی جے پی کی پہلی ۱۳ دنوں والی حکومت بھی بابری مسجد کی شہادت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ رام مندر کی تحریک اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بے شمار مشابہت موجود ہے۔ جمہوریت کے کھیل میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔

نام نہاد اسامہ بن لادن کی ہلاکت پر اوبامہ کا بیان صرف اور صرف سیاسی جعلسازی ہے جس کے پردے میں وہ افغانستان سے اپنے بے نیل ومرام واپسی کی ناکامی کو ڈھانپنے اور اپنی انتخابی مہم کو سہل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان ویوروپ کے سربراہان کے تبصرے ضمیر فروشی اور ابن الوقتی سے زیادہ کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ سی این این پر اوبامہ کی تائید میں دم ہلاتے ہوئے امریکی صحافی پیٹر برجن نے اعلان کر دیا کہ "یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اختتام ہے" لیکن اس کے برخلاف فوجی تجزیہ کار اور امریکی بریگیڈیر مارگ کیمٹ کا کہنا ہے کہ یہ تحریک کا خاتمہ نہیں ہے، یہ دہشتگردی (نام نہاد) کا خاتمہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک باب کا اختتام ہے۔ اسامہ بن لادن کی گرفتاری وقتل محض ایک علامت سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے کہ وہ برسوں قبل تحریک کی عملی قیادت سے دستبردار ہو چکے تھے۔ القائدہ تنظیم اسامہ بن لادن کی شخصیت سے کہیں زیادہ ہے گو کہ اس کا

تشخص اسامہ ہیں۔ مارک کا بیان حقیقت پسندانہ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک اسامہ حیات تھے کیا وہ ایثار و مزاحمت، صبر و استقامت اور جرأت و شجاعت کی علامت نہیں تھے؟ اگر تھے تو یہ اوصاف حمیدہ مغرب کو یا دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مغرب زدہ دانشوروں کو کیوں نظر نہیں آتے؟

اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ایریل شیرون اور نتن یاہو جیسے ظالم جن کو امن کے پیغامبر دکھلائی دیتے ہیں۔ مصری مبارک اور یمنی صالح جیسے لوگ جن کے منظور نظر ہوں۔ ریمنڈ ڈیوس جیسا سفاک قاتل جن کا سفارتکار ہو اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی معصوم دوشیزہ جن کی نگاہ میں سنگین مجرم ہو تو ایسوں کو اسامہ اور نصر اللہ اگر دہشت گرد نظر نہ آئیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور جو لوگ مغرب کی عینک لگا کر حالات کا تجزیہ کرتے ہیں انہیں بھی وہی سب نظر آتا ہے جو مغرب انہیں باور کراتا ہے۔ ذہنی غلامی اسی کا نام ہے ورنہ اس بات کا ادراک کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد خود امریکہ ہے جس کی عالمی دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹمی بمباری سے ہوا تھا اور قریب ترین نمونہ عراق کی جارحیت ہے جہاں فوج کشی کا آغاز اس دعویٰ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ وہاں عمومی تباہی کے اسلحہ (ویپنس آف ماس ڈیسٹرکشن) موجود ہے۔ اس نامعقول جنگ کے نتیجے میں اب تک تقریباً ۱۵ لاکھ معصوم عراقی جان بحق ہو چکے ہیں۔ ۷ ہزار کے قریب اتحادی فوجی مارے جا چکے ہیں اور بالآخر بش نے یہ کہہ کر اپنا دامن جھٹک لیا کہ خفیہ ایجنسی کی اطلاعات غلط تھیں اور وہاں مذکورہ اسلحہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ جن لوگوں کو اپنی اس عظیم غلطی پر ذرہ برابر ملال نہ ہوا انہیں ہر دہشت گرد بھلا آدمی دکھلائی دیتا ہے اور مزاحمت کار انکی آنکھوں کا کانٹا بن جاتا ہے۔

بزدل اور کوتاہ بین لوگ عام طور سے ظلم کے بجائے اسکے خلاف ہونے والی بغاوت کو باعث فساد سمجھتے ہیں اسی لئے انہیں محمود عباس خوشنما اور حماس بدنما دکھلائی دیتی ہے لیکن مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے نہ کبھی مستکبرین کے جاہ و جلال کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ ان کے باجگزاروں کی جانب سے کی جانے والی لعنت ملامت کی پرواہ کرتے ہیں۔ ان کا طرز حیات نہ تو مجبوری حالات طے کرتے ہیں اور نہ مادی مفادات۔ وہ غیروں کے طفیل جینے کے بجائے خود اپنا جہان آباد کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے روشنی کا مینار بن جاتے ہیں۔ اسامہ بن لادن بھی انہیں میں سے ایک تھے۔

اپنی نوجوانی کے دن اسامہ نے شہزادے کے مانند گزارے۔ وہ اگر چاہتے تو جدہ میں تعمیر

ہونے والی ہزار میٹر اونچی عمارت کے بلند ترین منزل پر اپنا گھر بنا سکتے تھے لیکن جو اپنا گھر جنت میں بناتے ہیں ان کو دنیا کی بلندیاں حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ اسامہ بن لادن نے اقبال کے شاہین کی مصداق قصر سلطانی کے گنبد پر نشیمن بنانے کے بجائے پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر سوویت یونین کی جارحیت کی خبر انہوں نے ریڈیو پر سنی۔ ابتدا میں انہوں نے افغان مجاہدین کا مالی تعاون کیا مگر کچھ عرصے بعد وہ خود اپنی تمام دولت اور ثروت کو چھوڑ کر میدان کارزار کا رخ کیا۔ اسامہ بن لادن نے شیخ عبداللہ عظام اور دیگر مجاہدین کے ساتھ ملکر سوویت فوجیوں کے دانت کھٹے کردیئے۔ جس وقت وہ روسیوں سے برسرپیکار تھے مغرب کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے تھے لیکن جب انہوں نے مغرب کو چیلنج کیا تو وہ دہشت گرد کہلائے جانے لگے حالانکہ ہردو صورت میں ان کی جنگ جارحیت کے خلاف تھی۔

افغانستان میں سوویت یونین کو شکست فاش سے دوچار کرنے کے بعد اسامہ وطن واپس لوٹ گئے۔ صدام حسین کے کویت پر حملہ کا فائدہ اٹھا کر امریکہ نے ایک طرف عراق پر حملہ کردیا تو دوسری طرف وہ سعودی عرب کی سلامتی کو لاحق خطرات کا بہانہ بنا کر مقدس سرزمین میں داخل ہوگیا۔ تاہم اس موقع پر اسامہ بن لادن نے سرزمین حجاز پر امریکی فوجیوں کی آمد کی مخالفت کی اور عراق کے خطرات سے نمٹنے کے لئے اسلامی فورس تشکیل دینے کی تجویز پیش کی یہیں سے اسامہ بن لادن کو امریکہ نے اپنا دشمن بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۹۲ء میں اسامہ کو اپنا وطن چھوڑ کر سوڈان جانا پڑا۔ اسامہ بن لادن نے سرزمین حرمین پر ناپاک امریکی وجود کے خلاف تحریک جاری رکھی اور آخر کار سعودی عرب سے امریکہ کو نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ اسامہ کی دوسری بڑی کامیابی تھی۔ جو لوگ امت کی ساری تباہی کے لئے اسامہ بن لادن کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر امریکی فوج سعودی عرب کو اپنا مستقر نہیں بناتی تو یہ اختلاف ہی رونما نہ ہوتا اور اگر اسامہ اس کے خلاف آواز نہ اٹھاتے تو وہ انخلاء بھی عمل میں نہ آتا۔ اس کے علاوہ عراق سے بھی اس قدر قلیل مدت کے اندر امریکی انخلا میں القائدہ کے کردار کا انکار ممکن نہیں ہے۔ آئندہ ایک سال کے اندر امریکی وہاں سے نکل جائیں گے ورنہ امریکہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر مزاحمت نہ ہو تو اس کی فوجیں کبھی بھی واپس نہیں ہوتیں جاپان کے اندر دوسری جنگ عظیم کے قائم کردہ فوجی مستقر آج بھی موجود ہیں۔ القائدہ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے وطن پرستی کے بت کو مسمار کر کے طاغوت کے مقابلے امت کو جسدِ واحد بنا دیا۔

افغانستان کے خوددار طالبان نے جن کے پاس اسامہ نے ۱۹۹۶ء میں سیاسی پناہ حاصل کی

تھی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور اب یہ جہاد ویتنام کی جنگ سے طویل ہو چکا ہے۔ آج بھی افغانستان کے بڑے حصے پر طالبان کا قبضہ ہے۔ ابھی حال میں ۵۰۰ طالبانی مجاہد جیل توڑ کر فرار ہو گئے اور ناٹو افواج ان کا بال بیکا نہ کر سکی۔ وسط جولائی سے امریکی فوجیوں کے انخلا کا آغاز ہونا ہے جو ۲۰۱۴ء میں مکمل ہو جائیگا۔ اس سبکی پر پردہ ڈالنے کے لئے جعلی اسامہ بن لادن کو ہلاک کر کے اپنی سیاسی روٹی سینکنے کی ایک ناکام کوشش اوبامہ نے ضرور کی ہے لیکن سوڈا واٹر کا یہ ابال کب تک رہے گا یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ انتخاب کو ابھی ڈیڑھ سال کا وقفہ باقی ہے اس وقت تک یہ معاشی ابتری جاری رہی تو اوبامہ کو ایک نیا ناٹک رچانے کی ضرورت پیش آئیگی۔ جارج بش جس اسامہ کا ہوا کھڑا کر کے اپنے عوام کو دہشت زدہ کرتے رہے اور ان کے ووٹ سمیٹتے رہے اوبامہ نے اس خیالی دشمن کو ختم کر دیا ہے۔ ڈیڑھ سال کے اندر اگر اوبامہ بی جے پی کے بابری طرح کوئی اور خونخوار دشمن ایجاد کرنے میں ناکام رہے تو امریکی عوام ان کے دشمن بن جائیں گے اور یہ ساری بازیگری کسی کام نہ آئیگی ایسے میں جوش ملیح آبادی کا ایک شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ ان پر صادق آجائیگا۔

سر کرنے پھر چلا تھا مہم انتخاب کی
ہر سانس میں شکست کی دنیا لئے ہوئے

# عالم شرق و غرب

## ۱۱/ستمبر

# گرد چہرے پر جمی تھی آئینہ دھوتے رہے

سرد جنگ کے اختتام پذیر ہونے کے بعد اگر امریکہ جنگ وجدال کے طریقہ کار کو سرد بستہ میں ڈال کر مسلم دنیا سے امن وسلامتی کی بنیاد پر تعلقات استوار کر لیتا تو جارج بش کو ۱۴/ستمبر ۲۰۰۱ء کے دن یہ اعلان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ ''یہ اکیسویں صدی کی پہلی جنگ ہے''۔ قدرت نے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ کو ایک نادر موقع عنایت فرمایا تھا۔ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھا نیز اس کے علاوہ دوسری عالمی اسلامی قوت امریکہ کے ساتھ تھی۔ اگر اس وقت امریکی انتظامیہ جنگ وجدال کو سرد خانے کی نذر کر کے اسلامی دنیا کی جانب امن ودوستی کا ہاتھ بڑھاتا تو یہ صدی ساری دنیا کے لئے بشمول امریکہ کے ایک سلامتی وخوشحالی کی صدی بن سکتی تھی لیکن اس نے یہ موقع گنوا دیا اور ایک دہائی کے اندر خود اپنی قبر تیار کر دی جس میں وہ دن بدن زندہ درگور ہوتا جا رہا ہے۔

امریکہ فی الحال جس معاشی بحران کا شکار ہے اس کی سب سے بڑی وجہ جنگی اخراجات ہیں۔ گزشتہ دس سالوں میں ۱۲۸۰/بلین ڈالر اس یکطرفہ جنگ پر خرچ کر چکا ہے ۲۰۲۱ء تک اخراجات کا تخمینہ ۱۸۰۰/بلین ڈالر ہے۔ اس خطیر رقم میں سے ۶۳/فی صد یعنی ۸۰۶/بلین ڈالر عراق پر خرچ ہوئے جس کا ۱۱/ستمبر سے کوئی تعلق نہیں تھا دیگر فوجی اڈوں پر ۲۹ بلین اور افغانستان پر صرف ۴۴۴ بلین یعنی ۳۵ فیصد خرچ ہوا جس کو بلا جواز حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ۶ بلین کا کوئی حساب نہیں ملتا لیکن ان ۱۲۸۰ بلین ڈالر میں کس قدر رقم بلواسطہ یا بلاواسطہ سیاستدانوں اور ان کی حمایت کرنے والے سرمایہ داروں کی تجوری میں چلی گئی اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے اس لئے کہ اس پر قومی سلامتی کی

دبیز چادر پڑی ہوئی ہے۔ اس دولت کی ریل پیل کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس حکومت کے پاس اپنے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے وسائل نہیں ہیں اپنے بزرگوں کی خاطر صحت کا بجٹ نہیں ہے۔ جس ملک کے خزانے کا رواں رواں قرض کے بوجھ تلے دب گیا ہے وہ آخر اس بے جواز جنگ کو کیوں جاری رکھے ہوئے ہے؟

مالی خسارے کے علاوہ جو جانی نقصان ہوا ہے اس کی تفصیل رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ ۱۱ ستمبر کے حملے میں کل ۲۸۰۰ کے آس پاس لوگ مارے گئے ان کا بدلہ لینے کے لئے جو جنگ چھیڑی گئی اس میں خود امریکی اعتراف کے مطابق ۶۲۰۰ فوجی مارے گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر حکومت اپنے ہلاک شدہ فوجیوں کی تعداد گھٹا کر بیان کرتی ہے خود امریکہ کے اندر اس بارے میں زبردست رازداری برتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی اس جنگ میں بے شمار ایسے بے روزگار جنگجو نوجوان بھی شریک ہوئے ہیں جنھیں فوج میں باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا ان مرسی نری (mercenary) کے لئے سرکاری دہشت گرد کے علاوہ کوئی اور اصطلاح مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی موت وحیات کو ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور ان کی ہلاکت ۶۲۰۰ میں شامل نہیں ہے۔ امریکی انتظامیہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے باقاعدہ ۵۵ ہزار فوجی زخمی ہوئے ہیں اور جو نفسیاتی امراض کا شکار ہوئے وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ عراق میں ان ظالموں نے ۱۲ لاکھ اور افغانستان میں ۲۰ ہزار معصوموں کو شہید کیا۔ پاکستان اور صومالیہ وغیرہ میں ۶۵۰۰ افراد جان بحق ہوئے۔ ہندوستان کے فاضل مبصرین بار بار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ۱۱ ستمبر کے بعد دہشت گردی کا کوئی بڑا واقعہ رونما نہیں ہوا یہ بھی غلط ہے اس دوران ۱۳ بڑے حملے ہوئے جس میں ۱۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔

اپنے آپ کو دنیا بھر کے مظلوموں کا نجات دہندہ کہنے والے امریکہ کا یہ حال ہے کہ وہ خود ۱۱ ستمبر کے حملے میں امدادی کام کرنے والے رضا کاروں کے زخموں کا مداوا کرنے میں بھی بری طرح ناکام رہا۔ ایک حالیہ تحقیقی مطالعہ میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ جن ۵۰ ہزار لوگوں نے اس کار خیر میں حصہ لیا تھا۔ دس سال بعد ان میں سے ڈپریشن یعنی مایوسی و بے حوصلگی کا شکار لوگوں کی تعداد ۲۸ فی صد ہے۔ ذہنی دباؤ کا شکار ۳۲ فی صد ہیں اور ۲۱ فیصد لوگ دیگر صحت کے مسائل سے جوجھ رہے ہیں۔ ماؤنٹ سینائی اسکول کے ڈاکٹر جون کے مطابق ان رضا کاروں کی بڑی تعداد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہے ۴۸ فیصد استھما اور ۴۳ فی صد دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان رضا کاروں میں سفید فام لوگوں کا

تناسب ۷۵ فی صد ہے ان کی اوسط عمر ۳۸ سال ہے۔

امریکی انتظامیہ نے یہ جنگ دو محاذ پر لڑی ایک محاذ پر بندوق، بمبار طیارے اور ٹینک تھے تو دوسرے پر کیمرہ، مائک اور قلم تھا۔ ایک کا شکار بیرونی دنیا تھی اور دوسرے کا مخاطب امریکی عوام تھے لیکن پہلے کی طرح دوسرے محاذ پر بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پی ای ڈبلیو جو امریکہ کا نہایت معتبر ادارہ ہے اس کے جائزے کے مطابق رائے عامہ بدل رہی ہے۔ دس سال قبل جب لوگوں سے پوچھا گیا تھا کہ کیا حملہ اس لئے ہوا کہ ہم نے کوئی غلطی کی ۵۵ فی صد نے اس کا انکار کر دیا تھا لیکن اب ۴۳ فی صد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس حملے کی وجہ امریکہ کی اپنی غلطیاں ہیں اور ۴۵ فی صد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس میں بھی تقسیم پارٹی لائن پر ہے ڈیموکریٹ اور غیر جانبدار افراد اس کے لئے امریکی جرائم کو ذمہ دار گردانتے ہیں جب کہ ری پبلکن اس کے لئے امریکہ کو ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ یہ وہی ہٹ دھرمی ہے جو ہندوستان کے سنگھیوں میں پائی جاتی ہے جن کی آنکھوں پر عصبیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ پہلے ۵۵ فیصد یہ کہتے تھے کہ حملے کے بعد امریکہ کا اقدام درست تھا اب ایسا سمجھنے والوں کی تعداد گھٹ کر ۴۰ فی صد تک جا پہنچی ہے خاص بات یہ ہے کہ نوجوان طبقے نے امریکی اقدام کو غلط قرار دیا ہے۔ اس سروے کے مطابق ۶۰ فی صد لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں ۱۱ ستمبر کے حملے نے امریکی طرز زندگی کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے گویا دھیرے دھیرے حقائق سامنے آرہے ہیں اور شاعر کی بات سچ ہو رہی ہے۔

کس سلیقے سے متاعِ ہوش ہم کھوتے رہے
گرد چہرے پر جمی تھی آئینہ دھوتے رہے

اس تبدیلی کی سب سے بڑی قیمت مسلمانوں نے چکایا ان کو ہراساں کرنے کی بے شمار کوششیں کی گئیں۔ مختلف انداز میں انہیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا۔ اس سال عید کے بعد نیو یارک کے ایک تفریحی پارک میں جب مسلمان خاندان پہنچے تو کئی مقامات پر ان کی خواتین سے حجاب ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا اور انکار کرنے پر انہیں فیس واپس لے کر نکل جانے کے لئے کہا گیا۔ اس ناروا سلوک کے خلاف کچھ لوگوں نے احتجاج کیا تو ان میں سے ۱۵ کی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور پارک کو وقتی طور پر بند کر دینا پڑا۔ مسلمان امریکہ میں کس قدر رسوا کئے گئے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ۳۵ فی صد مسلمان اب امریکہ کو ترجیحی ممالک کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔

افغانستان میں سوویت یونین کے قبضے سے زیادہ سنگین معاملہ ارضِ فلسطین پر اسرائیل کا

ناپاک وجود ہے۔ اگر امریکہ اس مسئلے کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتا تو ۱۱ ستمبر کا حملہ کبھی بھی نہیں ہوتا لیکن اس نے اس معاملے میں دورخی برتی۔ اسرائیل کی نہ صرف ہر طرح سے حمایت کی بلکہ اسکے جرائم میں بذاتِ خود شریک ہو گیا اور تو اور فلسطینیوں کے حامی مصر کو توڑ کر اپنے ساتھ کر لیا اور اسے اپنے بھائیوں کے بجائے اپنے دشمن کا ہمنوا بنا دیا۔ اس کے بعد فلسطینی آزادی کے رہنما یاسر عرفات کو اسرائیل کے ساتھ ہاتھ ملانے پر مجبور کر دیا اور انہیں ہر طرح سے رسوا کر کے ان کی جگہ اپنے زر خرید پٹھو محمود عباس کو بٹھا دیا۔ اس طرح فلسطینیوں کو چہار جانب سے گھیر لیا گیا اس کا ردعمل وہی ہوا جو اس بلی کا ہوتا ہے جسے مارنے سے پہلے نکاسی کے سارے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں بلی حملہ آور کے ہاتھ پر نہیں بلکہ چہرے پر جھپٹ پڑتی ہے اور یہی ہوا ورلڈ ٹریڈ سنیٹر امریکہ کا تشخص تھا اس کی پیشانی پر چمکتا ہوا تارہ تھا جو دیکھتے دیکھتے ڈھیر کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ ایک اور سپر پاور کا سورج زوال پذیر ہو گیا۔

امریکہ کے تحقیق و تفتیش کے ادارے نے دس سال بعد ۱۱ ستمبر پر اپنی رپورٹ کا خلاصہ پیش کیا اس کے مطابق امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی نے دوسرے جہاز کو مار گرانے کا حکم دیا تھا جسے ماننے سے فوج نے انکار کر دیا۔ اس رپورٹ میں اعتراف کیا گیا کہ حملے کے بعد ایک زبردست افراتفری کا ماحول تھا اور کسی کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے گویا اس طرح کے حملے کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری تھی اور نہ ہی منصوبہ تھا۔ اس کے باوجود حملے کے بعد اس کا سیاسی فائدہ بڑی خوبی کے ساتھ اٹھایا گیا اور اس کے پسِ پردہ دنیا بھر میں جی بھر کے تباہی مچائی گئی۔ بے وقوف آدمی کی پیشانی پر احمق نہیں کھدا ہوتا اس کے اعضاء و جوارح بھی عقلمند جیسے ہی ہوتے ہیں دونوں کے اندر عقل موجود ہوتی ہے لیکن فرق اس کے استعمال سے پڑتا ہے۔ عقلمند دوسروں کی غلطی سے عبرت حاصل کر کے خود کو سنبھال لیتا ہے۔ امریکہ سوویت یونین کے انجام سے سبق سیکھ سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ معمولی بے وقوف اپنی حماقت سے ہوشیار ہو کر اصلاح کی جانب مائل ہو جاتا ہے لیکن ۱۱ ستمبر کے حملے کے بعد وہ بھی نہ ہو سکا۔ مہا بے وقوف اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ اپنی حماقت کی بے جا توجیہ کرتا ہے۔ اس پر اصرار کر کے یکے بعد دیگرے حماقت کرتا چلا جاتا ہے۔ امریکی انتظامیہ نے گزشتہ دس سالوں میں یہی کیا اور بالآخر نشانِ عبرت بن گیا۔ ۱۱ ستمبر کا پیغام یہی ہے کہ جارج ڈبلیو بش نے دس سال قبل اس صدی کی جس جنگ کا اعلان کیا تھا اس میں امریکہ شکستِ فاش سے دوچار ہو چکا ہے۔

# وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

## (قسط اول)

سرزمینِ ہند پر صدر براک اوبامہ کی آمد آمد ہے۔ اوبامہ نے صدارت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد وزیرِ اعظم من موہن سنگھ کو قصرِ ابیض میں پہلا مہمان بنایا تھا اور اب وہ خود مہمان بن کر تشریف لارہے ہیں ایسے میں غالب کا مشہور مصرع 'وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے' بے ساختہ یاد آتا ہے۔ شاعر نے نہ جانے کس کے لئے یہ شعر کہا تھا؟ لیکن فی الحال صدر اوبامہ کے حالیہ دورے پر یہ پوری طرح چسپاں ہو گیا ہے۔ 'کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں' ان کیساتھ ساتھ گھر کو دیکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ امریکی صدور کے منحوس قدم جن گھروں میں پڑتے ہیں ان کا نقشہ بہت جلد بدلنے لگتا ہے۔ مثلاً پاکستان جو کبھی امریکہ کا منظورِ نظر تھا لیکن اس بار صدر صاحب نے اس سے کنی کاٹ لی اس لئے کہ اب اس گھر میں دیکھنے جیسا کچھ بھی نہیں بچا سب کچھ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ افغانستان جس کو اوبامہ نے انتخابی مہم کے دوران خوب اچھالا تھا اور بڑے بلند بانگ دعوے کئے تھے وہ بھی اچانک ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

صدر صاحب نے پاکستان کا قصد کیوں نہیں کیا؟ اس سوال پر سیاسی مبصرین خوب اٹکلیں لگا رہے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان جمہوری اقدار مشترک ہیں اس لئے ان کے درمیان اشتراکِ عمل فطری امر ہے لیکن ہندوستان میں جمہوریت ابھی نئی نہیں آئی بلکہ اس وقت بھی پائی جاتی تھی جبکہ ہم سوویت یونین کے ہمنوا ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت ہماری جمہوریت کے اندر کوئی کشش امریکی انتظامیہ کو نہیں دکھلائی دیتی تھی بلکہ اس وقت پاکستان کے فوجی آمر اور چین کی

اشتراکی حکومت امریکہ کو ہم سے بھلی معلوم ہوتی تھی۔ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے وہ ایک ضرورت تھی اور اب چین پر لگام لگانے کے لئے ہندوستان کا ساتھ ضروری ہو گیا ہے۔ ہند امریکی تعلقات میں گرم جوشی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ اگر اوبامہ واقعی جمہوریت نواز ہوتے تو وہ گزشتہ سال اسلامی ممالک کے اپنے دورے کا آغاز سعودی عرب سے نہ کرتے جہاں باقاعدہ ملوکیت ہے اور پھر مصر نہ جاتے جو جمہوریت کا سب سے بڑا مذاق ہے۔

صدر اوبامہ کے عراق سے لے کر پاکستان تک کے سارے علاقہ کو نظر انداز کرنے کی سب سے بڑی وجہ خوف ہے۔ اس خوف کو ایک آسان سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سال کے آغاز میں متحدہ عرب امارات کی ایک ریاست راس الخیمہ میں کشتی رانی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ ہونا تھا جسے آخری وقت میں اسپین منتقل کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کی وجہ امریکہ کی جانب سے کیا جانے والا اعتراض تھا۔ بیان کی جانے والی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں طالبان یا القاعدہ جیسا کوئی گروہ سرگرم عمل ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ متحدہ عرب امارات امریکہ سے کہیں زیادہ محفوظ اور پرامن علاقہ ہے۔ یہاں پر عام جرائم کی شرح نہیں کے برابر ہے۔ راس الخیمہ میں دہلی کی طرح ڈینگو اور ملیریا وغیرہ کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی بدعنوانی کی بنیاد پر تعمیر کئے گئے پلوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ امریکی انتظامیہ کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ یہ مقام ایران سے محض ۹۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اس لئے ہم وہاں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ امریکی عوام کی طرح ان کے نمائندے یعنی حکمران بھی اپنی تمام تر دیدہ دلیری کے باوجود دنیا کے سب سے زیادہ بزدل افراد ہوتے ہیں۔ اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کی موجودگی کے باوجود صدر بش نے جس طرح خفیہ انداز میں بغداد کا پہلا دورہ کیا تھا وہ سب کو یاد ہے لیکن جاتے جاتے کسی نے انہیں علی الاعلان عراق جانے کا مشورہ دے دیا اور پھر وہ جوتا جو تاریخ کا حصہ بن گیا اسے بھلا کون بھول سکتا ہے نہ بش، نہ اوبامہ اور نہ باقی دنیا۔

افغانستان میں اوبامہ کے سارے منصوبے ملیامیٹ ہو چکے ہیں اور امریکی وہاں سے عراق ہی کی طرح فرار کا باعزت راستہ تلاش کر رہے ہیں اور ان کا پٹھو کرزئی اپنی جان کی امان طالبان سے طلب کرنے پر مجبور ہو گیا ہے ایسے میں اوبامہ کیا منہ لے کر وہاں جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ امریکہ کے تعلقات ایک نازک مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں اور اس کی وجہ اوبامہ کی حماقت ہے۔ افغانستان میں اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر امریکیوں نے پاکستان پر ڈرون حملہ شروع کر دیا اور پھر گزشتہ ماہ ناٹو فوجیوں نے سرحد پر حملہ کر کے پاکستانی فوجیوں کو بھی ہلاک کر دیا اس طرح پانی

سر سے اونچا ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ بزدل پاکستانی حکمرانوں کو عوام کے دباؤ میں آ کر سرحد بند کرنا پڑا۔ پاکستانی حکام نے اس کا جواز امریکہ کے ذریعہ لگائے گئے الزام سے نکالا جس میں کہا گیا تھا حملہ کی وجہ مجاہدین کا افغانستان سے پاکستان میں گھس جانا ہے۔ پاکستان نے جواباً کہا اگر ایسا ہے تو سرحد کو بند ہو جانا چاہئے۔ سرحد کے بند ہوتے ہی امریکی ایندھن و خورد و نوش کی سپلائی بند ہو گئی نیز پاکستان میں پھنسے ہوئے مال بردار ٹرکوں کو آگ لگانے کا کام شروع ہو گیا۔ لاکھوں ٹن اشیاء جلا کر خاک کر دی گئیں اور امریکیوں کو دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ امریکیوں کو معافی طلب کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس کے بعد ہی دوبارہ سرحدی چوکیوں کو کھولا گیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ماں کوئی کڑوی دوا پلانے کی خاطر منہ بند کرنے والے بچہ کی ناک دبا دیتی ہے اور بچہ روتا چلاتا کڑوی دوائی کو نگل جاتا ہے۔

افغانستان کی صورتحال فی الحال امریکیوں کے لئے ایک ایسا ناسور بن چکی ہیں کہ جس کا علاج ناممکن ہے اس طرح کی بیماری اپنے ساتھ مریض کو یوں پیار سے لیکر جاتی ہے کہ وہ پھر لوٹ کر واپس نہیں آتا۔ لیکن افسوس کہ عادی نشہ بازوں کی طرح کوئی اپنے پیش روسے عبرت نہیں پکڑتا۔ نہ سوویت یونین نے برطانیہ سے سبق سیکھا تھا اور نہ امریکا نے سوویت یونین سے ہی کچھ سمجھا۔ اب سنا ہے امریکہ بہادر ہندوستان کو اپنا وارث بنا کر افغانستان سے رفو چکر ہونا چاہتا ہے اور یہ صدر اوبامہ کے دورے کا ایک خفیہ ایجنڈا ہے۔ ویسے جن افغانیوں نے تین سپر پاورس کے چھکے چھڑا دیئے وہ ہندوستانی فوج کا کیا حشر کریں گے یہ جاننے کے لئے کسی نجومی کی ضرورت نہیں ہے۔ امریکی ماہرین ہندوستانی حکومت کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ افغانستان میں اپنے قدم جمانے سے وہ پاکستان کو دونوں جانب سے گھیر سکتا ہے لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان اور امریکہ کی سرحدیں تو افغانستان سے نہیں ملتیں لیکن چین اور پاکستان کی ضرور ملتی ہیں اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری فوجیں ان دونوں کے درمیان گھر کر رہ جائیں۔ ویسے ہندوستان کے پاس داخلی مسائل کی کوئی کمی نہیں جو خارجی مسائل کو دعوت دی جائے۔ ملک میں نکسل وادیوں نے ایک بڑے حصہ پر اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے اور کشمیری نوجوان اگر اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھاتے ہیں تو ہم بوکھلا کر گولی چلانے لگتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیر کے شہید ہونے والے معصوم نوجوان امریکہ کو نظر نہیں آتے لیکن اس سے حقیقت نہیں بدل جاتی ظلم تو ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے اور ظلم تو اسی وقت مٹتا ہے جب ظالم صفحۂ ہستی سے مٹ جائے یا اپنے رویہ سے باز آ جائے۔

امریکہ کی ہندوستان میں غیر معمولی دلچسپی کی ایک وجہ ہندوستان کی معاشی خوشحالی بتائی جاتی۔

اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چین کی شرح پیداوار ماضی قریب میں ہندوستان سے بہتر رہی ہے اور آئندہ بھی اس کے جاری رہنے کا قیاس لگایا جارہا ہے ایسے میں اگر معاشی مفادات فیصلہ کن ہوتے تو چین کو سبقت حاصل ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ امریکی معیشت کا سب سے بڑا مسئلہ وہاں پیداوار کے بالمقابل کھپت کا زیادہ ہونا ہے گویا قومی سطح پر انکی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے اس لئے قومی خسارہ ایک لاکھ ۳۶ ہزار کروڑ ڈالر تک پہونچ گیا گویا ہر امریکی شہری فی الحال ۴۴ ہزار ڈالر کا مقروض ہے اور اس میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے امریکی حکومت قومی بانڈ فروخت کرتی ہے اور ان بانڈس کا سب سے بڑا خریدار چین تھا اس نے ایک سال قبل ۳۴۰۰ کروڑ کے امریکی بانڈس فروخت کر کے ایک کھلبلی مچادی اس کے باوجود اس کے پاس ہنوز ۷۵۵۴۰ کروڑ کے بانڈس موجود ہیں جاپان کے پاس اس سے بھی زیادہ بانڈس ہیں اس طرح امریکی معیشت دن بدن چین وجاپان کے شکنجہ میں جکڑتی جارہی ہے اور آج اگر چین حکومت اپنے تمام امریکی بانڈس کو بازار میں لے آئے تو امریکہ کا عزت ووقار کوڑیوں کے بھاؤ بک جائیگا اس لئے امریکہ چین کو فوج کے ذریعہ ڈرا کر رکھنا چاہتا ہے لیکن چین جاپان کی طرح کوئی نامرد ریاست نہیں ہے جسے دوسری جنگ عظیم کے بعد خصی کر دیا گیا تھا۔ چین پر دباؤ ڈالنے کی خاطر امریکہ ہندوستان کو استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن ہندوستان کو اپنی خدمات پیش کرنے سے قبل ان لوگوں کا انجام ضرور دیکھ لینا چاہئے جنھوں نے ماضی میں اس طرح کے تعاون سے نوازا تھا۔

صدام حسین کو امریکہ نے ایران کے خلاف استعمال کیا۔ دس سال تک جنگ جاری رہی امریکہ خوب زور وشور سے مدد کرتا رہا لیکن جب جنگ ناکامی پر ختم ہوئی تو اسلحہ کا بل بھیج دیا اور ادائیگی کے لئے دباؤ ڈالنے لگا۔ جب عراق نے قرض ادا کرنے کے لئے تیل کی قیمت میں اضافہ کے پیش نظر پیداوار میں کمی کی تو اپنے ہمنوا کویت کی مدد سے اس کی اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ جب عراق نے کویت کو سبق سکھانے کی خاطر اس پر حملہ کیا تو نہ صرف صدام کو کھدیڑ دیا گیا بلکہ اس پر معاشی پابندیاں لگا کر دس سالوں تک کمزور کیا گیا اور بالآخر جارج ڈبلیو بش نے اپنی گرتی ہوئی مقبولیت میں اضافہ کر کے انتخابی کامیابی حاصل کرنے کی خاطر نہ صرف صدام حسین کو اقتدار سے بے دخل کیا بلکہ اسے تختہ دار تک پہونچادیا۔ اس سیاسی بازی گری میں عراق کے لاکھوں معصوموں نے جانیں گنوائیں اور کروڑوں کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسری مثال پاکستان کی ہے جو دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں امریکہ کے ساتھ کیا ہوا کہ خود دہشت گردی کا شکار ہو گیا۔ ہندوستان کو امریکہ کے ساتھ اپنی پینگیں

بڑھانے سے قبل اس راہ کے پیش رو مسافروں کا انجام دیکھ کر اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اس لئے کہ غالب کا مصرع 'ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو' اگر کسی پر صادق آتا ہے تو وہ امریکہ بہادر ہی ہے۔

غریب و مفلس عوام کی بنیادی ضرورت روٹی کپڑا اور مکان ہوتی ہے لیکن امیر کبیر لوگوں کے پاس ان اشیا کی فراوانی ہوتی ہے ان کی ضروریات زندگی سیر و تفریح، کاروبار و تجارت اور عبادت و ریاضت پر مشتمل ہوتی ہے۔ صدر اوبامہ کے ہندوستان میں قیام کا پروگرام اس حقیقت کا مظہر ہے۔ وہ دہلی کے بجائے ممبئی تشریف لائیں گے اور سیر و تفریح کی خاطر ہوٹل تاج میں قیام کریں گے۔ یہ وہی مشہور زمانہ مقام ہے جہاں دو سال قبل حملہ ہوا تھا۔ دوسرے دن وہ تجارت کے فروغ کی غرض سے ہوٹل ٹرائیڈنٹ میں سرمایہ کاروں سے ملاقات کریں گے۔ یہ عمارت بھی دہشت گردوں کے حملہ کا شکار ہوئی تھی۔ بہتر ہوتا کہ صدر اوبامہ اپنے دورے کے دوران یہودیوں کے نریمان ہاؤس میں موجود مرکز شبد بھی جاتے جہاں دہشت گردوں نے حملہ سے قبل قیام کیا تھا اور وہاں کچھ وقت عبادت و ریاضت میں گذارتے تا کہ امریکی آشیرواد سے کئے گئے حملہ کا معائنہ تکمیل پذیر ہو جاتا۔ صدر اوبامہ دہلی میں جا کر پہلے راشٹر پتی بھون جائیں گے پھر گاندھی جی کی سمادھی پر پھول چڑھائیں گے واپس آ کر وزیر اعظم سے ملاقات اور بالآخر پارلیمان کے مشترکہ اجلاس کو خطاب یہ گویا اصل سیاسی سرگرمیاں ہیں جن کے لئے ان کا دورہ ہونے والا ہے۔ صدر اوبامہ کے دہلی جانے سے قبل ممبئی آنے کی واحد توضیح یہ بیان کی جاتی ہے کہ امریکی صدر ہندوستانیوں کو پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہندوستان کے ساتھ ہیں اور رچرڈ کولمن ہیڈلی کے مطابق چونکہ اس حملہ میں پاکستان ملوث ہے اس لئے اس پر دباؤ ڈالیں گے۔ لیکن یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں اولاً آیا ہیڈلی اس حملہ میں شامل تھا یا نہیں؟ ثانیاً یہ کہ آخر یہ ہیڈلی ہے کون؟

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ یقیناً اس حملہ میں شامل ہے اسی لئے کہ تفصیلات بیان کرنے کے لئے اسے اس امر کا اعتراف کرنا پڑا۔ دوسرے سوال کا جواب بھی سب جانتے ہیں رچرڈ ہیڈلی امریکہ کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ اب اگر ممبئی کا حملہ امریکی ایجنٹ کے ذریعہ کروایا گیا تو کیا اس کا سوتر دھار امریکہ نہیں ہوا؟ امریکی انتظامیہ کے مطابق وہ ڈبل ایجنٹ تھا۔ پہلے سی بی آئی کا اور پھر لشکر کا۔ اگر اس جھوٹ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ لشکر کے اس ایجنٹ کو اپنی جیل میں کیوں پال رہا ہے؟ وہ اسے اپنے دوست ہندوستان کے حوالے

کیوں نہیں کرتا؟ تاکہ اجمل قصاب کے ساتھ اسے بھی قرار واقعی سزا سنائی جائے۔ امریکی صدر وزیر اعظم من موہن کے ساتھ ایک مشترکہ پریس کانفرنس کو خطاب کریں گے جس کا ایک موضوع یقیناً دہشت گردی ہوگا ایسے میں کیا رچرڈ ہیڈلی سے متعلق یہ سوال صدر اوبامہ سے نہیں کیا جانا چاہئے؟ لیکن کیا دنیا کی سب بڑی جمہوریت میں کوئی صحافی ایسا کرنے کی جرأت کر سکے گا؟ اور اگر کسی نے پوچھ لیا کہ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی یقین دہانی سے قبل امریکہ خود رچرڈ ہیڈلی کو ہندوستان کے حوالے کرے۔ تو اس بیچارے کا انجام کیا ہوگا؟ اگر رچرڈ ہیڈلی ہندوستان آجاتا ہے اور کوئی غیر جانبدار ادارہ اس کی تفتیش کرتا ہے تو یقیناً ممبئی حملہ میں امریکہ کا رول واضح ہو جائیگا نیز ہیمنت کرکرے کے قاتلوں کا سراغ بھی اپنے آپ لگ جائیگا لیکن کیا کبھی ایسا ہوگا؟

صدر براک اوبامہ کا دورۂ ہند سرمایہ دارانہ جمہوریت کے طلباء کے لئے اس نظام کے خدوخال کو سمجھنے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ امریکی عوام کا سب سے بڑا مسئلہ بیروزگاری ہے جو سرکاری اعدادوشمار کے مطابق ۱۰ فی صد ہے لیکن غیر سرکاری ذرائع اس کے ۱۵ فی صد سے تجاوز کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالیہ نصف مدتی انتخاب میں براک اوبامہ نے رائے دہندگان کو بہلانے کی خاطر اس موضوع کو اچھالا اور 'آوٹ سورسنگ' (یعنی امریکی کمپنیوں کا ہندوستان میں موجود تجارتی اداروں سے کام لینا) کی مخالفت کی لیکن اب وہ انتخابی دور ختم ہو گیا ہے اور رائے دہندگان کے بجائے ان سرمایہ داروں کو خوش کرنے کا موقع آ گیا ہے جن کے مالی تعاون سے انتخابات لڑے جارہے تھے۔ آوٹ سورسنگ کا سیدھا نقصان امریکی عوام کو ہوتا ہے لیکن اس سے براہِ راست فائدہ امریکی سرمایہ داروں کا ہوتا ہے اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں اور منافع بڑھ جاتا ہے۔ اس آوٹ سورسنگ سے ہندوستانی عوام، یہاں کے صنعت کار اور حکومت تینوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ عوام کو روزگار مل جاتا ہے۔ صنعت کار اپنی دلالی کماتے ہیں اور وہ کس قدر ہوتی ہے اس کا اندازہ ستیم کے گھپلے میں سامنے آچکا ہے، حکومت عوام اور سرمایہ کاروں سے ٹیکس وصول کرتی ہے اور سرکاری خزانہ مالا مال ہوتا ہے۔ عوام جب اس کمائی کو خرچ کرتے ہیں تو تجارت کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور اس سے بھی حکومت کو ٹیکس ملتا ہے۔ اس لئے آوٹ سورسنگ میں امریکی عوام کے علاوہ بقیہ تمام اندرونی و بیرونی فریقوں کا فائدہ ہے۔ صدر براک اوبامہ چونکہ جمہوریت کے حوالے سے امریکی عوام کے نمائندے ہیں اس لئے انہیں اپنے عوام کے مفاد کو ترجیح دینا چاہئے لیکن جمہوری نظام میں یہ عمل صرف نظری سطح پر ہوتا ہے عملی سطح پر اس کی نوبت نہیں آتی۔ اس لئے کہ عوام کو بے وقوف

بنانے کے نت نئے طریقہ ایجاد کئے جاچکے ہیں۔صدر اوبامہ آوٹ سورسنگ کے مسئلہ کو اٹھا کر ہندوستانی حکومت یا اپنے اوپر احسان کرنے والے امریکی سرمایہ داروں کو ناراض کرنے کی حماقت ہر گز نہیں کریں گے بلکہ اس مسئلہ سے مالی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔یہی ساری دنیا کے جمہوری رہنماؤں کا شعار ہے۔اسی لئے وہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان کی دیکھ بھال اور پرورش کرتے ہیں نیز اگر وہ موجود نہ ہوں تو انہیں پیدا کرتے ہیں۔

ہندوستان کے خزانہ میں جو کثیر سرمایہ جمع ہورہا ہے اس کے حقدار یہاں کے غریب عوام ہیں جن سے ووٹ لیکر خزانہ کی امین حکومت قائم ہوتی ہے لیکن اگر یہ جمہوری حکومت اس سرمائے کو عوام کی فلاح وبہبود پر خرچ کرے تو اس سے ہونے والی بدعنوانی محدود ہوتی ہے۔اس میں کئی حصہ دار پیدا ہوجاتے ہیں اور اس کا پردہ فاش ہونے کا امکان بھی موجود ہوتا ہے جیسا کہ آجکل دولتِ مشترکہ کھیلوں کے حوالہ سے ہنگامہ برپا ہے،ایسے میں بدعنوانی کا سب سے محفوظ راستہ دفاعی اخراجات پر ہونے والا خرچ ہے اس لئے کہ اسے قومی مفاد کے تحت صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے اور اس پر اعتراض کرنے والے کو قوم کا دشمن بلکہ غدار وطن ٹھہرادیا جاتا ہے۔گزشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ممبئی حملہ کے بعد ہندوستان کے دفاعی بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔امریکہ کے پاس بیچنے کے لئے فی الحال اسلحہ سے بہتر کوئی اور شئے نہیں ہے اس لئے امریکی صدر ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ اسلحہ فروخت کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ امریکی عوام کو محروم کرکے جو رقم ہندوستان نے کمائی ہے اس کے فوائد سے ہندوستان کے غریب عوام کو محروم کرکے ہندوستانی وامریکی سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کی جیب کو بھرا جاسکے۔دنیا کی سب سے عظیم اور وسیع ترین جمہوریت کے سربراہ ممبئی اور دہلی میں یہی کریں گے اور عوام بیچارے ٹیلی ویژن کے پردے پر ان کے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور ان کی منافقانہ دروغ گوئی پر سر دھنیں گے۔بقول شاعر؂

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملک کے نامور صحافی اور دانشور حضرات صدر اوبامہ اور وزیر اعظم من موہن سنگھ کی اس ملاقات کو جمہوریت کی عظیم کامیابی قرار دیں گے اس لئے کہ اس جمہوری نظام نے بے یار ومددگار عوام کے ذہنوں پر جس طرح قفل ڈال رکھا ہے بے بس صحافیوں کے قلم کو بھی اپنے پاس رہن رکھ لیا ہے۔

# یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں

## (قسط دوم)

صدر براک اوباما ہندوستان کے دورے پر آندھی کی مانند آئے اور طوفان کی طرح نکل گئے گویا ہوا سے نمودار ہوئے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ اپنے اس طوفانی دورے میں انہوں نے مندرجہ ذیل پانچ کام کیے:

- سیر و سیاحت
- رقص و سرود
- تعلیم و تربیت
- تجارت و معیشت
- سیاست و نصیحت

جہاں تک سیر و تفریح کا سوال ہے جب شمالی امریکہ میں موسمِ سرما اپنی غضب ناکی دکھلانے لگتا ہے تو خوشحال امریکی گرم ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں امریکی سیاح ہندوستان بھی آجاتے ہیں ان میں اوباما خاندان کے اضافہ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا سوائے اس کے کہ اوباما کی رہائش اور سفر کے دوران تحفظ کے پیشِ نظر عوام کو مختلف طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور عام لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر یہ مصیبت کیوں ہم پر مسلط ہو گئی؟ اگر یہ وہیں امریکہ میں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کو بلوا بھیجتا جن سے ملنے کی غرض سے یہاں آیا تھا تو یہ تمام لوگ سر کے بل حاضر ہو جاتے اور ہماری جان چھوٹتی۔ ہمیں تو یہ سب ڈرامہ ٹی وی کے پردے پر دیکھنا تھا سو ہم دیکھ لیتے

اور خوش ہو جاتے ۔ ہمارے لئے اور خود ان کے لئے دہلی اور واشنگٹن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ناچ رنگ کی خاطر دیوالی کے تہوار کا مہورت نکالا گیا۔ حالانکہ اس کام کے لئے اگر امریکہ سے محترمہ مشعل اوبامہ کے بجائے مائیکل جیکسن کی بہن جینٹ جیکسن تشریف لاتیں تو عوام زیادہ محظوظ ہوتے ۔ جہاں تک تجارت و معیشت کا سوال ہے اس کے لئے بھی امریکی صدر کو زحمت گوارہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی یہ کام تو ایک اعلیٰ سطحی تجارتی وفد بخیر و خوبی کرسکتا تھا۔ دھندہ بیوپار کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کا دارومدار عہدہ و منصب کے بجائے منافع پر ہوتا ہے۔ اگر فائدہ ہو تو چپراسی کو بھی سلام کیا جاتا ہے اور نقصان ہو رہا ہو تو صدر مملکت سے بھی منہ پھیر لیا جاتا ہے۔ براک اوبامہ سنا ہے کچھ عرصہ تعلیم و تدریس کے پیشے سے بھی جڑے رہے اس لئے اپنے اس پرانے شوق کو پورا کرنے کی خاطر پروفیسر براک اوبامہ سینٹ زیویرس کالج پہونچ گئے جہاں انہیں طلباء سے نہ صرف خطاب کرنا تھا بلکہ ان کے سوالات کا جواب بھی دینا تھا، ذرائع ابلاغ نے ملک کے عوام کو براک اوبامہ کے حوالے سے جن خوش فہمیوں کا شکار کر رکھا تھا اس کا غبارہ وہاں جانے کے بعد اس وقت پھوٹ گیا جب ایک لڑکی نے سوال کر دیا کہ امریکہ پاکستان کو دہشت گرد ریاست کیوں نہیں قرار دیتا؟ اس سوال کا جواب نہ تو اوبامہ مثبت ہی دے سکتے اور نہ منفی اس لئے انہوں نے یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ پاکستان کا استحکام خود ہندوستان کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ کاش کہ اوبامہ پر سیاسی مجبوریوں کا دباؤ نہ ہوتا اور وہ اس سوال کا کھرا کھرا جواب دے پاتے ۔ اس جواب کو سن کر بیچارے بی جے پی والے بھی آتش کا یہ شعر گنگنانے پر مجبور ہو گئے ۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا<br>
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

صدر صاحب کی مصروفیات میں آخری نمبر پر سیاست و نصیحت کی ذمہ داری تھی جس کی ادائیگی کے لئے انہیں ملک کے ایوانِ بالا اور زیریں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرنا تھا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کے لئے امریکی صدر کا آنا ضروری تھا اور غالباً یہی وہ کام تھا جس کے لئے جناب صدر وارد ہوئے تھے۔ براک اوبامہ امریکہ کے چوتھے صدر ہیں جنھیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ان کے پیش رو دونوں صدور کا تعلق ڈیموکریٹس پارٹی سے تھا اور وہ ہندوستان کے سوشلزم سے کنارہ کش ہونے کے بعد نازل ہوئے تھے لیکن آزادی کے فوراً بعد پنڈت نہرو ہی کے زمانے میں جبکہ سرد جنگ زور و شور سے جاری تھی اور ہندوستان کا جھکاؤ امریکہ کے مخالف سوویت

یونین کی جانب تھا اس کے باوجود ریپبلکن پارٹی کے صدر آئزن ہاور کو ایوان سے خطاب کا موقع دیا گیا۔ اس وقت آئزن ہاور کھلی گاڑی میں بیٹھ کر ایوان میں آئے اور عوام و خواص سب نے دل کھول کر ان کا خیر مقدم کیا۔ ہندوستانیوں کی امریکی مرعوبیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ براک اوبامہ کے پارلیمانی خطاب سے قبل پارلیمانی امور کے وزیر نے ممبران ایوان کو متنبہ کیا کہ مہمان کی موجودگی کے دوران وہ اپنے عزت و وقار کا پاس و لحاظ رکھیں۔ جناب پون کمار کو حاضرین سے کسی بدتمیزی کی توقع ہرگز نہیں تھی اس لئے کہ ایسے مہاپاپ کی کلپنا بھی اسمبھو ہے بلکہ ۲۰۰۰ء میں بل کلنٹن سے مصافحہ کرنے کی خاطر پارلیمنٹ کے ممبرس جس طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے اس منظر کا اعادہ دوبارہ نہ ہوجائے اس اندیشے کے پیشِ نظر یہ یاددہانی کرائی گئی۔ ایوان کی صدر میرا کماری نے اس نوٹس پر اعتراض کیا تو انہیں مطمئن کرنے کی خاطر اس وقت کی ویڈیو دکھلائی گئی۔ اس طرح غلامانہ ذہن کے حامل ممبرانِ پارلیمان کیا اپنے آقا و مالک کی تقریر کا جائزہ لیں گے اور زرخرید ذرائع ابلاغ جس نے اپنے ضمیر کو نیلام کردیا ہے کس منہ سے اوبامہ کی تقریر کا پوسٹ مارٹم کرے گا۔ ان بیچاروں پر قابل اجمیری کا یہ شعر معمولی ترمیم کے ساتھ صادق آتا ہے۔ (شاعر سے معذرت کے ساتھ)

مقاماتِ فکر و نظر کون سمجھے، یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بصد رشک امریکی آوارگی کو، غزالانِ دیر و حرم دیکھتے ہیں

ہندوستان اپنی تمام تر ترقی پذیری بلکہ بقول اوبامہ ترقی یافتگی کے باوجود ایک قدیم روایت پسند ملک ہے یہاں اب بھی ہر کام شبھ مہورت کو نکال کر کیا جاتا ہے۔ فلمی دنیا ہو سیاست کا میدان جنتری کی مدد کے بغیر کوئی پروگرام نہیں بنایا جاتا۔ مندر بنانے سے قبل اگر شیلا نیاس کیا جاتا ہے تو تھیٹر بنانے سے پہلے بھومی پوجا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ارجن سنگھ جیسا روشن خیال رہنما بھی اپنے دورِ اقتدار میں چھٹی کے دن الکشن کمیشن کا دفتر کھلوا کر اپنا کاغذات نامزدگی داخل کرتا ہے تاکہ ستاروں کی گردش کے عتاب سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ کاش کے صدر اوبامہ بھی اپنے ہندوستان کے دورے کا مہورت کسی ماہر نجومی سے نکلواتے تو شاید وسط مدتی انتخاب میں اس زبردست ناکامی کے بعد یہاں نہ آتے۔ صدر براک اوبامہ نے ممبئی میں جو دو دن ضائع کئے اس کے متعلق ایک قیاس آرائی یہ بھی ہے کہ وہ دراصل چھٹیاں منا رہے تھے۔ جمہوری نظام میں سیاستدانوں کا سب سے اہم کام انتخاب لڑنا ہوتا ہے اور اسی کام کو وہ نہایت محنت و لگن کے ساتھ کرتا ہے۔ صدر اوبامہ بھی گزشتہ ماہ

کانگریس (امریکی پارلیمان) کے انتخابی مہم میں مصروف تھے اور ظاہر ہے اس زبردست محنت و مشقت نے انہیں تھکا دیا ہوگا اس لئے اس دوڑ دھوپ کے بعد نتائج سے قطع نظر سرکاری خرچ پر چھٹی منانے کی خاطر صدر صاحب نے ایشیا کا یہ دورہ ترتیب دیا تاکہ کچھ غم غلط ہو جائے دل بہل جائے، گھریلو سیاست سے کچھ وقت کے لئے چھٹکارہ ملے اور یقینی ناکامی کی جانب سے ذرائع ابلاغ کی توجہ ہٹا کر انہیں ایک نیا موضوع فراہم کر دیا جائے تاکہ عوام اسے بھول جائیں لیکن صدر اوبامہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مسائل کی جانب سے توجہ ہٹانے سے مسائل حل نہیں ہو جاتے بلکہ ایسا کرنے سے اکثر ان کی پیچیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک امریکی اخبارات کا تعلق ہے صدر اوبامہ کی ہندوستان میں آمد کو کسی بڑے اخبار نے اپنی شاہ سرخی میں جگہ نہیں دی۔ کچھ نے پہلے صفحہ پر نیچے ایک تصویر لگانے پر اکتفا کیا تو کچھ نے ایسا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ امریکی عوام آج بھی اپنے بنیادی مسائل سے پریشان ہیں انتخابی مہم کے دوران اوبامہ معاشی مسائل کے لئے جارج بش کو مورد الزام ٹھہراتے رہے اور درمیان نام نہاد دیمنی بموں کا تماشہ بھی کیا لیکن عوام ان کے جھانسے میں نہیں آئے وہ تو گویا اوبامہ سے کہہ رہے تھے۔

نہ ادھر اُدھر کی تو بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا
مجھے رہزنوں سے گلہ نہیں تری رہبری کا سوال ہے

امریکہ کا سیاسی نظام بظاہر جیسا سیدھا سادہ نظر آتا ہے حقیقت میں ویسا ہے نہیں۔ بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کے عوام چونکہ براہ راست سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں اس لئے صدر محترم کو سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ امریکی صدر بھی ایوان بالا اور ایوانِ زیریں کے آگے اسی طرح مجبور ولاچار ہوتا ہے جس طرح عوام ان سب اداروں کے سامنے بے یار و مددگار ہوتے ہیں۔ جمہوری نظامِ سیاست کی واحد خوبی یہ ہے کہ اس میں عوام کو اپنے غم و غصہ کے اظہار کا بھرپور موقع بار بار حاصل ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے علاوہ کچھ اور ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ امریکہ میں بھی یہی صورتحال ہے وہاں پر صدارتی انتخاب تو ہر چار سال بعد ہوتا ہے لیکن ایوان کے انتخابات ہر دو سال میں ہوتے ہیں اور اس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناراض عوام اپنی گزشتہ غلطی کا کفارہ ادا کرتے ہوئے صدر کی مخالف جماعت کو ایوان میں اکثریت سے نواز دیتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ اپنے آپ کو نہ صرف اپنے سربراہ کے شر سے محفوظ کرنے کی ایک کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ جارج بش کے آخری زمانے میں دونوں ایوان ان کے مخالف ڈیموکریٹس کے

قبضہ میں تھے اور یہ لوگ ان کی پالیسیوں کی بھرپور مخالفت کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیموکریٹس نے اقتصادی بحران سے ملک کو ابھرنے نہیں دیا اور اس کا فائدہ اٹھا کر ری پبلکن کو صدارتی انتخاب میں ناکام کر دیا۔ براک اوبامہ امریکی عوام کے لئے امید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوئے تھے۔ اوبامہ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کی جماعت کو دونوں ہی ایوانوں میں اکثریت حاصل تھی لیکن افسوس کہ انہوں نے اس نادر موقع کو گنوا دیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اپنے ابتدائی ایام میں وہ عوام کی فلاح و بہبود کی جانب خاص توجہ دیتے قوم کو معاشی کساد بازاری سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کرتے اور عوام کے اندر پائی جانے والی بے روزگاری کو کم کرنے کی کوشش کرتے تاکہ عوام کے اعتماد میں اضافہ ہو لیکن انہوں نے بھی اپنے پیش رو جارج بش کی مانند اندرون ملک کے بجائے بیرونی دنیا کا ناٹک شروع کر دیا وہی پرانا دہشت گردی کا راگ، وہی افغانستان کے عزائم، فوجوں میں اضافہ، ڈرون کے حملے اور قاہرہ میں نمائشی تقریر وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ اس بار عوام پریشان زیادہ تھے اور ان کی توقعات کافی بڑھی ہوئی تھیں اس لئے مایوسی میں اضافہ بھی اسی قدر تیزی کے ساتھ ہوا۔ ری پبلکن کو سرمایہ داروں کی جماعت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اس نے خزانہ کے خالی ہونے کے باوجود ٹیکس میں کمی کر کے صنعت کاروں کی خوشنودی حاصل کی تھی ڈیموکریٹس نے اس کی مخالفت تو کی لیکن اقتدار میں آنے کے بعد ٹیکس کی اس ناروا سہولت کو ختم کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اوبامہ نے اپنی صدارتی مہم کے دوران عوام کی فلاح و بہبود کے پیش نظر صحت عامہ کا ایک بل پیش کرنے کا وعدہ کیا لیکن ایوان میں اس کی منظوری کو ٹالتے رہے یہاں تک کہ انتخاب آن دھمکا اور اس میں کامیابی کے بعد ری پبلکن نے اس کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ کاش کہ اوبامہ اس بل کی توثیق اس وقت کرا چکے ہوتے جب ان کو دونوں ایوانوں میں نہ صرف واضح بلکہ دو تہائی اکثریت حاصل تھی۔ فی الحال صورتحال یہ ہے کہ ایوان زیریں میں ری پبلکن کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو چکی ہے اور ایوان بالا میں گو کہ ڈیموکریٹس کو معمولی اکثریت حاصل ہے لیکن دستوری ترمیم کے لئے وہ ناکافی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ آئندہ صدارتی انتخاب میں اس صورتحال کا فائدہ بھی ریپبلیکن پارٹی کو ہی ہوگا بلکہ اگر اوبامہ کی مقبولیت میں کمی کی یہ شرح قائم رہی تو ممکن ہے آئندہ انتخاب میں ڈیموکریٹس ان کے بجائے کسی نئے چہرے کو میدان میں اتاریں اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یہ براک اوبامہ کے لئے بہت بڑی رسوائی کا باعث ہوگا۔

جمہوری نظام کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا باطن و ظاہر یکساں نہیں ہوتا جو کچھ باہر نظر آتا ہے وہ اندر نہیں ہوتا مثلاً بیرونی دنیا کے لئے امریکی طاغوت ایک اکائی ہے۔ لیکن اندرون

ملک ایسا نہیں ہے۔ عالمی سطح پر امریکہ کی مخالفت چند لوگ کرتے ہیں مثلاً القائدہ اور طالبان، شمالی کو ریا یا برازیل، ایران وشام، حماس، حزب اللہ، اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی وغیرہ لیکن امریکہ کے اندر اوبامہ کے دو دشمن اور ہیں ایک تو حزبِ اختلاف جو چاہتا ہے کہ اوبامہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو جائے اور اس کا فائدہ اٹھا کر وہ آئندہ انتخاب میں پھر برسرِ اقتدار آجائیں اور دوسرے خود اوبامہ کی اپنی پارٹی ڈیموکریٹس کے اعلیٰ رہنما مثلاً ہیلری کلنٹن جو گزشتہ بار امیدوار بننے سے چوک گئی تھیں۔ انہیں قوی امید ہے اوبامہ کی ناکامی ان کے لئے نیک شگون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سیاسی رسہ کشی کا سیدھا فائدہ ان سرمایہ داروں کو ہوا ہے جو ٹیکس کی کٹوتی کو باقی رکھنا چاہتے تھے اور نقصان ان عوام کا ہوا جو صحتِ عامہ کی سہولت سے بہرہ ور ہونا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار ذرائع ابلاغ پر بے دریغ خرچ کر کے اوبامہ کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے ہیں ری پبلکن پارٹی اس کا فائدہ اٹھا رہی ہے اور عوام اس کا خسارہ برداشت کر رہے ہیں۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ ری پبلکن پارٹی کا انتخابی نشان ہاتھی اور ڈیموکریٹس کا گدھا ہے۔ جی ہاں گدھا۔ اگر ہندوستان میں یہ نشان الکشن کمیشن کسی جماعت کو عطا کر دے تو وہ ہتک عزت کا دعویٰ کر دے اس لئے اس پارٹی کا نشان ہی بذاتِ خود اس کی حقیقت کا بیان بن جائے گا لیکن امریکی جمہوریت کا کیا کہنا کہ اس کا گدھا بھی نہ صرف امریکی عوام بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کا منظورِ نظر ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جمہوری نظام ایک چار پیروں والا خونخوار جانور ہے جس کی اگلی دو ٹانگیں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف جماعتیں ہیں اور پچھلی دو ٹانگیں عوام وخواص (سرمایہ دار) ہیں۔ یہ نظام ساری دنیا میں اسی لئے مقبول ومعروف ہے کہ اپنی آمد سے قبل یہ عوام کو آمریت اور ملوکیت سے خوفزدہ کر کے ان کی بصیرت چھین لیتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ اندھوں کے درمیان ہاتھی والی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی اسے پوری طرح نہیں دیکھتا ہر کوئی اس کے کسی ایک حصہ کو چھو کر ایسی قیاس آرائی کرتا ہے جو نہ صرف مختلف ومتضاد بلکہ خلافِ حقیقت بھی ہوتی ہے۔ فتنہ دجال سے متعلق ایک روایت میں آتا ہے کہ اس کے پاس آگ اور پانی دونوں ہوں گے لیکن آگ برف کی مانند سرد اور پانی شعلہ کی طرح گرم ہوگا۔ گویا وہ ایک فریبِ نظر ہوگا کہ لوگ اس کے قریب اپنی ٹھنڈ سے نجات حاصل کرنے کی خاطر آئیں گے تو ٹھٹھر کر رہ جائیں گے اور جب اپنی پیاس بجھانے کے لئے اس کی جانب لپکیں گے تو جھلس جائیں گے۔ جمہوری نظام اس دجالی فتنہ سے کسی قدر مشابہ ہے کہ اس میں عوام کے سامنے دو متبادل ہوتے ہیں ایک کی گرمی ان کی پیاس بڑھاتی ہے اور

دوسرے کی سردی اس کے دانت بجاتی ہے۔ وہ ایک سے پریشان ہو کر اس امید میں دوسرے کی جانب لپکتے ہیں کہ شاید اس کے پاس ان کے غم کا مداوہ ہو لیکن جب قریب پہونچتے ہیں تو اپنی پریشانی میں کمی کے بجائے اضافہ پاتے ہیں اب پھر مایوس ہو کر پہلے کی جانب چلنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا۔ اس دوڑ دھوپ میں کبھی ان کا جسم ٹھٹھرتا ہے تو کبھی ان کا وجود جھلستا ہے اس لئے کہ عوام بیچارے آگ نما پانی اور پانی نما آگ کو تو دیکھتے ہیں لیکن اس دجال کو نہیں دیکھتے جو اپنے ساتھ انہیں لے کر آیا ہے۔ جمہوری نظام کے ہاتھی والے اور گدھے والے آگ اور پانی کا فریب بیچتے ہیں اسی لئے عوام کے مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے چلے جاتے ہیں بقول قابل اجمیری ؎

راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے، فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

# مری وفا پہ کبھی انحصار مت کرنا

## (قسط سوم)

صدر براک اوبامہ کے ہندوستانی دورے کی گرد وغبار وقت کے ساتھ بیٹھنے لگی ہے اور ذرائع ابلاغ کا جادو جو سر چڑھ کر بول رہا تھا اب زائل ہونے لگا ہے۔ بے شمار نمائشی سرگرمیاں (شو بزنس کے تحت) ان کے دورے سے منسلک کردی گئی تھیں اس لئے عوام وخواص یہ دیکھنے میں مگن تھے کہ براک اور مشعل اوبامہ کر کیا رہے ہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ جو کچھ بول رہے تھے یہ سننے کی فرصت کم ہی لوگوں کو تھی اور اس پر غور کرنے کی زحمت کوئی گوارہ نہ کرتا تھا۔ لیکن اب جبکہ جوش ٹھنڈا ہو چکا ہے اور لوگ ہوش میں آرہے ہیں، ان کے بیانات خاص طور پر پارلیمانی تقریر کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ لازمی ہے، ان کے زور بیان کے پیچھے پوشیدہ مضمرات کو جاننے کی ضرورت ہے، اسبات کا پتہ لگانا بھی اہم ہے کہ ان کی تقریر کے اندر حقیقت کا عنصر کس قدر پایا جاتا تھا اور فسانے کا تناسب کتنا تھا، ساتھ ہی اس پہلو کا جائزہ بھی ضروری ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت ان کے ناقص مشوروں پر سعادتمندی کے ساتھ عمل درآمد کرنے میں جٹ جائے تو اس کی کیا قیمت یہاں کی غریب عوام کو چکانی پڑسکتی ہے۔ ان سنجیدہ سولات پر غور وفکر کا یہی صحیح موقع ہے ورنہ اوبامہ کی نہایت ذہانت وذکاوت کے ساتھ کہی جانے والی لچھے دار باتیں ملک وقوم کو بڑا نقصان پہنچا سکتی ہیں ایسا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اوبامہ الفاظ کے دھنی ہیں ان کی شخصیت پر اپنی تمام تر منافقت اور ریاکاری کے باوجود ڈاکٹر عاصم واسطی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ذہین شخص تھا اس نے کمال باتیں کیں
مثال بن گئی وہ بے مثال باتیں کیں

صدر براک اوباما کا ہندوستانی پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب تین نکات پر مشتمل تھا:

ترقی و خوشحالی

سلامتی و تحفظ

جمہوریت و انسانی حقوق

صدر براک اوبامہ نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا میں دنیا کی وسیع ترین جمہوریت کی خدمت میں جو سو کروڑ افراد پر مشتمل ہے دنیا کی قدیم ترین جمہوریت کی جانب سے جس میں تیس لاکھ ہندوستانی نژاد امریکی بھی شامل ہیں میں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اپنی تقریر کے اختتامیہ رسمی کلمات سے قبل دوبارہ اوبامہ نے برما میں جمہوری و انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر کیا گویا جمہوریت اور انسانی حقوق کے غلاف میں لپیٹ کر انہوں نے اپنے دل کی بات بیان کر دی اس لئے اس جائزے کو بھی جمہوریت کے لباس میں لپٹا ہوا ہونا چاہئے۔ گویا ابتدا میں جمہوریت اور اختتام انسانی حقوق کی صورتحال پر نظر ہی مناسب ترتیب ہے۔ صدر اوبامہ نے اندرون ملک انسانی حقوق کے ذکر سے خاص طور پر صرف نظر کیا اور جمہوریت کے بارے میں سکہ کا ایک پہلو اس قدر چمکا کر پیش کیا کہ دوسرا اپنے آپ چھپ گیا۔

براک اوبامہ نے ہندوستانی جمہوریت کی دل کھول کر تعریف کی لیکن شاید انہیں نہیں پتہ کہ اس نام نہاد جمہوریت کی کیا قیمت ہندوستان کے عوام چکا رہے ہیں۔ چند ماہ قبل لوک سبھا میں ایک نادر احتجاج دیکھنے میں آیا جس میں سماجوادی پارٹی کے شانہ بشانہ ان کے نظریاتی دشمن شیوسینا کے ممبران کھڑے ہوئے تھے۔ اور بہار میں ایک دوسرے کے سیاسی حریف آر جے ڈی کے ہمراہ جنتا دل (یو) کے لوگ نعرے بازی کر رہے تھے۔ بہوجن سماج پارٹی کی آواز میں اکالی دل والے آواز ملاتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ نادر اتحاد کسی قومی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کے لئے تھا۔ اس معاشی کساد بازاری کے زمانے میں جبکہ عوام مہنگائی کے بوجھ تلے نانِ جویں کے محتاج ہیں، ان کے نمائندے اپنی تنخواہ میں تین گنا اضافے سے ناراض تھے اور چار گنا اضافہ چاہتے تھے۔ ہندوستان میں ایک جاہل اور بے فائدہ

ممبر پارلیمان کو ہر سال سرکاری خزانے سے ۶۰ لاکھ روپئے مل جاتے ہیں۔ اس طرح ان لوک سبھا کے ممبران پر ہر پانچ سال کی میقات میں ۱۶۰۰ کروڑ خرچ ہوجاتے ان کے علاوہ راجیہ سبھا کے ممبران ہیں اور پھر ریاستوں میں ودھان سبھا اور ودھان پریشد کے ممبران۔ اس پر گورنر اور صدر ونائب صدر جیسے نمائشی عہدے جو عوام کی فلاح وبہبود کے لئے کچھ بھی نہیں کرتے لیکن ملک کے خزانے پر عیش ضرور کرتے ہیں۔ اگر یہی سرمایہ عوام کو بنیادی سہولیات مثلاً تعلیم اور صحت عامہ فراہم کرنے پر خرچ ہوتو عوام الناس کا کس قدر فائدہ ہوگا اس کا اندازہ صدر اوبامہ تو نہیں لگا سکتے لیکن ہندوستانی عوام کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جنھیں بلا معاوضہ جمہوریت کا بوجھ اپنے کاندھوں ڈھونے کے لئے مجبور کردیا گیا ہے۔ عوام اس بات سے بھی واقف ہیں کہ ان کے نمائندے محض سرکاری خزانے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انکی رشوت کی کمائی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہے۔ ابھی حال میں وزیر مواصلات اے راجہ کو سرکاری خزانے کے ہزاروں کروڑ روپے کا نقصان کرنے کے الزام میں استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ کروڑوں روپے بالو نے خیرات نہیں کئے بلکہ اس کا بڑا حصہ یقیناً ان کے اپنے ذاتی خزانے میں پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ سیاستداں جس طرح سرکاری املاک پر ناجائز قبضہ کرتے ہیں اس کی مثال آدرش سوسائٹی گھوٹالہ میں مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ اشوک چوہان نے پیش کی جن کو دودھ کا دھلا سمجھا جاتا تھا اور جو اوبامہ کے پہلے میزبان بھی تھے۔ دنیا کے ۱۸۰ ممالک میں بدعنوانی وشفافیت کے حوالے سے ہندوستان کا نمبر ۸۴ ہے لیکن سوئس بنکوں میں کالا دھن کے معاملے ہندوستان اول نمبر پر آتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق ہر سال ہندوستانی عوام اپنی بنیادی سہولیات کے حصول کی خاطر ا یک ہزار کروڑ روپئے رشوت دینے پر مجبور کئے جاتے ہیں اور بدلے میں انہیں جو کچھ ملتا ہے اسے ساری دنیا نے دہلی کے لکشمی نگر میں ایک چار منزلہ عمارت کے منہدم ہونے پر دیکھ لیا جس کے نتیجہ میں ۶۵ غریب لوگوں نے اپنی جان گنوائی نیز ۸۰ زخمی ہوئے حکومت کے پاس دولت مشترکہ کے کھیل کو منعقد کرنے کے لئے ۸۰۰۰ کروڑ روپئے کی خطیر رقم ہے لیکن غریبوں کو رہائش فراہم کرنے کے لئے سرمایہ نہیں ہے۔

براک اوبامہ جانتے تھے ہندوستانی عوام کی ان سے کیا توقعات ہیں وہ امریکی صدر کی زبان سے اپنی تعریف سن کر کس طرح پھولے نہیں سماتے۔ اس لئے وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور مذہب کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک کہہ گئے کہ ان کے باعث ساری دنیا کو عزت ووقار کے

ساتھ زندہ رہنے کا سبق ملا ہے حالانکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ ہندوستان کے سناتن دھرم اور اس میں پائے جانے والے ورن آشرم (ذات پات کا نظام) نے انسانی اقدار کو جس طرح پامال کیا اس کی کوئی اور مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ براک اوبامہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان فی الحال سلامتی کاؤنسل کا مستقل ممبر بننے کے خواب بن رہا ہے اس لئے انہوں نے وہ گاجر بھی بڑی خوبی سے دکھلایا لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جس وقت اقوام متحدہ میں سکریٹری جنرل کے عہدے کے لئے ڈاکٹر ششی تھارور کو ہندوستان نے اپنا امیدوار بنایا تھا، اس وقت امریکہ ہی نے بن کی مون کی حمایت کر کے ہمارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ بقول شاعر (معذرت کے ساتھ) ؎

تمہیں بتاؤں یہ دنیا غرض کی دنیا ہے
مری وفا پہ کبھی انحصار مت کرنا

سیاست و جمہوریت کے ایک نہایت اہم پہلو کی جانب براک اوبامہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا اس دہائی میں ہندوستان کے اندر دو متضاد نظریات کی حامل جماعتوں نے امریکہ کی دو مخالف جماعتوں کے اقتدار کے باوجود دوستی کے عمل کو جاری رکھا یہ اس بات کا ثبوت ہے ظاہری طور پر کانگریس و بی جے پی کے درمیان نظر آنے والا فرق اور ری پبلکن یا ڈیموکریٹس کے درمیان دکھائی دینے والے تضاد کی حقیقت میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ امریکی ہاتھی اور گدھے کے اندر ایک ہی روح کار فرما ہے بی جے پی کے کمل اور کانگریس کے نشان پنجہ کے درمیان زبردست یکسانیت پائی جاتی ہے اگر چہ پنجے میں پانچ انگلیاں ہیں تو کمل کی پنکھڑیاں بھی پانچ ہی ہیں اسی پنجہ کو تھوڑا سا موڑ دو تو بڑی آسانی سے کمل بن جاتا ہے۔ اس راز سے اوبامہ تو واقف ہیں لیکن ہندوستان کی بھولے بھالے عوام اسے نہیں سمجھ پاتے۔

خوشحالی اور ترقی کے باب میں براک اوبامہ نے اور ہندوستان کے ترقی یافتہ ملک ہونے کا اعلان بڑے زور و شور سے کیا لیکن اس سے زمینی حقائق تو نہیں بدلتے۔ ایک نئے مطالعاتی جائزے کے مطابق بھارت کی آٹھ ریاستوں میں رہنے والے غریب افراد کی تعداد سب صحارہ افریقہ کے غریب ترین ۲۶ ممالک سے زیادہ ہے۔ اس رپورٹ میں جنوبی ایشیائی اور افریقی ممالک میں غربت کا موازنہ کیا گیا ہے۔ مطالعاتی جائزے میں غربت کی پیمائش کے لیے صحت، تعلیم، پینے کے صاف پانی تک رسائی اور بجلی کی دستیابی جیسے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ بہار میں غریبی کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد اگر ۴۰ فی صد ہے تو اڑیسہ

میں ۴۳ فی صد ہندوستان کی اوسطاً فی فرد آمدنی ۱۰۳۰ ڈالر سالانہ ہے اور اس طرح اس کا نمبر دنیا بھر کے ممالک میں ۱۳۹واں ہے۔

صدر براک اوبامہ نے آزادی کے بعد کئے جانے والے معاشی اصلاحات کی تحسین کرنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں ہندوستان کے ذریعہ سوشلزم کو خیرباد کہہ کر سرمایہ دارانہ نظام کے اختیار کرلینے کی بڑی تحسین فرمائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جو ترقی وخوشحالی نظر آتی ہے وہ اسی ابتدائی دور کی عوامی فلاح وبہبود کی بدولت ہے جس میں سرزمین ہند پر تعلیم کے زیور سے آراستہ ایک خودکفیل نسل تیار ہوگئی۔ کھلی منڈی کا نظریہ اختیار کرنے کے نتیجے میں یہ تو ضرور ہوا کہ ۲۰۰۹ء کے اندر سو کروڑ ڈالر سے زیادہ دھن دولت رکھنے والی عالمی امیر ترین برادری میں ہندوستانیوں کی تعداد ۲۷ سے بڑھ کر ۵۴ ہوگئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سارے ملک کی ۲۵ فی صد دولت ان ۵۴ افراد کی جیب میں سما گئی اور بقیہ ۱۲۰ کروڑ لوگوں کے لئے صرف ۷۵ فیصد رہ گیا اس تفاوت کی گہری کھائی کو ترقی کا نام دینے والا شخص ہی براک اوبامہ سے بڑا احمق ہوسکتا ہے۔ گزشتہ دس سالوں کے اندر ملک میں بے روزگاری کی شرح ۵ فی صد سے بڑھ کر ۱۰ فیصد ہوگئی گویا صد فی صد اضافہ اور ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں ایک لاکھ کسان خودکشی پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کا وہ حسین تحفہ ہے جس سے ہندوستان کو امریکی استعماریت نواز چکی ہے۔ فی زمانہ ہندوستان کے کسان مزدور یوں محسوس کر رہے ہیں گویا ”منڈی میں کوئی روز مجھے بیچ رہا ہے۔“

تحفظ وسلامتی کے حوالے سے براک اوبامہ نے القاعدہ کا مشترک خطرہ بتا کر ہندوستان کو اپنا فطری حواری قرار دے دیا۔ ممبئی میں تاج پر حملہ سے متاثر ہونے والوں سے ملاقات اسی کوشش کی ایک کڑی تھی لیکن لفاظی سے قطع نظر سیکیورٹی کے معاملے میں امریکی انتظامیہ ہندوستان پر کس قدر اعتماد کرتا ہے اس کا ثبوت تو خود براک اوبامہ کے ذاتی حفاظتی انتظامات نے پیش کردیا اور یہ ظاہر کردیا امریکہ ہندوستان کو چین و افغانستان کے مدمقابل تو کسی قدر مفید جانتا ہے لیکن جب خود اپنے صدر کی حفاظت کا معاملہ آتا ہے تو ہندوستان کو نااہل قرار دیتا ہے اگر یقین نہ آئے تو براک اوبامہ کے حفاظتی انتظامات پر غائر نظر ڈالیں۔ اوبامہ کی حفاظت پر ۳۴ امریکی جنگی جہازوں کا دستہ تعینات تھا جن میں سے ایک ہوائی جہاز بردار سمندری جہاز بھی تھا جو ممبئی کے ساحل پر گشت کر رہا تھا۔ اوبامہ نے ہوائی اڈے سے قلابہ تک کا سفر فوجی ہیلی کاپٹر میں کیا۔ اوبامہ کے لئے [illegible] الطلاقی نظام سے لیس [illegible] جیٹ طیارے اور بیالیس گاڑیوں کا دستہ مہیا کیا گیا تھا۔ تاج ہوٹل [illegible] کمرات ریجنسی کے سارے

کمرے اوباما اور اس کے محافظوں کے لیے مختص کر دیئے گئے تھے۔ اوباما کی آمد سے قبل ۱۳ بھاری بوجھ اٹھانے والے جہاز جدید اوزاروں کیساتھ ہندوستان پہنچ چکے تھے ان کے ساتھ تین ہیلی کاپٹر بھی تھے۔ مشینوں کے علاوہ نہ صرف ۵۰۰ امریکی اہلکار بلکہ محافظ کتے بھی امریکہ سے آئے تھے گویا انسان تو انسان ہندوستانی کتوں کو بھی امریکی انتظامیہ نے اعتماد کے قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ ایسے میں ہندوستان کے ساتھ ۲۱ ویں صدی کی یادگار دوستی کا دعویٰ بالکل کھوکھلا نظر آتا ہے بلکہ اوباما کے اندر پائی جانے والی بے اعتمادی اور خوف وہراس کو دیکھ کر عاصم واسطی کا یہ شعر یاد آتا تھا

یہ روشنی کا سفر ختم کر رہا ہے

جو اپنے سائے کی جنبش سے ڈرنے والا تھا

اپنی تقریر کے آخر میں صدر اوباما نے ہندوستانی حکومت کو اپنی مستقبل کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ ہماری جمہوریت کی بقاء اس کو دوسرے ملک میں برآمد کرنے پر منحصر ہے نیز ہندوستان کو دوسرے ممالک میں ہونے والے انسانی حقوق کی پامالی پر خاموش رہنے کا طرز عمل بدلنا ہوگا۔ یہ دونوں ہی مشورے نہایت خطرناک ہیں۔ خود براک اوباما نے سرزمین ہند پر برما اور ایران پر تنقید کی لیکن کشمیر اور نکسلوادی مزاحمت پر انہوں نے چپی سادھ لی۔ اور وہ بولتے بھی تو کیا بولتے عراق جیسے دور دراز ملک پر اپنا غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے لیے امریکہ نے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار فوجی روانہ کئے جبکہ کشمیر جیسی ننھی سی ریاست میں ہندوستان کے ۷ لاکھ فوجی گزشتہ ساٹھ سالوں سے تعینات ہیں۔ امریکی تو عراق سے واپس جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں لیکن ہندوستانی فوجیوں کا کشمیر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا۔ جہاں تک شمال مشرقی علاقوں میں پائی جانے والی نکسلوادی مزاحمت کا سوال ہے یہ ایک خطرناک استعماری سازش کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے قدرت کے خزانے ان قبائلی علاقوں کی زمینوں میں دفن ہیں۔ ان کی جانب سے ہمیشہ ہی حکومتوں نے بے توجہی برتی اور انہیں پسماندہ چھوڑ دیا۔ لیکن اب حکومت ایک خاص مقصد کے تحت انہیں بنیادی سہولیات زندگی سے محروم رکھنے کی سازش میں شریک ہوگئی ہے تاکہ ان لوگوں کو اپنے علاقے خالی کرکے شہروں کی جھگی جھونپڑیوں میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ حکومت کے اہلکار دلالوں سے ان علاقوں کی معدنیات کو نکال کر اپنے آپ کو مالا مال کرنے کی خاطر بین الاقوامی سرمایہ داروں سے معاہدے کر رہے ہیں۔ اب اگر وہ قبائلی اپنی آبائی زمینوں کو خالی کرنے سے انکار کرتے ہیں تو نہ صرف ان پر ظلم وستم توڑا جاتا ہے بلکہ انہیں

دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے اور وزیر اعظم سے لیکر وزیر داخلہ تک سب ان کے خلاف ایک زبان ہو جاتے ہیں اس لئے کہ یہ سب معدنیات کی فروخت میں شریک کار ہیں اور ان غریبوں کو اپنی خوشحالی کی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ سرکاری فوجی و نیم فوجی دستوں کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے اور جو قبائلی غم و غصہ کا شکار ہو جاتے ہیں سیاستداں دور بیٹھ کر تماشہ دیکھتے ہیں اور بیان بازی کرتے ہیں۔ خود اوبامہ کے ساتھ سرمایہ داروں کی بڑی فوج موجود تھی جن کی نظر زیر زمین خزانوں پر ہے ایسے میں اوبامہ سے یہ توقع کرنا کہ وہ قبائلی مظلوموں کے حقوق کی بات کریں گے احمقوں کی جنت میں رہنے کی سی توقع تھی۔ بین الاقوامی استعمار، قومی سرمایہ دار اور سیاستدانوں کے استحصال کی چکی میں پسنے والے غریب ادیباسی عوام کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ۔

خود اہلِ کشتی کی سازشیں ہیں کہ ناخدا کی نوازشیں ہیں
وہیں تلاطم کو ہوش آیا جہاں کناروں نے ساتھ چھوڑا

دوسرے ممالک میں جمہوریت کی برآمد کا کھیل اور زیادہ خطرناک ہے اس کی زندہ مثال خود عراق کی تباہی و بربادی ہے۔ عراق کسی زمانے ایک نہایت خوشحال، تیل کی دولت سے مالا مال، طاقتور ترین عرب ملک ہوا کرتا تھا۔ امریکہ نے اس کے ذریعہ سے ایران میں جمہوریت کو بحال کرنے کا منصوبہ بنایا جس طرح کہ ہندوستان کے ذریعہ افغانستان میں خدمت لینے کی تیاری ہے۔ سیاسی اعتبار سے بھی ایران اور افغانستان میں کسی قدر مماثلت ہے، جس طرح آجکل افغانی حکومت امریکہ کی باجگذار ہے وہی صورتحال شاہ ایران کے زمانے میں ایران کی تھی۔ دونوں مقامات پر امریکی پٹھوؤں کا کام تمام کرنے کے فرائض اسلام پسندوں نے ادا کئے۔ ایسے میں عراق کو اپنی خدمات کا صلہ امریکہ نے فوج کشی اور ایک لاکھ سے زائد معصوموں کو شہید کر کے دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے اور ہجرت پر مجبور کئے گئے ان کی تعداد بے شمار ہے۔ ترقی و خوشحالی کا کہیں نام و نشان نہیں پایا جاتا امریکہ سے دوستی کے یہی ثمرات خدانا خواستہ ہندوستان کے حصہ میں بھی آسکتے ہیں، اس لئے امریکہ سے پینگیں بڑھانے سے قبل حکومتِ ہند کو دوسروں کے انجام سے عبرت پکڑ لینا چاہیے۔

ہندوستان کا دورہ ختم کر کے صدر اوبامہ انڈونیشیا روانہ ہوئے یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ہندوستان دنیا کا سب بڑا ہندو اکثریتی ملک ہے اور مسلمان یہاں سب سے بڑی اقلیت ہیں اس کے برخلاف انڈونیشیا سب سے کثیر آبادی والا مسلم ملک ہیں جہاں ہندو سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ لیکن انڈونیشیا سے اوبامہ آتش فشاں کے خوف سے اپنا دورہ مختصر کر کے بھاگ کھڑے ہوئے اور جاپان پہنچ کر چین

پر بلا واسطہ دباؤ بنانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ جنوبی کوریا کے ساتھ کاروباری معاہدہ کرنے میں ناکام رہنے کے بعد دھن دولت سے مالا مال جی ۲۰ ممالک کی کانفرنس میں چین کے خلاف سخت قرارداد پاس کروانے کی کوشش کی لیکن اس پر بھی لوگوں کو راضی نہ کر سکے۔ گویا اندرون ملک انتخابی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے صدر اوبامہ نے چین کو گھیرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ان کے ہاتھ ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ اور نہیں آیا، اس ایشیائی ممالک کے طویل دورے کے باوجود صدر اوبامہ کی حالت اس طرح ہے کہ۔

خشک رت میں جس جگہ ہم نے بنایا تھا مکاں<br>
یہ نہیں معلوم تھا یہ راستہ پانی کا ہے

# جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا

(قسط اول)

سرزمینِ ہند پر فی الحال غیر ملکی مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون اپنے ساتھ چالیس افراد کا وفد لے کر آئے اور ۷۰۰ ملین ڈالر کا کاروبار کر کے واپس ہوئے۔ اس امید پر کہ اس سے دوسو برطانوی بیروزگاروں کے ذریعہ معاش کا بندوبست ہو جائے گا۔ فرانس کے نکولس سرکوزی کے ساتھ ساٹھ افراد کا وفد تھا لیکن وہ ہندوستان کو ۱۵ بلین کے لڑاکا جہاز اور ہیلی کاپٹر فروخت کرنے کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر تجارتی کامیابی حاصل نہیں کر پائے۔ امریکہ کے براک اوبامہ کے ساتھ دوسو پندرہ تاجروں پر مشتمل وفد تھا اور انہوں نے ۱۰ بلین کا کاروبار کیا تا کہ پچاس ہزار امریکیوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ یہ نہایت دلچسپ صورتحال ہے جس میں نام نہاد ترقی یافتہ ممالک کے رہنما ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے دروازے پر دستک دینے کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ کسی زمانے میں دنیا بھر کے لوگ اپنے آپ کو خوشحال بنانے کے لئے امریکہ اور یوروپ کا رخ کیا کرتے تھے لیکن اب یہ صورتحال ہے کہ امریکی اور یوروپی حکومتیں اپنے شہریوں کی بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے دنیا بھر میں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ انگریزوں کی کھیپ کی کھیپ عرب ممالک میں نہ صرف کاروبار بلکہ ملازمت کی خاطر دوڑ لگا رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں زمانے کے الٹ پھیر جس کی پیشن گوئی علامہ اقبال نے اس طرح کی تھی ؂

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ایک زمانہ ایسا بھی تھا جبکہ انگریزوں کو اپنی اقتصادی ترقی پر بڑا ناز تھا اپنے احساسِ برتری

کے زعم میں وہ ساری دنیا کو اپنے آگے حقیر سمجھتے تھے۔ جوہری ٹکنالوجی کو وہ اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے۔ دوسروں کو اس سے محروم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال خام تھا کہ اس کی مدد سے وہ اقوام عالم کو بلاواسطہ اپنا غلام بنائے رکھیں گے لیکن آج حالت یہ ہے کہ کئی یوروپی ممالک یکے بعد دیگرے دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ سرکاری خسارہ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کو قرض پر گزارہ کرنا پڑ رہا ہے۔ عرصہ دراز تک جوہری دھماکوں کے باعث ہندوستان کا شمار ناپسندیدہ ممالک میں کیا جاتا تھا لیکن آج مغربی ممالک نہ صرف بھارت کو بلکہ عرب مملکتوں کو بھی جوہری ٹکنالوجی فروخت کر رہے ہیں۔ ایٹمی تکنیک گویا زرِ کم عیار ہوگئی ہے اور سربازار نیلام ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ تینوں نے ہندوستان کو نہ صرف ٹکنالوجی بلکہ جوہری ایندھن تک فراہم کرنے کی یقین دہانی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان تینوں ممالک کے رہنماؤں نے اپنے دورے کے دوران ایک طرف تو کشمیر جاری و ساری سرکاری دہشت گردی سے آنکھیں موند لیں اور دوسری طرف حکومتِ ہند کی دلجوئی کے لئے اپنے قدیم حلیف پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے میں بھی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

ان ابن الوقتوں کے بعد چین سے وین جیاباؤ ہندوستان تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ۴۰۰ تاجروں کی فوج تھی اور ان لوگوں نے ۲۰ بلین کے تجارتی معاہدوں پر دستخط کئے۔ لیکن اس زبردست تجارتی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے وین جیاؤ نے اپنے پیش رو انگریزوں کی طرح ہندوستان کو نہ تو اسلحہ یا جوہری ٹکنالوجی فروخت کرنے کی کوشش کی اور نہ سلامتی کاؤنسل کی رکنیت کا گاجر دکھلایا۔ جیاؤباؤ نے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے حوالے سے ہر قسم کی دشنام طرازی سے گریز کیا۔ یہ گویا منافقت اور چاپلوسی سے پاک یہ ایک خالص تجارتی دورہ تھا۔ سفارتی سطح پر حکومتِ ہند اپنے تمام تر رسوخ کے باوجود کشمیریوں کو چینی حکومت کی جانب سے عطا کردہ ویزے کی خصوصی رعایت سے باز نہ رکھ سکی۔ ہندوستان سے واپسی میں وین جیاؤ پاکستان گئے۔ پاکستان میں وین کا اسی طرح سے استقبال ہوا جیسا کہ ہندوستان میں براک اوبامہ کا ہوا تھا۔ انہوں نے ایوان کے اجلاس سے خطاب کیا اور دہشت گردی کے خلاف پاکستان کی قربانیوں کو سراہا۔ نیز ۲۴ بلین ڈالر سرمایہ کاری کے علاوہ پاکستان میں جوہری توانائی کا نیا ری ایکٹر تعمیر کرنے کا بھی یقین دلایا۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ اس سے پہلے بھی پاکستان کو جوہری ٹکنالوجی سے لیس کرنے کا اعزاز امریکہ بہادر کو نہیں بلکہ چین ہی کو حاصل ہے۔

دہلی کے مشترکہ اعلامیہ میں وین نے کہا کہ ہندوستان اور چین ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ شریک ہیں اور من موہن سنگھ نے بھی اس کی تائید میں کہا کہ دونوں ممالک کے لئے (اقتصادی) نشوونما کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ سیاسی مبصرین کے خیال میں چین اقتصادی اور فوجی میدان میں آج جہاں کھڑا ہے اس مقام پر پہنچنے کے لئے ہندوستان کو اسی تیز رفتاری کے ساتھ مزید بیس سال ترقی کرنی ہوگی اور اس وقت تک چین نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ چکا ہوگا اس لئے باہمی حریفائی بے معنی ہے ہاں اشتراک عمل یقیناً دونوں ممالک کے لئے فائدہ بخش ہے۔ ماہرین اقتصادیات وین جیاباؤ کے دورے کے بعد امکان ظاہر کرتے ہیں کہ ۲۰۱۵ء تک آپسی تجارت ۱۰۰ بلین کو چھولے گی۔ ان روشن تجارتی امکانات کے باوجود ہندوستان کی فکرمندی میں اضافہ ہوا ہے اس لئے کہ گزشتہ سال کی برآمدات میں چین کے ساتھ ہندوستان نے ۲۵ بلین کا خسارہ اٹھایا ہے یعنی ہندوستان کی برآمد چین سے ہونے والی درآمد کے مقابلے میں ۲۵ بلین ڈالر کم رہی ہے اور آئندہ بھی اس خسارے میں اضافہ ہی متوقع ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ان اقتصادی ناہمواریوں کے باوجود یہ دونوں پڑوسی ممالک ایک دوسرے کی بہت بڑی ضرورت بن گئے ہیں۔ چین فی الحال صنعتی پیداوار میں دنیا کا سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے جبکہ ہندوستان اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے اس کے برعکس ہندوستان نے کمپیوٹر اور آوٹ سورسنگ کے میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر کے اپنے آپ کو خوشحال کرلیا ہے اور اس کے باعث ہندوستان کی داخلی کھپت میں زبردست اضافہ ہوا ہے جبکہ چین کا اندرونی بازار ابھی گھٹنوں کے بل رینگ رہا ہے۔ اس صورتحال میں ہندوستان کی معیشت درآمد کا تقاضہ کرتی ہے اور چین کی ضرورت برآمد ہے۔ امریکی اور یوروپی منڈیوں کے معاشی بحران کا شکار ہوجانے کے بعد چین کو اپنی مصنوعات برآمد کرنے کے لئے نئے بازاروں کی تلاش ہے اور ہندوستان کو امریکی و یوروپی سامان کے مقابلے سستی اشیاء چین سے حاصل ہوجاتی ہیں اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورتوں کی فطری تکمیل بن گئے ہیں اور باہمی تعاون و اشتراک سے اپنی اپنی خوشحالی میں اضافہ کرسکتے ہیں اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ ان دو ابھرتی ہوئی عالمی طاقتوں کے درمیان اعتمادِ باہم کا شدید فقدان پایا جاتا ہے۔

ہند چینی تعلقات کے حوالے سے ان سوالات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہئے کہ وزیر اعظم من موہن سنگھ کے شمال مشرقی ریاست اروناچل پردیش کے دورے کی مخالفت چین آخر کیوں کرتا ہے؟ دلائی لامہ کے ایٹانگر جانے پر وہ کیوں بپھر جاتا ہے؟ چین کی جانب سے نیپال

، برما، بنگلہ دیش، سری لنکا اور پاکستان کو اپنا ہمنوا بنا کر ہندوستان کو چہار جانب سے گھیرنے کی وجہ کیا ہے؟ نیپال کی سرحد تک اسے ریلوے لائن بچھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ نیز دیگر جنوبی ایشیا کے ممالک مثلاً برما، بنگلہ دیش، سری لنکا اور پاکستان میں بندرگاہیں تعمیر کر کے ان کو اپنے بحری بیڑے کے لئے سازگار کرنے کی حکمت عملی چین نے کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ پاکستان کو جوہری اسلحہ سے لیس کرنے کا مقصد کیا ہے؟ ہندوستان سے لگی اپنی ۴۰۰۰ کلومیٹر لمبی سڑک کو صرف ۲۰۰۰ کلومیٹر کی بتلانے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ اور جموں کشمیر کے باشندوں کو اپنے ملک میں داخلے کے لئے براہ راست ویزا مہیا کرنے کا فیصلہ کس لئے کیا گیا ہے؟

چین کی جانب سے کئے جانے والے ان اقدامات کو ہندوستان بھی ٹھنڈے پسینوں برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایکطرف وہ چین کے سب سے بڑے حریف امریکہ سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ دوسری جانب چین کے سب سے قریبی دوست پاکستان کی گھیرا بندی تنگ سے تنگ تر کرتا جا رہا ہے۔ چین کی سرحد پر واقع سکم اور بھوٹان کو وہ چینی اعتراض کے باوجود پوری طرح نگل چکا ہے۔ چینی وحدت کے نظریہ یعنی تائیوان سے تبت واحد چین کو حکومتِ ہند کی تائید حاصل نہیں ہے نیز بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان چین کے مقابلے میں یوروپ اور امریکہ کا ہمنوائی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی تازہ مثال چین کے جلاوطن باغی رہنما لیاؤ ژیاوبو کو اوسلو میں نوازے جانے والے نوبل انعام کی تقریب میں شرکت ہے۔ چین نے بشمول ہندوستان کے کئی ممالک سے اس تقریب کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی تھی اس لئے کہ لیاوژاو کو نوبل انعام کا دیا جانا چین کے خیال میں اندرونِ ملک ہونے والی مجرمانہ سرگرمیوں کی حمایت کے مترادف ہے۔ ہندوستان نے چین کی اپیل کو ٹھکراتے ہوئے انعامی تقریب میں شرکت کی جبکہ اس کا مقاطعہ کرنے والوں میں نہ صرف روس بلکہ پاکستان، عراق، ایران اور سعودی عرب شامل تھے۔ یہ تقریب دراصل عالمی افق پر نمودار ہونے والے ایک نئے سیاسی توازن کا پتہ دیتی ہے۔ اس لئے کہ بائیکاٹ کرنے والوں میں امریکہ کے حریف روس اور ایران کے ہمراہ اس کے حلیف سعودی عرب، عراق اور پاکستان بھی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں جملۂ معترضہ کے طور پر لبنان کے بعد قطر کے فرمانروا الشیخ حماد بن خلیفہ الثانی کا اس ہفتہ وقوع پذیر ہونے والا ایرانی دورہ اور ایران و قطر کے درمیان کی جانے والی باہمی فوجی مشقیں قابل ذکر ہیں۔ ایک اور چونکا دینے والی حقیقت یہ بھی ہے کہ باوجود امریکی دوستی کے سعودی عرب میں سرکاری چینی کمپنیوں کو ایسی خصوصی مراعات حاصل ہیں جن

سے یوروپی وامریکی تجارتی ادارے محروم ہیں، یہ حقائق اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ سعودی عرب خود امریکہ کے مقابلے چین کو سب سے بڑی عالمی طاقت بن کر ابھرنے میں بالواسطہ مدد کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقتصادی بازی ہارنے کے بعد اب فرنگی جواریوں کی سیاسی بساط بھی الٹنے لگی ہے اور جہانِ نو کے پیدا ہونے کی مبارک ساعت کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

# تبت کی آفت

(قسط دوم)

چینی چہرے کی بناوٹ کچھ ایسی ہوتی ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے آیا یہ شخص ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستانی اور چینی رہنما جب اپنے سیاسی اختلافات پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ہونٹ مسکرا رہے ہوتے ہیں اور دل رو رہا ہوتا ہے۔ چینی وزیر اعظم وین جیاو باو نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ہندوستانی دورے کے اختتام پر کہا ''گو کہ ماضی قریب کے اندر ہند چینی تعلقات میں خاصے اتار چڑھاو آئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان دونوں ممالک کے درمیان دوستی و تعاون کی تاریخ دو ہزار سال پرانی ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ''تمام مسائل کو مکمل طور حل کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے صبر درکار ہے اور وقت لگے گا۔ اخلاص، باہم اعتماد اور حوصلہ ہی ہمیں ایک ایسے منصفانہ اور معقول حل سے ہمکنار کر سکتا ہے جو دونوں فریقوں کے لئے قابل قبول ہو''۔ اس بیان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا انتخاب حکمتِ چین کی جیتی جاگتی تصویر ہے لیکن اس رجائیت کے باوجود دہلی میں مقیم چینی سفیر ژانگ یان یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ ہمارے آپسی رشتے نہایت نازک ہیں اور بڑی آسانی سے بگڑ سکتے ہیں اس لئے یہ خصوصی توجہ کے طلبگار رہیں ورنہ پھر سے انہیں درست کرنا ایک نہایت مشکل کام ہوگا۔ چینی سفیر کا خیال کوئی سیاسی بیان بازی نہیں ہے اس لئے کہ ہندوستان اور چین کے درمیان جنگ کو ابھی نصف صدی نہیں گزری ہے۔

بھارت اور چین تعلقات اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتے جب تک کہ بنیادی اختلاف کی نوعیت کو سمجھا نہ جائے اور اس کا پائیدار حل نہ تلاش کر لیا جائے وگرنہ تجارتی تعلقات کو بگڑنے میں وقت نہیں لگتا۔ ہندوستان اور چین کے درمیان اختلاف کشمیر کے تنازعہ کی طرح ہے اور ان کے

درمیان کا کشمیر دراصل تبت ہے۔ یہ دونوں مسائل اپنی کیفیت کے لحاظ سے یکساں ضرور ہیں لیکن ان کی کمیت میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں بہت سارے لوگ تبت کو کوئی چھوٹا سا گاؤں اور وہاں کے بظاہر مظلوم نظر آنے والے مذہبی رہنما دلائی لامہ کو ایک بے ضرر انسان سمجھتے ہیں لیکن چین کا نقطہ نظر اس سے متضاد ہے۔ تبت دراصل چین کی دوسری سب سے بڑی ریاست ہے اور چین میں ہندوستان کی طرح ۲۹ چھوٹی چھوٹی ریاستیں نہیں ہیں۔ تبت کا رقبہ اتر پردیش سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ یعنی اتر پردیش جیسی پانچ ریاستوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ تبت کے برابر ہوں گی بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ ہندوستان کے مجموعی رقبے کا ۳۶ فی صد ہے۔ دلائی لامہ اس تبت کی آزادی کے خواہاں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ یہ علاقہ چین سے الگ ہو جائے۔ ہندوستان نے دلائی لامہ اور وہاں سے بھاگ کر آنے والے ہر رہنما کو اپنے ملک میں پناہ دے رکھی ہے اور تو اور ان لوگوں کی جلاوطن حکومت دھرم شالا کے مقام پر قائم ہے گویا ہندوستان کی نظر میں یہی تبت کی اصل حکومت ہے اور آج نہیں تو کل یہ پورے تبت کو چین سے الگ کر کے وہاں قائم ہو جائے گی۔ اس کارِ خیر کے لیے سارا مغرب دلائی لامہ کی اخلاقی اور مالی حمایت کرتا ہے لیکن ہندوستان نے اضافی طور پر پرورش اور دیکھ بھال کی بھی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔

تبت کی صورتحال اور ہندوستان کے رویہ کو ایک اور مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کل کو ایک تہائی ہندوستان نکسلوادیوں کے زیر اثر آ جاتا ہے اور وہ ہندوستان سے بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیتے ہیں۔ نکسلی رہنما کشن جی ہندوستان سے بھاگ کر نیپال چلے جاتے ہیں جہاں ماؤوادیوں کو اقتدار حاصل ہے۔ نیپال کی حکومت انہیں نہ صرف پناہ دیتی ہے بلکہ ان کے لئے جلاوطن حکومت کے قیام کا سارا انتظام بھی کر دیتی ہے تاکہ وہ بہار کی سرحد پر بیٹھ کر اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھ سکیں اور اسی کے ساتھ ساری دنیا کی ہند مخالف طاقتیں نیپال حکومت کے ذریعہ کشن جی کی مدد کرنے لگتی ہیں۔ ایسے میں کشن جی دنیا بھر کے دورے کر کے ہندوستان کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرتے پھریں اور انہیں نیپالی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل ہو تو کیا اس صورتحال میں ہند نیپال تعلقات استوار رہ سکیں گے؟ کیا محض تجارت کی بنیاد پر یہ دونوں پڑوسی ایک دوسرے کے دوست بنے رہیں گے؟ کیا اس وقت ایسا نہیں ہوگا کہ ہندوستان نیپال کی ناکہ بندی کر کے اس کا جینا مشکل کر دے؟ جیسا ایک بار کر چکا ہے اور جب پانی سر سے اونچا ہو جائے تو ہندوستان سے نیپال کی سرحدوں کے اندر ڈرون حملے ہونے لگیں اگر یہ حکمتِ عملی بھی کامیاب نہ ہو تو ہندی فوجیں نیپال کی

سرحدوں میں گھس کر نہ صرف جلاوطن حکومت کو اکھاڑ پھینکے جو ہندوستان میں شورش برپا کر کے اس کے حصے بخرے کرنا چاہتی ہو بلکہ اس نیپالی حکومت کو بھی سبق سکھائے جس کے بل بوتے پر بغاوت پروان چڑھ رہی ہو۔ آپ کہیں گے یہی ہوگا اور ہندوستان ایسا کرنے میں حق بجانب ہوگا بشرطیکہ یہ اس کے لئے ممکن ہو۔ اگر بین الاقوامی دباو کے باعث ہندوستان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ بھی ہو تب بھی ان دو ہمسایوں کے درمیان تعلقات تو یقیناً بگڑ جائیں گے۔ بھارت کے خلاف چین کی گھیرا بندی، پاکستان کی مدد، کشمیر کی سرحد کو ہندوستانی سرحد تسلیم نہ کرنا اور کشمیریوں کو ویزا کی خصوصی سہولت فراہم کرنا دراصل چینی بے اعتمادی اور غم و غصے کا نہ صرف اظہار ہے بلکہ مستقبل کی پیش بندی بھی ہے۔

ہندوستان کی جانب سے 'وحدتِ چین' کو تسلیم نہ کئے جانے کی اصل وجہ تبت کا تنازعہ ہے۔ ماضی کے تاریخی حالات اس صورتحال اور مملکتِ ہند کے رویہ کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ جس وقت ہندوستان میں آزادی کی جنگ جاری تھی چین میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں اشتراکی انقلاب برپا ہو رہا تھا ۱۹۴۹ء میں یہ مسلح انقلاب کامیاب ہو گیا اور اقتدار سے محروم ہونے والی چینی حکومت نے تائیوان میں حکومت قائم کر لی۔ یوروپ اور امریکہ نے شکست خوردہ جلاوطن سرکار کی بھرپور پشت پناہی کی اور بیجنگ کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا نیز اقوام متحدہ میں بھی چینی قوم کی نمائندگی وہی تائیوانی حکومت کرتی رہی۔ اس نازک وقت میں چین کو نہ صرف اپنے نظریاتی حریف یعنی سرمایہ دار یوروپ کی مخالفت کا سامنا تھا بلکہ اشتراکی سوویت یونین بھی اس کا مخالف بنا ہوا تھا اس لئے کہ وہ بھی چین کو اپنا حریف سمجھتا تھا، ہندوستان برما کے بعد دوسرا غیر اشتراکی ملک تھا جس نے بیجنگ حکومت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اقوام متحدہ میں اس کی نمائندگی کے لئے اپنی ساری قوت صرف کر دی اور وہیں سے ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ بلند ہوا لیکن اس شیشہ میں تبت کی وجہ سے بال پڑ گیا۔ دراصل تبت کے وفد نے ۱۹۴۷ء ہی میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور اس پر چینی حکومت نے تشویش کا اظہار کیا تھا لیکن حکومتِ ہند نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ پنڈت نہرو کے لئے اس وقت یوروپ اور امریکہ کی پذیرائی زیادہ اہمیت کی حامل تھی جس طرح آج من موہن سنگھ کے لئے امریکی خوشنودی قابل ترجیح ہے۔ دلائی لامہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہیں سی آئی اے کی جانب سے مدد ملتی رہی ہے۔ اس سال فروری میں وہ وائٹ ہاؤس کے اندر صدر اوبامہ سے ملاقات کر چکے ہیں۔ حکومت ہند نے دلائی لامہ کے سبب خود کو چینیوں کی نگاہ میں مشکوک بنا لیا۔ ۱۹۵۹ء میں جب اس تبتی رہنما کو پناہ دی گئی تو چاؤ این لائی نے اس کے نتائج سے متنبہ کیا لیکن پنڈت جی نے

پرواہ نہیں کی۔ دہلی کا دورہ کر کے باز رکھنے کی ناکام کوشش کی سو وہ بھی بے فائدہ رہی۔ بالآخر چینی ردعمل ۱۹۶۲ء کی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو جنگ کا آغاز ہوا سرخ آندھی نے ہندی فوج کو بری طرح کھدیڑ کر رکھ دیا۔ جنگ کے ایک ماہ بعد ۲۴ اکتوبر کو چین کی جانب سے تین شرائط پر جنگ بندی کی پیش کش ہوئی جسے حکومت ہند نے مسترد کر دیا چینی افواج کی پیش رفت جاری رہی یہاں تک کہ ۱۹ دسمبر کو چین نے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا اور اپنی فوج کو از خود لائن آف کنٹرول پر لے گیا۔ کولمبو معاہدے کے بعد ہندوستان بھی راضی ہو گیا۔ اس جنگ میں دونوں جانب کے ۵۰۰ فوجی مارے گئے اور ہندوستان نے الزام لگایا کہ اس کے ۳۳۰۰۰ ہزار مربع کلومیٹر علاقے کو چینیوں نے غصب کر لیا۔ اس کے برعکس چین کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا ۹۰۰۰۰ ہزار مربع کلومیٹر علاقہ ہندوستان کے قبضہ میں ہے۔ ان علاقوں کو ہندوستان نے جنگ کے ذریعہ حاصل نہیں کیا بلکہ آزادی سے قبل انگریزوں نے شمال مشرقی سرحد پر چین کے بڑے علاقے پر غاصبانہ قبضہ جمار کھا تھا جسے وہ جاتے جاتے ہندوستان کو وراثت میں دے گئے۔ اروناچل پردیش کو چینی اپنے ملک کا حصہ گردانتے ہیں اسی لئے چینی حکومت وہاں کے باشندوں کو ویزا سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے اور دلائی لامہ یا منموہن سنگھ کے ایٹا نگر جانے پر ناراضگی جتاتی ہے۔

۱۹۶۲ء کی جنگ میں جن علاقوں سے ہندوستان کو ہاتھ دھونا پڑا ان میں سے ایک کیلاش پربت بھی ہے، ہندو عقائد کے مطابق ان کا معبود شیوا اپنی زوجہ پاروتی کے ساتھ وہاں قیام کرتا ہے۔ اس مقام پر موجود مانسرور جھیل کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے اسے اندر نے خود اپنی نگرانی میں بنوایا تھا اور اسکے مقدس پانی میں ڈبکی لگانے والے کو نروان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس علاقے کو ہندو مذہب کے علاوہ بودھ، جین اور تبت کے قدیم دین بون میں بھی مقدس مانا گیا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ رام جنم بھومی کے لئے ہنگامہ کرنے والا سنگھ پریوار کبھی بھی شیوا استھان کی بازیابی کا کلمہ اپنی زبان پر نہیں لاتا بلکہ اٹل جی وزیر خارجہ بنتے ہیں تو چین کا دورہ فرماتے ہیں۔ ویسے بی جے پی جس نے خود اپنے صدر دفتر کے اندر بابری مسجد کی شہادت کے بعد تعمیر ہونے والے شیو پاروتی کے مندر کو میڈیا سینٹر بنانے کی خاطر مسمار کر دیا کیلاش پربت کی بازیابی کی بات کس منہ سے کر سکتی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شیوسینا بھی چین سے دوستانہ تعلقات کی وکالت کرتی ہے جبکہ اس کا نام نامی شیوجی سے منسوب ہے۔ بال ٹھاکرے کی ادارت میں نکلنے والے سامنا اخبار نے اپنے اداریے میں اعتراف کیا کہ ہم چین سے لڑنے کی جرأت اپنے اندر نہیں رکھتے اس لئے بہتر ہے کہ

امریکہ اور روس کے بجائے اس سے دوستی کر لی جائے۔ اس کا کم از کم فائدہ یہ ہوگا کہ ہم پاکستان کے حامی کو توڑ کر اسے کمزور کر دیں گے۔ بالا صاحب تھاکرے شاید اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ جس زمانے میں سوویت یونین چین سے زیادہ طاقتور تھا افغانیوں نے اسے شکست دی تھی اور گزشتہ دس سالوں سے وہ امریکہ اور اس کے حواریوں سے نبرد آزما ہیں، ناٹو فوجیں انہیں زیر کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں اور وہاں سے فرار کے بہانے تلاش کر رہی ہیں، امریکی سکریٹری برائے افغان و عراق اسی صدمہ سے پرلوک سدھار چکے ہیں۔ اس سرکاری رپورٹ کی اشاعت سے قبل جس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ افغانستان میں کامیابی ناممکن ہے رابرٹ ہولبروک اس دار فانی سے چل بسے۔ اس لئے اگر حکومتِ ہند سامنا کے اس احمقانہ مشورے کو مان لے اور بال ٹھاکرے کی توقعات کے مطابق چین پاکستان سے تعلقات توڑ کر ہندوستان کا ہمنوا بن جائے تب بھی وہ دونوں ملکر پاکستان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ اس لئے کہ دس سالہ طویل جنگ میں روس اور امریکہ کی حمایت کے باوجود عراق کو ایران میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب دشمنوں کے آلہ کار بنتے ہیں ذلیل و خوار ہوتے ہیں لیکن جب اللہ کے بھروسے جہاد کرتے ہیں تو کامیابی و کامرانی انہیں کے قدم چومتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضورؐ نے

# شاخِ نازک پہ آشیانہ

امریکی ذرائع ابلاغ میں اسامہ بن لادن کے بعد ایک افریقی مسلم مطلقہ محترمہ نفیسہ تاؤدیالو موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ گیانہ سے تعلق رکھنے والی یہ ۳۲ سالہ مہاجر خاتون اپنی جوان بیٹی کے ساتھ برونکس میں رہتی ہے اور نیویارک کے امیر ترین علاقے مین ہیٹن میں واقع سوفی ٹیل ہوٹل میں ملازمت کرتی ہے۔ اس کا الزام ہے کہ ہوٹل کے ایک گاہک نے اس پر دست درازی کی۔ اگر وہ دست درازی کرنے والا شخص ایک عام آدمی ہوتا تو شاید یہ سرے سے کوئی خبر ہی نہیں بنتی اس لئے کہ جنس زدہ امریکی معاشرے میں عصمت دری ایک معمولی جرم ہے جو آئے دن سرزد ہوتا رہتا ہے قومی اعداد و شمار کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر منٹ کے اندر ۱۰۳ خاتون کی عصمت دری ہوتی ہے گویا ہر گھنٹہ میں ۷۸ اور سالانہ ۶۸۳۲۸۹ خواتین کو اس اذیت ناک جرم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ سروے کے دوران یہ خوفناک حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ اس نام نہاد ترقی یافتہ ملک میں ہر تین میں سے ایک خاتون کو اپنی زندگی ایک بار اس طرح کی صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہر چار میں سے ایک طالبہ یا تو اس ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ گوکہ نفیسہ کا تعلق نیگر و نسل سے ہے لیکن اعداد و شمار اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ عصمت دری کا شکار ہونے والوں میں ۸۱ فی صد گوری اور صرف ۱۸ فیصد کالی خواتین ہیں۔ امریکہ اس معاملے میں جرمنی سے چار گنا اور برطانیہ سے ۲۰ گنا آگے ہے۔

نفیسہ کے معاملے میں چونکہ ملزم بین الاقوامی مالیاتی فنڈ ( آئی ایم ایف ) کا سربراہ ڈومنق سٹراس کاہن تھا جسے اب ذلیل و خوار کر کے اس کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ عالمی سطح پر ایک بہت بڑی خبر بن گئی۔ کاہن کو اول تو گرفتار کیا گیا اور پھر اسے ہتھکڑیوں سمیت میڈیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی دس لاکھ ڈالر کی درخواستِ ضمانت مسترد کر کے جیل کی

سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیا گیا اس خیال سے کہ ۶۲ سالہ امیر کبیر، کیم شحیم سرمایہ دار کہیں فرار ہو کر اپنے ملک فرانس نہ پہونچ جائے۔ فرانس کے اندر کسی مجرم پر ہاتھ ڈالنا امریکہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ تو صرف زرداری کی لاچاری کے چلتے پاکستان میں ہوسکتا ہے یا پھر مشرف جیسا بے ضمیر جنرل سینہ پھلا کر بڑے فخر سے اس طرح کی رسوائی کو برداشت کرسکتا ہے۔ اب ناقدین کا یہ اعتراض ہے کہ امریکی انتظامیہ کو چاہئے تھا کہ اسامہ بن لادن کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلاتے جو گوناگوں وجوہات کی بناء پر وہ نہ کر سکے تو اب کھسیانی بلی کی مانند اپنے عدلیہ کو مصروف رکھنے اور اپنے ملکی قانون کی بالادستی کا ڈنکا بجانے کی خاطر کاہن کو بلی کا بکرہ بنایا جارہا ہے۔

اس موقع پر یہ سوال بھی کیا جارہا ہے کہ امریکی انتظامیہ نے جس چستی اور پھرتی کا مظاہرہ ڈومنق کاہن کے معاملے میں کیا ویسا کچھ صدر بل کلنٹن کے ساتھ کیوں نہ ہوا؟ جبکہ وہ ان پر بھی اسی طرح کا الزام دوران صدارت نہ صرف لگا بلکہ ثابت بھی ہوگیا۔ معاشی میدان میں ابھی گزشتہ ہفتہ امریکی انتظامیہ نے وہاں کے پانچ بڑے بنکوں کو تقریباً ۳۰ بلین ڈالر کے گھپلے میں ملوث پایا لیکن ان کے سربراہان کے ساتھ بھی ایسا کوئی معاملہ نہیں ہوا۔ اس سے قبل امریکی شیئر بازار (وال اسٹریٹ) سے ایک ٹریلین ڈالر چرا کر امریکہ کو معاشی کساد بازاری کے شعلوں میں جھونکنے والے سرمایہ دار بھی اس طرح کے سلوک سے محفوظ و مامون رہے۔ برٹش پٹرولیم کے سربراہ ٹونی ہیورڈ جو بحیرہ برازیل میں عظیم ماحولیاتی تباہی کے مجرم ہیں اس طرح کی رسوائی سے بچے رہے بلکہ جارج بش جو اپنی حماقت کے سبب دس لاکھ عراقیوں کی ہلاکت کا سبب بنا اس کی جانب بھی عدلیہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ تو ایک ایسا جنگی مجرم ہے جس پر نہ صرف امریکہ بلکہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔

ایک اور اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عالمی بنک کا سربراہ رابرٹ ذوئلک جو امریکی شہری ہے اگر فرانس کے اندر اسی طرح کے الزام میں گرفتار ہوا ہوتا اور اسے میڈیا کے سامنے اس طرح رسوا کیا جاتا۔ اس کی ضمانت رد کر کے اسے جیل بھیج دیا جاتا تو کیا یہ امریکی ذرائع ابلاغ جو کاہن کے خلاف تین دنوں میں ۳۰۰۰ مضامین لکھ کر اسے مجرم ٹھہرا چکا ہے رابرٹ کی بھی اسی طرح کردار کشی کر رہا ہوتا؟ یا اس کی فوری رہائی کی گہار لگا رہا ہوتا؟ نیز فرانس کے اندر انسانی حقوق کی پامالی کا چرچا کر رہا ہوتا؟ ذرائع ابلاغ کو چھوڑیں جس کی حیثیت فی الحال ڈگڈگی بجانے والے مداری کی سی ہوگئی ہے تصور کریں کہ اس فرضی صورتحال میں امریکی حکومت کا ردعمل کیا ہوتا؟ جو انتظامیہ ریمنڈ ڈیوس جیسے

سفاک کرائے کے قاتل کو چھڑانے کے لئے اپنی کانگریس کے تین تین وفد روانہ کر دیتا ہے وہ اپنے ملک کے اس قدر اہم سرمایہ دار کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا؟ صدر اوبامہ کا سرکوزی کو فون کتنے منٹ کے اندر موصول ہو جاتا؟ اور اس پر پتھر اور نہ جانے کس کس زمانے میں پہنچا دینے کی دھمکی دی جاتی۔ ان گیدڑ بھبکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگر نکولس سرکوزی اپنے موقف پر اڑا رہتا تو کتنی دیر میں ان کے ملک میں امریکی فوج داخل ہو جاتی اور پیرس کے آسمان سے ایف ۱۶ اور ڈرون کی بارش شروع ہو جاتی؟ ایسے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرانسیسی صدر سرکوزی نے ایک رسمی سا بھی احتجاج کیوں نہیں درج کروایا؟ کم از کم ایک فون کر کے یا اخباری بیان جاری کر کے کاہن کو اپنے ملک بھجوانے اور اس پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ یہ تو کم از کم اقدامات ہیں جنھیں فرانس جیسی ویٹو پاور رکھنے والی ایٹمی طاقت تو کجا ہندوستان جیسا مسکین ملک بھی کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور اس کی وجہ امریکہ کا خوف نہیں بلکہ فرانس کی داخلی جمہوری سیاست ہے۔

فرانس میں آئندہ سال انتخاب ہونے والے ہیں اور اباحیت پسند سرکوزی کو پھر ایک بار انتخاب میں کامیابی حاصل کرنی ہے۔ فسطائی ذہن کے مالک اس شخص نے برسوں تک مسلم دشمنی اور نسلی امتیاز کی بنیاد پر اپنی سیاسی دوکان چمکائی لیکن اب انتخابی شکست کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اسی لئے اپنے بدمزاج رائے دہندگان کی دلجوئی کے لئے اس نے برقعہ کے خلاف ہوا کھڑا کیا اور پھر حجاب مخالف قانون منظور کروا کر ان کی تسکین کا سامان کیا۔ اس کے بعد لیبیا میں ناٹو کے ساتھ پیش قدمی کر کے اپنے آپ کو نپولین کا حقیقی وارث ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ سرکوزی کی اس انتہا پسند سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جمہوریت میں اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے سیاستدانوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ابتری اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ ایسے میں ان کی قدامت پرست یوایم پی کے خلاف محاذ آرا سوشلسٹ پارٹی کا سب سے طاقتور امیدوار کوئی اور نہیں بلکہ ڈومنک سٹراس کاہن ہی تھا جو آئندہ ماہ سے اپنی پارٹی کی باقاعدہ مہم کا آغاز کرنے والا تھا۔ بین الاقوامی مالی ادارے کا صدر اور سوشلسٹ پارٹی کا امیدوار یہ دونوں باتیں ان لوگوں کو متضاد ضرور لگیں گی جو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولر انتخابی سیاست میں اصول و نظریہ نام کی کوئی شئے پائی جاتی ہے۔ کاہن ایک سوشلسٹ دانشور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ فرانس کی سوشلسٹ پارٹی میں اس کا اعلیٰ وارفع مقام ہے اور دنیا بھر کے سرمایہ داروں سے اس کے گہرے مراسم بھی ہیں جنکی وہ اپنے ادارے کے ذریعہ دام درہم سخن قدم مدد کرتا رہتا ہے تاکہ وہ سارے عالم

کا استحصال جاری وساری رکھ سکیں۔ اس طرح گویا سرکوزی کو اپنے سب سے طاقتور حریف سے نجات حاصل ہوگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کاہن کی گرفتاری پر مضطرب و بے چین ہونے کے بجائے شاداں وفرحاں ہے۔ اس واقعہ سے قبل سرکوزی کی مقبولیت محض ۲۱ فی صد تھی اور کاہن کی ۲۶،۵ فی صد گویا ان دونوں کے درمیان ۵،۵ فی صد کا فرق تھا لیکن اب جبکہ کاہن دوڑ سے باہر ہو چکا ہے اس کی جگہ لینے والے سوشلسٹ امیدوار فرا کوس ہالنڈی کو صرف ایک فی صد کی سبقت حاصل ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ فی الحال سرزمین فرانس میں انتہا پسند لی پین سب سے زیادہ مقبول چل رہی ہے لیکن مسلمانوں کے اندر انتہا پسندی کا شور مچانے والے مغرب کو ہندوستان کے اڈوانی اور فرانس کے لی پین سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

فرانس کے اندر کاہن کی گرفتاری کے حوالے سے مختلف قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں جن سے اس قوم کے فکری انحطاط واخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کاہن جیسا عیاش شخص ایک افریقی ملازمہ کے لئے اپنے سیاسی مستقبل کو داؤں پر نہیں لگا سکتا اس لئے ممکن ہے وہ کسی خوبصورت امریکی طوائف کا انتظار کر رہا ہوگا اور ایسے میں غلطی سے وہ ملازمہ وہاں پہنچ گئی نیز کاہن اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ گویا غلطی کاہن کی نہیں ملازمہ کی ہے۔ کاہن کا کسی طوائف کا انتظار کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو کسی قدر افسوس کاہن کے انجام سے تو ہے لیکن افریقی ملازمہ سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں اس لئے کہ یہ بیچارے کسی خاتون کو انسان ہی کب سمجھتے ہیں؟ صنف نازک تو ان کے لئے نمائش و سامانِ تلذذ سے زیادہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی اسی لئے وہ انہیں ہمیشہ بے حجاب رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سال کے اوائل میں خود کاہن کا اعتراف اس خیال خام کی تردید کرتا ہے۔ کاہن نے پیرس سے شائع ہونے والے دائیں بازو کے روزنامہ لبریشن (حریت) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ صدارت کی دوڑ میں اس کے راستے کی تین رکاوٹیں ہیں ''دولت، عورت اور میرا یہودی ہونا'' فرانس کے دیہی علاقوں میں آج بھی یہودیوں کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے اور انتہا پسند لی پین اس کا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن کاہن کی پیش گوئی اس حد تک سچ ثابت ہوئی کہ انتخاب سے قبل ہی اس کی زن پرستی نے اس کی لٹیا ڈبو دی اور اس کے دھن دولت کے خزانے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

فرانس کے عوام کے اندر سوشلزم کا حامی طبقہ قوم پرست فرانسیسی عوام سے دو ہاتھ آگے ہے۔ ان کے خیال میں نفیسہ سی آئی اے کی ایجنٹ ہے۔ چونکہ امریکی انتظامیہ صدر سرکوزی کا حامی

ہے اس لئے اس نے جان بوجھ کر یہ سازش رچی اور کاہن کا سیاسی مستقبل تباہ و برباد کر دیا تا کہ ۲۰۱۲ء کے انتخابات میں سرکوزی کی مشکلات کم کی جا سکیں اور وہ پھر ایک بار آسانی سے منتخب ہو جائے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ نیویارک کے بڑے ہوٹلوں میں صفائی کی خاطر کوئی ملازم تنہا کمرے میں نہیں جاتا بلکہ وہ کم از کم دو ہوتے ہیں اور خاص طور پر کاہن جیسی نہایت اہم شخصیت کے کمرے میں تو کوئی اکیلے جا ہی نہیں سکتا گویا یہ نام نہاد اہم ترین شخصیات انسان نہیں بلکہ خونخوار درندے ہیں۔ ان کے مطابق پولس کی بیجا سختی اور میڈیا کی غیر معمولی دلچسپی بھی اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ نفیسہ کوئی 'ماتاہاری' نہیں ہے جو حقیقت میں فرانس کی ایجنٹ تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے دوران جسے جرمنی کے لئے جاسوسی کرنے کا الزام لگا کر فرانسیسی فائرنگ اسکواڈ نے ۱۹۱۷ء میں گولیوں سے بھون دیا تھا اور بعد میں پتہ چلا کہ اس پر لگایا جانے والا الزام بے بنیاد تھا اور وہ معصوم تھی۔

ایک تازہ سروے کے مطابق فرانس کے ۷۰ فی صد سوشلسٹ رائے دہندگان کے خیال میں کاہن معصوم ہے اور ۵۴ فیصد عام ووٹرس بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ اس کو سیاسی سازشں میں پھنسایا گیا ہے گویا ۳۰ گھنٹے جیل میں گزارنے کے بعد بھی فرانسیسی رائے عامہ کاہن کے حق میں ہے۔ یہ مغرب کے اس ملک کا حال ہے جہاں سے کسی زمانے میں یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تھا۔ جس نے مغرب کو حریت و جمہوریت سے نوازہ۔ کاہن کے واقعہ نے اس حقیقت کو کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ لادینیت کی شاخ نازک پر مغربی جمہوریت کا یہ ناپائیدار آشیانہ فی الحال آندھی کی زد میں ہے۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت اقتدار کی منتقلی کا مہذب ترین طریقہ ہے تو ایسے لوگوں کی مغرب زدگی پر ماتم کرنا صرف اور صرف اپنے وقت کا ضیاع ہے۔

سیاست کے علاوہ کاہن کی اپنی اقتصادی دنیا کے بھی بہت سے لوگ ان واقعات پر خوشی منا رہے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ابھرتی ہوئی معیشتوں سے ہے مثلاً ہندوستان، جنوبی افریقہ اور ترکی وغیرہ۔ کاہن کے جانشین کے طور پر ترکی کے کمال درویش کی دعویداری سب سے پہلے سامنے آئی اور اس کے بعد مونٹیک سنگھ اہلووالیا کا نام بھی اچھالا جا رہا ہے۔ یہ ممالک دراصل بین الاقوامی مالی اداروں پر سے یوروپی تسلط کا خاتمہ چاہتے ہیں اور کاہن کا بے آبرو ہو کر کوچے سے نکالا جانا ان کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ بن کر سامنے آیا ہے۔ مشرق کی آپسی رقابت کا فائدہ مغرب اٹھاتا رہا ہے بلکہ وہ مختلف ممالک کے اندر اپنے مفاد کے پیش نظر مخاصمت بھی پیدا کرتا رہا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اب ہوا

کا رخ بدلنے لگا ہے۔ یوروپ و امریکہ کی معاشی ابتری نے کہیں انہیں قلاش کر دیا ہے تو کہیں وہ قرض کے بوجھ تلے چرمرا رہے ہیں۔ اب دولت کے بازار میں ان کا وہ رعب واب خاصہ کم ہو گیا ہے ،ماضی کی تاریخ تو یہ ہے کہ گذشتہ ۳۳ سالوں میں سے ۲۶ سال آئی ایم ایف کی سربراہی فرانسیسیوں نے کی۔ اس ادارے کے کل ۲۴ ڈائرکٹرس ہیں جن میں سے ۹ یوروپ سے آتے ہیں۔ برازیل سے آنے والا ڈائرکٹر ۹ ممالک کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ اس کے ووٹ کی قیمت ۲۔۶ فی صد ہے اس کے بالمقابل امریکہ کے نمائندہ کا ووٹ اس سے چار گنا زیادہ قیمتی ہے لیکن ایسا کب تک چلے گا؟۔ اب تو چین بھی اپنی کامیابی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور یوروپی نمائندوں کی سازش کے باوجود اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ اس بار آئی ایم ایف کے اوپر سے یوروپ کی اجارہ داری ختم کردی جائے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس میں یقیناً نفیسہ کا حصہ قابلِ قدر ہوگا۔ ماضی میں اس بدمعاش کی درندگی کا شکار ہونے والی کئی خواتین کو اب ہمت بندھی ہے اور وہ ڈومنق کا ہن کے خلاف بیانات دینے لگی ہیں۔ یہ سب اس نام نہاد اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی ترقی پسند خواتین ہیں جن کو آزاد و خود مختار سمجھا جاتا ہے لیکن ان میں سے کسی نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف منہ کھولنے کی جرأت نہیں کی اس میدان میں بھی علم بغاوت بلند کرنے کا شرف مظلوم و مقہور گردانی جانے والی مسلم خاتون نفیسہ کے حصہ میں آیا۔ یہ تلخ حقیقت یوروپ اور امریکہ کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔

# آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے

(قسط اول)

اوسلو میں وزیر اعظم جینس اسٹولٹنبرگ کی کوٹھی کے باہر جس وقت بم دھماکہ ہوا امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کشمیری رہنما اور دانشور غلام نبی فائی کو پریشان کررہی تھی اور ممبئی پولس انڈین مجاہدین کا پیچھا کررہی تھی ۔ جب اوسلو سے بیس میل کے فاصلے پر یوٹویا نامی جزیرے میں ایک وحشی درندہ حکمراں لیبر پارٹی کے نوجوانوں پر گولیاں برسارہا تھا امریکی صدر براک اوبامہ نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم سے ملاقات کررہے تھے ۔ گولی باری کی اس دھماکہ خیز خبر پر بھلا امریکی صدر کیونکر چپ رہ سکتا تھا اس لئے اوبامہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے پیش رو جارج بش کی مانند بول پڑے "یہ بین الاقوامی برادری کے لئے ایک یاددہانی ہے کہ اس طرح کی دہشت کو روکنا انکی اولین ذمہ داری ہے اور ہمیں انٹلی جنس کے معاملے میں تعاون نیز حملوں کی روک تھام کے عملی اقدامات میں باہم تعاون کرنا چاہئے گویا اوبامہ نے ان واقعات کو بلاواسطہ اپنی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے جوڑ دیا۔ مثل مشہور ہے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اس لئے نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم جان کیی نے اوبامہ کی تائید میں کہا اگر یہ عالمی دہشت گردی کا واقعہ ہے تو میرے خیال میں اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کوئی بڑا یا چھوٹا ملک ان خطرات سے محفوظ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ نیوزی لینڈ افغانستان میں اپنا کردار ادا کررہا ہے تاکہ امریکہ اور دیگر ممالک کے تعاون سے دنیا کو محفوظ تر بنایا جاسکے۔ بیچارے جان کیی کا کوئی قصور نہیں اگر ان کی جگہ پاکستان کا صدر یا ہندوستان کا وزیر اعظم ہوتا تب بھی اپنے آقا کے آگے اسی طرح دُم ہلاتا۔ ویسے اگر ممبئی پولس کے اردلی کی رائے طلب کی جاتی تو اس میں اور اوبامہ یا جان کیی کے بیان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اسے کہتے ہیں ذہنی ہم آہنگی

اور باہم یکجہتی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ لوگوں کا ہم جہت ہو جانا اور اس جہت کا حق بجانب ہونا یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ اکثر لوگوں کا آہنگ یکساں تو ہو جاتا ہے لیکن وہ آہنگ درست نہیں ہوتا مثلاً اس سے پہلے کہ ناروے کی پولیس اس خطرناک دہشت گرد کو گرفتار کرتی نیویارک ٹائمز نے امریکی ماہر محقق میک کینٹ کے حوالے سے یہ انکشاف کیا کہ انصار الجہاد العالمی یعنی جہاد اسلامی کے عالمی مددگار نامی ایک دہشت گرد گروہ نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اس خیالی تنظیم اور انڈین مجاہدین میں نام کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہے۔

"اوسلو" کے اس قابل مذمت واقعہ پر اگر امریکی صدر "گوسلو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے تو بہتر تھا لیکن معیشت تو ویسے ہی دھیمے دھیمے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسیں گن رہی ہے۔ ریپبلکن کسی صورت قرض کی حد بڑھانے پر راضی نہیں ہو رہے ہیں امریکہ دن بدن تیزی کے ساتھ اپنے دیوالیہ پن کی جانب گامزن ہے ایسے میں اوبامہ جیسا گھاگ سیاست دان اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے والے اس نادر موقع کو کیونکر گنوا سکتا تھا۔ دراصل امریکی حکام اور ان کے حواریوں نے سوچا کہ یہ ان کی ہی کسی پالتو تنظیم کا کام ہوگا جو کبھی سامنے نہیں آئیگی اور یہ لوگ اس کے پس پردہ اسلام کی مخالفت کے اپنے گھناؤنے ارادوں کو بروئے کار لائیں گے لیکن قدرت کو اس بار کچھ اور منظور تھا ۳۲ سالہ بریوک نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی کارکردگی کا اعتراف کر لیا جسے وہ جرم نہیں سمجھتا۔ اس کے اپنے وہم وگمان کے مطابق وہ حالت جنگ میں ہے اور ایسی صورتحال میں چونکہ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ معصوموں کی خونریزی کی جائے اس لئے یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ کار خیر ہے۔ یہ ہے نصرانی مغرب کا معیار اخلاق جس کو خوشنما پردوں میں چھپا کر ساری دنیا کے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اس کام کو کس طرح انجام دیا جاتا ہے اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔

امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی نے ۲۰۰۵ء میں جب دہشت گردی کے متعلق اپنی تحقیقات کو شائع کیا تو ذرائع ابلاغ نے اعلان کیا کہ سارے دہشت گرد مسلمان ہیں سوائے ۹۴ فیصد کے جی ہاں ۱۹۸۰ء سے لیکر ۲۰۰۵ء تک امریکی سرزمین پر ہونے والے دہشت گردی کے اعداد وشمار بتلاتے ہیں کہ ان میں سے ۶ فیصد کا تعلق مسلمانوں سے تھا ۴۲ فیصد لاطینی، ۲۴ فیصد انتہا پسند دایاں بازو جیسے ہندوستان کے نکسلوادی اور تو اور امریکیوں کے منظور نظر انتہا پسند یہودی بھی مسلمانوں سے آگے ہیں اور ان کا حصہ ۷ فی صد تھا۔ عام دائیں بازو کی جماعتیں ۵ فیصد حملوں کے لئے ذمہ دار پائی گئیں اور دیگر لوگوں کا مجموعی حصہ ۱۲ فیصد تھا۔ یاد رہے یہ ایف بی آئی کے سرکاری

اعداد و شمار ہیں۔ یورو پول کے مطابق یوروپ میں ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء کے دوران ۹۹۶ دہشت گردی کی وارداتوں میں غیر مسلم ملوث پائے گئے۔ جن میں سے ۸۴۸ فی صد علیحدگی پسند لوگوں کے حملے تھے اور باقی ۱۶ فیصد دائیں بازو کی جماعتوں کا کارنامہ تھا صرف ۰.۴ فی صد دہشت گردی میں یوروپین پولس نے مسلمانوں کو ملوث پایا۔ ۲۰۰۹ء کے مقابلے ۲۰۱۰ء میں دائیں بازو والوں کے حملے ۲۱ سے بڑھکر ۴۵ ہو گئے گویا ۱۰۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ اس کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی نام نہاد جنگ نہ صرف ذرائع ابلاغ میں بلکہ میدان عمل میں زور و شور کے ساتھ چھڑی ہوئی ہے۔

ناروے میں ہونے والے واقعہ کے بعد شہر اوسلو کے ایک مسلمان کے بیان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مہم کس قدر کامیاب ہے۔ بی بی سی کے نامہ نگار سٹیفن اونا اس کے مطابق اوسلو شہر میں علی نامی ایک شخص نے بتایا کہ ''بہت سارے افراد کا شروع میں یہ خیال تھا کہ بم دھما کہ میں القاعدہ ملوث ہے۔ ناروے ایک ایسا ملک ہے جو ہر کسی کو قبول کرتا ہے اور ہر کسی کو خوش آمدید کہتا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ ایک نارویجن نے یہ کام کیا ہے تو مجھے دھچکا لگا، وہ شخص نفرت سے لبریز تھا'' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے بہت سارے لوگوں نے ایسا کیوں سوچا کہ اس میں القاعدہ ملوث ہے۔ نیز جس طرح کا دھچکا علی اور اس جیسے لوگوں کو اس وقت کیوں لگا جبکہ انہیں پتہ چلا کہ اس میں ایک مقامی شخص انڈر یو بیرنگ بریوک ملوث ہے جو عیسائی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی دائیں بازو کی سوچ کا حامی بھی ہے۔ کیا اس طرح کی حیرت کا اظہار اس وقت بھی کیا جاتا جبکہ انہیں بتایا جاتا کہ یہ حملہ القائدہ نے کیا ہے؟ یہ بات قابل غور ہے کہ جب اس طرح کے حملوں کو مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا ہے تو اس کی حمایت میں نقلی ویڈیو بنا کر ٹیلی ویژن سے نشر کی جاتی ہیں اور یوٹیوب کے ذریعہ ان کی جی بھر کے تشہیر کی جاتی ہے اس کے برعکس بیرنگ بریوک کی ایک اصلی ویڈیو کو جس میں اس نے اپنے عزائم کا اظہار اور جرائم کا اعتراف کیا تھا دوسرے ہی دن یوٹیوب سے ہٹا لیا گیا۔ ناروے کے ذرائع ابلاغ کے مطابق یہ ویڈیو بریوک نے بنائی تھی جس میں اسلام، مارکسزم اور کثیر الثقافتی معاشرے کے خلاف غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔

انرش بیرنگ بریوک نے ایک ہزار پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک دستاویز مرتب کی جسے وہ خود ساختہ منشور کہتا ہے اور اس نے اسے یوٹیوب پر موجود ایک ویڈیو کے ساتھ یورپ بھر میں ڈھائی سو افراد کو حملے سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے قبل ای میل کیا۔ بیلجیم میں دائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھنے

والے ایک رکن پارلیمان تانگوئے ویز کو بھی اسی طرح کا ایک ای میل کیا گیا۔ تقریباً ایک چوتھائی افراد جنہیں ای میل کیا گیا برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ جرمنی، اٹلی، فرانس اور دیگر ممالک کے لوگ بھی ای میل وصول کرنے والوں میں شامل ہیں لیکن سب سے بڑی تعداد برطانیہ کی ہے۔ انرش بریوک کا نام استعمال کرتے ہوئے بھیجے گئے ای میل اور اس میں موجود یوٹیوب کی ویڈیو کے لنک میں لکھا گیا ہے 'مغربی یورپ کے محب وطن' اور ایک جگہ لکھا گیا ہے 'یہ آپ کے لیے ایک تحفہ ہے۔۔۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ اسے اپنے ہر جاننے والے کو بھیجیں۔ تانگوئے ویز نے انرش کے اس عمل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا انرش بریوک کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہا ہے۔ کسی نے ویز کے بیان پر شکوک و شبہات کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے من وعن تسلیم کر لیا اس لئے اس کا تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے اور نہ ہی بریوک کے پس پردہ لوگوں کا سراغ لگانے کی خاطر کسی بین الاقوامی مہم کا آغاز کیا گیا بلکہ اس کے برخلاف ایک انٹرویو میں ناروے کی داخلی انٹیلی جنس کی سربراہ جیبن کرسٹیا نسین نے کہا 'میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ اب تک ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں کوئی ایسا اشارہ ملا ہے کہ وہ کسی بڑی تحریک کا حصہ ہے یا پھر وہ دیگر تنظیموں سے رابطے میں ہے یا کوئی اور بھی حملے میں ملوث ہے ویسے انہوں نے اعتراف کیا کہ بریوک دیوانہ نہیں ہے جیسا کہ اس کے وکیل کا دعویٰ ہے بلکہ وہ شاطر، چالباز اور شہرت کا بھوکا ہے'۔

انرش بریوک پر بم دھماکے اور یوتھ کیمپ پر فائرنگ کے الزام میں دہشت گردی کی دفعات کے تحت باقاعدہ مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ پولیس کے مطابق دہشت گردی کے ان واقعات میں ایک اور شخص ملوث ہو سکتا ہے۔ تادم تحریر کسی اور کو اس معاملے میں گرفتار تو در کنار کسی سے تفتیش تک نہیں کی گئی جو انتظامیہ کے ہمدردانہ رویہ کا واضح ثبوت ہے۔ حراست کے تیسرے دن بریوک کو عدالت میں پیش کر کے اس پر معاشرے اور حکومت کے ضروری امور کو تہہ و بالا کرنے کے الزامات لگائے گئے اور اعتراف کیا گیا کہ اس کی اس دہشت گردی سے عوام میں زبردست خوف و ہراس پھیلا ہے۔ انرش بریوک نے حملوں کی ذمہ داری تو قبول کر لی لیکن دہشت گردی کے الزامات کو مسترد کر دیا، انرش جانتا ہے کہ دہشت گردی کے الزامات تو صرف اور صرف مسلمانوں کے لئے مختص ہیں کوئی بھوری آنکھوں اور سفید جلد کا حامل بھلا دہشت گرد کیونکر ہو سکتا ہے اس شخص کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی حرکت کو 'وحشیانہ مگر ضروری' قرار دیتا ہے۔ جج کم ہیگر نے استغاثہ کی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے کہ ملزم عدالت میں پیشی کو ایک سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کر سکتا ہے بند

کمرے میں سماعت کا حکم دیا جس کے دوران ذرائع ابلاغ اور عوام کو عدالت کی کارروائی دیکھنے کی اجازت نہیں ہوگی حالانکہ انزش بریوک کے وکیل کا کہنا تھا کہ ان کا موکل عوام کے سامنے بیان دینا چاہتا ہے۔ بتیس سالہ انزش بیرنگ بریوک کو ناروے کے موجودہ قانون کے تحت زیادہ سے زیادہ اکیس سال کی قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ سفاک مغرب کی نظر میں پھانسی کا پھندا اور گولیوں سے بھون کر لاش کو دریا برد کردینے کا مستحق مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

مغرب کی دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس نام نہاد دہشت گردی کی قیمت مسلمانوں سے کیسے زبردستی وصول کی گئی ہے اس کے اعداد و شمار ہوش ربا ہیں ۳۰ جنوری ۲۰۱۰ء تک کی صورتحال یہ تھی کہ امریکہ کے حلیف اول پاکستان میں ۱۰۰۰۰ لوگ مارے جاچکے تھے جن میں سے ۷۰۰ افراد تو بالواسطہ امریکی ڈرون حملوں کا شکار ہوئے تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سالوں کے اندر ان حملوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اس مغربی دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں بھی دو سے تین گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ تحریکِ طالبان جس کا اصل طالبان سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ جو ہندوستان کی سرپرستی میں امریکہ کے اشارے پر دہشت گردی کرتی پھرتی ہے ہزاروں اموات کے لئے ذمہ دار ہے۔ ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والی ایک برطانوی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ۵ لاکھ اور عراق میں ۱۲ لاکھ افراد امریکی جارحیت کے باعث ہلاک ہوئے ہیں۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ کرتا کوئی اور ہے اور بھرتا کوئی اور مسلمانوں کو انصاف اس لئے نہیں ملتا کہ بقول شاعر۔

میرا قاتل ہی میرا منصف ہے
کیا مرے حق میں فیصلہ دے گا

# یوروپی انتہا پسندی و دہشت گردی

(قسط دوم)

انڈر یو بیرنگ بریوک بلاشبہ ایک عالمی اسلام مخالف فکر اور تحریک کا حصہ ہے اسی لئے وہ خود تو بائیں بازو کا انتہا پسند عیسائی ہے اس کے باوجود اسرائیل کے یہودی انتہا پسندوں کو اپنا عم زاد بھائی قرار دیتا ہے اور بھارت کے ہندو قوم پرستوں کا بہت بڑا مداح ہے۔ بھارت سے عقیدت کا اظہار اس کے اپنے 'منشور' میں ۱۰۲ مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق 'ہندو قوم پرست دنیا بھر میں جمہوری حکومتوں کا تختہ پلٹنے میں اس کے اہم اتحادی ہیں اور وہ بھارت سے مسلمانوں کو نکالنے میں ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ پندرہ سو صفحات کے اس منشور میں بریوک نے اپنے عزائم کو بیان کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ کس طرح وہ 'تہذیبی مارکسی نظام' (جس میں مختلف نسلوں کے لوگ بغیر کسی تفریق کے مل کر رہیں، یا ملٹی کلچرل ازم) کو ختم کرنے کے لیے وہ ایک مہم شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اس مہم کی ابتدا دہشت گردی کی کارروائیوں سے کر کے اسے ایک ایسی عالمی جنگ میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے جس میں وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کا بھی استعمال کیا جائے۔ سنگھ پریوار سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بریوک لکھتا ہے 'ہندو قوم پرستوں کو انڈین کلچرل مارکسوادیوں کی جانب سے اسی طرح کی زیادتیوں کا سامنا ہے جیسا کہ ان کے یوروپین بھائیوں کو ہے اور بھارت میں کانگریس کی قیادت کرنے والی یو پی اے حکومت ہر قیمت پر مسلمانوں کی خوش آمد میں مصروف ہے' ہندو دہشت گردوں کی جانب سے مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم کو بھی بریوک حق بجانب قرار دیتا ہے اور ان کی بھرپور تعریف و تائید کرتا ہے مگر اس حکمت عملی کو فائدے کی بجائے نقصان دہ بتلاتا ہے۔ دلچسپ اتفاق یہ

ہے کہ بی جے پی سابق ایم پی، بی پی سنگھل یہی بات بریوک کے بارے میں کہتے ہیں ان کے مطابق بریوک کا موقف حق بجانب ہے لیکن اس کا طریقہ کار غلط ہے جس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوا ہے۔

بیرنگ بریوک سرزمین ہند پر پائے جانے والے اپنے ہمنوا بجرنگیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر حملے کرنے کے بجائے بھارت میں غداروں کو نشانہ بنائیں اور عسکری سیل منظم کریں تاکہ کلچرل مارکسی حکومت کا تختہ پلٹا جا سکے۔ بریوک کے الفاظ میں ''ہمیں ایک دوسرے (بریوک کی تنظیم اور ہندو قوم پرست) تعاون کرنا چاہیے اور سیکھنا چاہیے کیونکہ ہمارے مقاصد ایک جیسے ہیں''۔ ویسے بریوک کے اس زرین مشورے کے قبل ہی کرنل پروہت جیسے لوگوں نے سناتن پربھات اور اکھنڈ بھارت جیسی عسکری تنظیموں کے تحت مالیگاؤں، اجمیر، حیدرآباد اور نہ جانے کہاں کہاں اپنی دہشت گردی کا آغاز کر دیا ہے لیکن ان کی توجہ مارکسوادیوں کے بجائے مسلمانوں کی جانب ہے۔ بریوک کے منشور میں جہاں ایک طرف سنگھ پریوار کی ویب سائٹس کی لنک موجود ہیں وہیں سنگھی دانشوروں کی کتابوں کے حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی تنظیم کا نشان امتیاز ہندوستان کے شہر بنارس سے بنوایا لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا گیا کہ بنارس ہندوؤں کا مقدس شہر ہے بلکہ روپیہ بچانے کی یہ ایک حکمت عملی تھی چونکہ دائیں بازو کے انتہا پسندوں کا سارا زور تارکین وطن کی یوروپ میں آمد کے خلاف ہے اس لئے وہ اپنے ہمنوا ہندو انتہا پسندوں کو بھی اس معاملے میں کسی قسم کی سہولت فراہم کرنے کا روادار نہیں ہے بلکہ صرف اس قدر احسان کرنا چاہتا ہے کہ انقلاب کے بعد بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت کے غیر مسلم باشندوں پر مشتمل ایک سرونٹ کلاس (نوکروں کا طبقہ) بنایا جائے گا اور یہ لوگ یورپ میں اپنے قیام کے دوران دن میں بارہ گھنٹے کام کریں گے، وہ ہر بڑے شہر کے باہر الگ آبادیوں میں رہیں گے اور ان کے کانٹریکٹ کی مدت چھ سے بارہ مہینے ہوگی جس کے بعد انہیں ان کے وطن واپس بھیج دیا جائے گا۔ بریوک کے ذہن میں یہ گھناؤنے خیالات یقیناً منوسمرتی کا مطالعہ کرنے کے بعد آئے ہوں گے۔ اس خواب کا بہترین پہلو یہ ہے کہ بریوک کی اس رسوائی کا شکار مسلمان نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ وہاں کا رخ ہی نہ کریں گے نیز ہزاروں سال تک شودروں کو اپنے آگے جھکانے والے براہمن ضرور اس ذلت کے آگے ماتھا ٹیک دیں گے۔

مثل مشہور ہے کند ہم جنس با ہم جنس پرواز اس لحاظ سے یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی دہشت گرد ہنود کا مداح ہو اور اسکے یہود سے تعلقات نہ ہوں؟ بریوک کا بھی یہی معاملہ ہے اس کا نہ صرف

اسرائیل میں بی جے پی کی ہم پلہ اسرائیل بیتینو نامہ جماعت سے بلکہ اسرائیل کے بد دماغ وزیر خارجہ اویگور لیبرمن سے بھی گہرے مراسم ہیں۔ امریکہ میں موجود صیہونی دانشور مثلاً ڈینیال پائپس، رابرٹ سپانسر اور پامیلا گیلر جنکی زندگی کا واحد مقصد مساجد کی مخالفت ہے سے بھی وہ لگاؤ رکھتا اور فیض حاصل کرتا ہے۔ اس نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جبکہ فلسطینیوں کو دی جانے والی احمقانہ حمایت کو بند کر دیا جائے اور اپنے تہذیبی عم زاد بھائی اسرائیل کی حمایت کی جائے۔ بریوک کی اس دھمکی سے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ناروے ایک غیر جانبدار اور پر امن ملک ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ناروے ناٹو کا رکن ہے اور امریکی سامراجیت کا ہمنوا ہے۔ فی الحال افغانستان اور لیبیا میں امریکہ کے شانہ بشانہ برسر جنگ ہے۔ تمام ہی یوروپی ملکوں کی طرح ناروے میں بھی انتہا پسند بائیں بازو کی قدامت پرست جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ناروے کے دار الخلافہ کو امریکہ نے فلسطین کی سرزمین پر اسرائیلی قبضہ کا جواز فراہم کرنے والی مہم میں استعمال کیا تھا جو آگے چل کر اوسلو امن معاہدہ کی شکل اختیار کر گئی۔

یوروپ کے اندر جدید قدامت پرستی کا آغاز برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے ۱۹۷۸ء میں کیا انہوں نے ببانگ دہل اس اندیشے کا اظہار کیا کہ برطانیہ مختلف تہذیبوں کے حامل افراد کے بہاؤ میں بہہ جائیگا اور اس سے آگے بڑھ کر ۱۹۸۹ء میں تھیچر نے یہاں تک کہہ دیا کہ انسانی حقوق کا آغاز انقلاب فرانس سے نہیں ہوا بلکہ اس کی حقیقی جڑیں یہودیت اور مسیحیت کے اتحاد میں پائی جاتی ہیں۔ یوروپ اور امریکہ میں بائیں بازو کی دہشت گردی کوئی نئی اور اجنبی شئے نہیں ہے۔ تیس سال قبل ۱۹۸۰ء میں اس طرح کی ایک لہر نے یوروپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ماہ اگست میں بولوگنا ریلوے اسٹیشن کے بم دھماکے میں ۸۴ افراد ہلاک اور ۱۸۹ زخمی ہوئے تھے۔ ایک مہینے بعد میونخ میں ہونے والا دھماکہ ۱۱ لوگوں کی موت کا سبب بنا اور اکتوبر کے اندر پیرس کی ایک یہودی عبادتگاہ کے باہر ہونے والے دھماکے میں ۴ لوگوں نے اپنی جان گنوائی۔ امریکہ کے اوکلاہامہ شہر میں ۱۹۹۵ء کے اندر ٹموتھی مک ویگ نے بریویک کی طرح کھاد سے بم تیار کیا اور حکومت کی عمارت کو بم سے اڑا دیا جس میں ۱۶۸ لوگ ہلاک ہوئے لیکن اسی کے ساتھ یوروپ میں فسطائی سیاسی رجحانات کی حامل سیاسی جماعتوں نے بھی اپنا رسوخ بڑھایا ۱۹۹۰ء میں جورگ حیدر کی لبرل پارٹی نے آسٹریا کے انتخابات میں ۲۲ فی صد ووٹ حاصل کئے اور اسی زمانے میں ناروے کے اندر کارل ایگار کی پروگریس پارٹی سب سے بڑی حزب اختلاف بن کر ابھری ناروے کی اس انتہا پسند جماعت نے ۲۰۰۹ء میں

پھرایک بار ۲۳ فیصد ووٹ حاصل کئے اور سب سے بڑی حزب اختلاف بن کر ابھری۔ گیانو فرانکوفینی کے قومی محاذ ۱۵ کو اٹلی میں ۲ء۳ ۱ فی صد ووٹ حاصل ہوئے۔ بیلجیم کے اندر ولام کے محاذ کو ۱۲ء۳ فی صد حاصل ہوئے اور فرانس کے اندر حزب اقتدار جماعت کو پانچ ریاستوں میں قومی محاذ کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ سویڈن میں گزشتہ سال مالموکے ایک شخص کو ۱۲ افراد کے قتل میں گرفتار کیا گیا اور پہلی بار بائیں بازو کی انتہا پسند جماعت ۴ء۵ فیصد ووٹ حاصل کر کے پارلیمنٹ میں پہنچی۔ ڈنمارک جہاں اہانت رسول کے کارٹون بنائے جاتے رہے دائیں بازو کی ڈانش پیوپلس پارٹی نے ۱۷۸ میں سے ۲۵ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ نیدرلینڈ کا گیرٹ ویلڈر جو قرآن مجید کو ہٹلر کی کتاب مین کامف کا ہم پلہ قرار دیتا ہے نے ۵ء۱۵ فیصد ووٹ حاصل کئے اور یہ دونوں جماعتیں باہر سے اقلیتی حکومت کی حمایت کر کے اپنا رسوخ بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح کی کامیابی بی جے پی کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے انتخابات میں حاصل ہوئی تھی اور یہی کچھ مودی کے ساتھ گجرات میں ہوا گویا اس طرح کے تشدد نے ہمیشہ ہی بائیں بازو کو انتخابی فائدہ پہنچایا ہے لیکن اس کے باوجود وشواہندو پریشد کے بی ایل شرما اور اکھنڈ بھارت کے کرنل پروہت جیسے لوگ دہشت گردی پر اتر آتے ہیں انہیں میں سے ایک بریوک بھی ہے۔

عوام کے اندر انتہا پسند رجحانات کا فروغ دیگر رہنماؤں کو بھی اس کی تائید کے لئے مجبور کر رہا ہے مثلاً گزشتہ سال جرمنی کی چانسلر انجیلا مارکل نے اعلان کیا کہ کثیر ثقافتی نظام ناکام ہو چکا ہے۔ برطانوی صدر نے اعلان کیا کہ کثیر ثقافتی نظام نے مختلف تہذیبوں کے حامل افراد میں علیحدگی پسند طرز زندگی کو فروغ دیا ہے۔ نکولس سرکوزی نے تو صاف فرما دیا کہ کثیر ثقافتی نظام ناکام ہو گیا اس لئے کہ ہماری جمہوریت نے تارکین وطن کے تشخص پر مقامی لوگوں سے زیادہ توجہ دی یہ وہی لہجہ ہے جو ممبئی کی سڑکوں پر راج ٹھاکرے کے اندر دکھلائی دیتا ہے۔ سرکوزی نے انتہا پسندوں کو خوش کرنے کے لئے پہلے تعلیم گاہوں میں اسکارف پر پابندی لگائی پھر برقعے کو نشانہ بنایا اس کے باوجود فی الحال اسے مارین لی پین نامی انتہا پسند رہنما سے صدارتی انتخاب میں مقابلہ کرنا ہے جو مسلمانوں کے سڑکوں پر نماز پڑھنے کو ہٹلر کی جارحیت سے مماثل سمجھتی ہے یہی مسئلہ کسی زمانے میں شیوسینا نے ممبئی میں اپنی مقبولیت میں اضافے کی خاطر اٹھایا تھا۔ بریوک جمہوری ذرائع کے بجائے اپنی تحریک نائٹ ٹمپلر کی مدد سے فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے کا خواہشمند ہے اور اپنے مقصد میں کامیابی کی خاطر ۴۵۰۰۰ ہزار مارکسیوں کی ہلاکت اور دس ہلاک کے زخمی ہونے کی توقع کرتا ہے۔ وہ ۸۰۰۰ ہزار افراد سے رابطہ

قائم کر رکھا ہے اور اپنی جان یہودی و مسیحی تہذیب کی بقاء کے لئے قربان کر دینا چاہتا ہے۔

انڑش بیرنگ بریوک نے جو کہا سو کیا۔ اس نے اپنے منشور کی تشہیر کے لئے ۹۳ معصوموں کے خون سے ہولی کھیلی اور اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب رہا اس لئے کہ اگر وہ کوئی پر امن ذریعہ اختیار کرتا تو اس قدر جلد ایسی زبردست مقبولیت نہیں حاصل کر پاتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مقصد میں کامیابی کے لئے معصوم لوگوں کی جانوں سے اس طرح کھیلا جا سکتا ہے؟ مغربی دہشت گردوں کے لئے اس سوال کا جواب مثبت ہے اس لئے کہ وہ انسانیت سے خالی وحشی درندے ہوتے ہیں۔ بریوک کی ذاتی ڈائری اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ ۸۲ دنوں تک اپنے منصوبے پر کام کرتا رہا۔ ۴۱ روز قبل جب وہ وسط میں پہونچا تو نہایت دلچسپ الفاظ اس نے صفحۂ قرطاس پر ثبت کئے وہ لکھتا ہے۔ ''آج بڑے دنوں کے بعد میں نے پہلی بار عبادت کی، میں نے خدا کو سمجھایا اگر وہ نہیں چاہتا کہ مارکسی و اسلامی محاذ یوروپ پر قابض ہو جائے تو اسے چاہئے کہ یوروپی عیسائیت کا تحفظ کرنے والے جنگجوؤں کی کامیابی کو یقینی بنائے'' اپنی اس جرأت رندانہ کے بعد آخری دن وہ کچھ یوں رقمطراز ہے۔ ''۲۰ دھماکوں کا بارود میرے پاس ہے مجھے اپنے طے شدہ مقامات پر دھماکوں کے سلسلے کی ابتدا کرنی ہے۔ اگر سب کچھ ناکام ہو گیا تو میں دوبارہ نجی تحفظ کے ادارے میں ملازمت اختیار کروں گا تا کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کما کر قرض ادا کر سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میرا آخری اندراج ہے اس لئے کہ رات کے ۱۵ء۱۲ ہو چکے ہیں۔ آئندہ بہار میں پولس افسر کا نیا لباس جب میں زیب تن کروں گا تو کیا خوب لگوں گا۔ اس کے بعد حاشیئے میں لکھتا ہے تصور کریں کہ اگر کل انتظامیہ کا عملہ میرے پاس آئے اور اس غلط خیال کے ساتھ کہ میں دہشت گرد ہوں۔ گویا اسے یقین ہے کہ دوسروں کی نظر میں تو وہ دہشت گرد ہے لیکن خود اپنی نظر میں نہیں۔ آخری سطر اس طرح ہے نیک تمناؤں کے ساتھ انڈریو بریوک۔ جسٹیشر نائٹ کمانڈر۔ نائٹس ٹمپلر یوروپ۔

اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے آخر اس انتہا پسندی کا محرک کیا ہے، وہ کون سی چیز ہے جو بریوک جیسے نوجوانوں کے لئے دہشت گردی کو مرغوب بناتی ہے۔ اس بنیادی سوال کا جواب اللہ کی کتاب قرآن مجید کچھ اس طرح دیتا ہے کہ ''اے ایمان والو خبردار غیروں کو اپنا راز دار نہ بنانا یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ صرف تمہاری مشقت و مصیبت کے خواہش مند ہیں۔ ان کی عداوت زبان سے بھی ظاہر ہے اور جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہم نے تمہارے لئے نشانیوں کو واضح کر کے بیان کر دیا ہے اگر تم صاحبانِ عقل ہو۔ (آل عمران ۱۱۸)

# اک نئے عہد کی تعمیر کا موسم آیا

(قسط اول)

ستمبر ۲۰۰۱ء امریکی تاریخ کا تاریک ترین مہینہ تھا اور ستمبر ۲۰۱۱ء اسرائیل کے لئے منحوس ترین مہینہ بننے جارہا ہے ایسا لگتا ہے صہیونی ریاست پر چہار جانب سے مشیت نے اپنا شکنجہ کس لیا ہے۔ اس شش جہت حملے میں اس کا دایاں ہاتھ ترکی مروڑ رہا ہے اور بائیں پنجے کو مصر کچل رہا ہے۔ یہ دونوں ہاتھ عرصۂ دراز سے اسرائیل کی وہ خدمت کر رہے تھے جو اس کے کسی اور حلیف کے لئے ممکن نہیں تھی۔ آگے سے محمود عباس آنکھیں دکھلا رہے ہیں اور پیچھے سے وزیر خارجہ او یگڈور لائیبر مین چھرا گھونپنے کی تیاری میں ہیں۔ ایک طرف سر سے امریکی سرپرستی کا سایہ اٹھتا جارہا ہے تو عوامی مظاہرے قدموں تلے کی زمین کھسکا رہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر نظر رکھنے والوں کے لئے یہ اشارات کافی ہیں لیکن چونکہ ہندوستانی ذرائع ابلاغ کو اپنے داخلی مسائل سے فرصت نہیں اس لئے تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس سال ۱۱ ستمبر کو قاہرہ کی عدالت میں ایک مقدمہ کی سماعت ہونے والی ہے جس میں نورہ الفرع نامی وکیل نے حکومت مصر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قاہرہ میں واقع اسرائیلی سفارتخانہ بند کردے۔ ایک اور مقدمے میں اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے مصری سپاہیوں کا قصاص پانچ بلین ڈالر طلب کیا گیا ہے۔ ایلاط کے سانحہ کے خلاف منعقد ہونے والے مظاہروں کے درج ذیل مطالبات بھی دوررس نتائج کے حامل ہیں:

- اسرائیل کی جانب سے معذرت کی درخواست
- حادثہ کی مشترکہ تفتیش

- اسرائیل کے سفیر کی ملک بدری
- مصری سفارتکاروں کی تل ابیب سے واپسی
- ۱۹۷۹ء میں ہونے والے کیمپ ڈیوڈ معاہدے میں ترمیم

وسط اگست سے ایلاط کی سرحد پر اسرائیلی گولی باری میں ہلاک ہونے والے مصری اہلکاروں کے خلاف ہونے والے مظاہروں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس دوران ایک مرتبہ اسرائیلی ریڈیو کی ویب سائٹ کو اور اس کے بعد وزیر اعظم نتن یاہو کی ویب سائٹ کو مصریوں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور اس پر اسرائیل کے خلاف مواد اور تصاویر لگا دیں۔ اس کے علاوہ اسرائیلی سفارتخانے کی ۲۲ منزلہ عمارت کی چھت پر ایک شخص تمام حفاظتی انتظامات کو پھلانگ کر پہنچ گیا اور وہاں موجود اسرائیلی پرچم کو پھاڑ کر مصری جھنڈا لہرا دیا۔ پھٹا پرچم جب نیچے آیا تو اسے موجود مظاہرین نے جلا دیا۔ اس واقعہ نے راتوں رات احمد سہلات نامی نوجوان کو مصری اسپائیڈر مین کی حیثیت سے مقبول عام کر دیا۔ ایلاط کے مقام پر اسرائیلی فوجی بس پر مجاہدین نے گھات لگا کر حملہ کیا تھا جس میں ۸ یہودی فوجی ہلاک ہوئے اس کے جواب میں اسرائیلی فوج نے نہ صرف ۵ مصری حفاظتی اہلکاروں کو شہید کیا بلکہ ۱۵ شہریوں کو غزہ میں بمباری کر کے ہلاک کر دیا۔

ان بزدلانہ مظالم کے باوجود وزیر اعظم نتن یاہو نے غزہ پر فوجی کارروائی کی دھمکی دے دی دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ نتن یاہو کو حزب اختلاف قدیمہ کی رہنما زیپی لیفنی کی تائید حاصل ہو گئی اور اس نے پارلیمنٹ میں قرارداد پیش کر دی لیکن اس بار سخت گیر وزیر اعظم اور ان کے بد دماغ وزیر خارجہ بھی ۲۰۰۸ کی حماقت دوہرانے کی جرأت نہ کر سکے اور اس تجویز کو واضح اکثریت کے ساتھ نامنظور کر دیا گیا جس کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ موجودہ صورتحال میں مصر کو مزید ناراض نہیں کیا جا سکتا، ایسا کرنے کے نتیجے میں اسرائیل یک و تنہا ہو جائیگا اور ایک ایسی مشکل میں پھنس جائیگا جس سے وہ ہر صورت بچنا چاہتا ہے نیز اسرائیل کے پاس اس فوجی کارروائی کے لئے وافر جواز موجود نہیں ہے۔ یہ کسی مبصر کے نہیں بلکہ وزیر اعظم کے الفاظ ہیں جو اس کی کمزوری کا بانگ دہل اعتراف کرتے ہیں۔ مصر میں برپا ہونے والے عوامی انقلاب سے قبل اس بات کا تصور بھی محال تھا لیکن اب مصر حسنی مبارک کے اس نامبارک چنگل سے نکل چکا جس نے اسرائیلی حملے کے وقت غزہ کی سرحد کو بند کر کے خود کو عذاب الٰہی کا مستحق بنا لیا تھا۔

ایک زمانے تک مصر سے بھی زیادہ اسرائیل کا حامی ترکی ہوا کرتا تھا لیکن اسرائیل نے غزہ

کی جانب آنے والے امدادی قافلہ فلوٹیلا پر حملہ کر کے ۸ ترکی باشندوں کے ساتھ ایک ترکی نژاد امریکی شہری کو شہید کر دیا جس سے دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اقوامِ متحدہ نے اس واقعہ کی تفتیش کر کے بالکل ویسی ہی رپورٹ تیار کر دی جیسی کہ بابری مسجد تنازعہ میں الہ بادہائی کورٹ کا فیصلہ تھا اس میں عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ کر تمام فریقوں کو خوش کرنے کی کوشش میں سبھی کو ناراض کر دیا۔

تتن یاہو نے رپورٹ کو ملتوی کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مذکورہ رپورٹ میں اعتراف کیا گیا کہ اسرائیل نے طاقت کا بیجا استعمال کیا مگر غزہ کے محاصرے کو جائز قرار دیا گیا جبکہ خود اقوامِ متحدہ کی دیگر قرارداد اس کے خلاف ہیں۔ چونکہ یہ حملہ بین الاقوامی سمندر میں نہتے لوگوں پر کیا گیا اس لئے پوری طرح غیر قانونی تھا مگر اس بابت مکمل خاموشی برتی گئی۔ ترکی حکومت نے اس رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے نہ صرف یہ مطالبہ کیا کہ اسرائیل اپنی اس حرکت کے لئے غیر مشروط معافی مانگے بلکہ شہید ہونے والوں کے ورثہ کو فی کس ۱۰ ہزار ڈالے قصاص ادا کرے اور اسی کے ساتھ غزہ کا غیر انسانی محاصرہ بھی فی الفور ختم کرے۔ ترکیوں نے اپنے مطالبے کے پیش نظر اسرائیلی سفیر کو واپس بھیج دیا اور اسرائیل کی سفارتی حیثیت کو کم کر دیا نیز تمام فوجی معاہدوں کو منسوخ کر ڈالا۔ اب ترکی حکومت اسرائیل کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے جارہی ہے اور ممکن ہے اس ستمبر میں وہ مقدمہ قائم ہو جائے۔ اس مقدمہ میں ترکیوں کو کامیاب کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں کافی شواہد موجود ہیں جسے سیاستدانوں نے تو نظر انداز کر دیا لیکن کسی عدالت کے لئے ایسا کرنا خاصہ مشکل ہے۔

اسرائیل کی حمایت جس طرح مصر اور ترکی کی حکومتیں کر رہی تھیں اسی طرح فلسطینیوں کے گھر کا بھیدی محمود عباس بھی کرتا رہا ہے۔ محمود عباس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ حماس ہے جس نے پی ایل او کی اجارہ داری نہ صرف ختم کر دی بلکہ گزشتہ انتخابات میں اسے شکست فاش سے دوچار کر دیا۔ خود محمود عباس کی صدارتی میقات ایک سال قبل ختم ہو چکی ہے اور وہ دوبارہ انتخاب لڑنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہے۔ اسرائیل کی دوستی نے ایکطرف ان کے اعتبار کو بری طرح متاثر کیا دوسری جانب اسرائیل کی بدعہدی نے ان کا بیڑا غرق کر دیا۔ نوآبادیات کی توسیع بلا توقف جاری رہی اور اس سے نام نہاد امن گفتگو ایک ایسے تعطل کا شکار ہوگئی کہ خود امریکہ بھی بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔ اب ہر طرف سے مایوس ہو کر محمود عباس نے اسرائیل سے ناراضگی کی قیمت پر اپنی مقبولیت میں اضافے کا

داؤں رچایا اور اقوامِ متحدہ میں فلسطینی ریاست کی باقاعدہ رکنیت کے لئے جدوجہد میں لگ گئے ہیں، محمود عباس کے اس موقف سے اسرائیل وامریکہ دونوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ اب محمود عباس کو معاشی امداد کے منسوخ کرنے کی دھمکی دی جارہی ہے لیکن یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آرہا۔

جلاوطن فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان تو پی ایل او نے ۱۹۸۸ء میں کردیا تھا کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد فلسطینی نمائندے کو اقوامِ متحدہ میں مستقل مشاہد کی حیثیت سے شامل کیا گیا اور باقاعدہ ممبران کے بعد سب سے پہلے اسی کو بحث میں شامل کیا جانے لگا لیکن وہ ہنوز رائے دینے کے حق سے محروم ہے۔ اس بیچ یہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے ۱۹۳ ممبران میں سے ۱۳۰ نے فلسطین کی ریاست کو تسلیم کرلیا اور ان ممالک میں فلسطین کے سفارت خانے قائم کردیئے۔ اس بار باقاعدہ رکنیت کے لئے جنرل اسمبلی اور سیکیورٹی کاؤنسل کے دروازے کھٹکھٹائے جارہے ہیں۔ سیکیورٹی کاؤنسل میں یقیناً امریکہ اسے ویٹو کرسکتا ہے لیکن اگر جنرل اسمبلی کی دوتہائی اکثریت اس کے حق میں رائے دے دے تو امریکہ کچھ نہیں کرسکتا۔ ۱۲۵ ممالک نے تجویز کے پیش ہونے سے قبل ہی اپنی حمایت کا اعلان کردیا اور باقی لوگ تجویز کے آنے کا انتظار کررہے ہیں۔ اس دوران ۲۳ ستمبر کو اقوام متحدہ کے ہونے والے اجلاس کے جاری شدہ پروگرام نے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ۲۳ ستمبر جمعہ کا دن ہے جسے دینِ اسلام میں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ عالم اسلام میں تمام احتجاجی مظاہروں کے لئے اسی مبارک دن کا انتخاب کیا جاتا رہا ہے۔ ویسے تو مصری مسلمانوں نے عیدالفطر کے دن بھی اسرائیل کے خلاف مظاہرہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ مسلمان خوشی اور غم کے ہر موقع پر اپنے احتجاجی فرائض ادا کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے اس اجلاس میں محمود عباس کے لئے دوپہر ۱۲ بجے کا وقت مختص کیا گیا جو بڑے سربراہانِ مملکت کے لئے خاص ہوتا ہے اور اس وقت سارے ہی ممبران حاضر ہوتے ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم کے لئے رات نو بجے کا وقت تجویز کیا گیا ہے جبکہ اکثر لوگ واپس جاچکے ہوتے ہیں۔ اسرائیل نے مذہبی بنیاد پر اس کے یوم السبت میں ہونے کے باعث اعتراض کیا ہے۔ اس اجلاس میں شریک ہونے کے لئے امریکہ اور اسرائیل کی آنکھوں کا کانٹا سمجھے جانے والے ایرانی صدر احمدی نژاد بھی بنفس نفیس شریک ہورہے ہیں گویا اسرائیل کے زخموں پر نمک کے چھڑکاؤ کا انتظام زور شور سے ہورہا ہے۔ گردشِ زمانہ نے اسرائیل کی وہی حالت پی ایل او کے سامنے کردی ہے جو کبھی اس کے آگے پی ایل او کی ہوا کرتی تھی کہ اسرائیل کا زرخرید غلام بھی اسے آنکھیں دکھا رہا ہے۔

اسرائیلی حکومت کی پشت میں چھرا گھونپنے کی تیاری خود وزیر خارجہ اویگڈور لائبرمن کر رہا ہے۔ یہ شخص چند سال قبل روس سے ہجرت کر کے اسرائیل میں آیا اور صدیوں سے وہاں بسنے والے مسلمانوں سے اسرائیلی حکومت کی وفاداری کا مطالبہ کرنے لگا اس کا کہنا ہے کہ اگر عرب اس کے لئے تیار نہیں ہوتے تو انکو شہریت کے حق سے محروم کر دیا جانا چاہئے۔ وہ یہودی مہاجرین کے حقوق کا بھی بہت بڑا حامی ہے۔ پہلے یہ سرمایہ دار لکڈ پارٹی میں شامل تھا مگر بعد میں اس نے اپنی مادر وطن پارٹی بنالی اور گزشتہ انتخاب میں ۱۵ نشستوں پر کامیابی درج کر لی۔ بنجامن نتن یاہو کو چونکہ اس بار واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی اس لئے اس نے لائبرمن کی حمایت حاصل کر کے اسے وزیر خارجہ بنا دیا لیکن لائبرمن پر دس سال قبل غبن کا الزام ہے اور ڈیڑھ سال قبل اس کو رشوت ستانی کے معاملے میں بھی ملوث پایا گیا ہے۔ پہلے تو وہ کہتا تھا کہ اگر میرے خلاف مقدمہ قائم ہو گیا تو میں استعفیٰ دے دوں گا لیکن اب وہ اپنے وعدے سے مکر گیا ہے مبصرین کا خیال ہے کہ اگر اسے استعفیٰ دینا پڑا تو نتن یاہو کی مخلوط حکومت کو خطرہ لاحق ہو جائیگا۔ اب اپنی حکومت کو بلیک میل کر کے اس پر دباؤ بنانے کے لئے اس نے نئی افواہ پھیلا دی ہے فلسطینی ایک بہت بڑے پر تشدد مظاہرے کی تیاری کر رہے ہیں اس لئے حکومت کو پی ایل او سے روابط توڑ لینے چاہئیں۔ یہ اس قدر بے بنیاد افواہ ہے کہ فلسطینی حکام کے علاوہ خود اسرائیلی خفیہ ایجنسی نے بھی اس کی تردید کر دی ہے۔

لائبرمن کے اس مطالبے نے اسرائیلی حکومت کے لئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ایک طرف محمود عباس کو اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کرنے سے روکنے کے لئے اسرائیل انہیں کسی صورت مذاکرات کی میز پر لانا چاہتا ہے اور دوسری جانب یہ احمق قومی مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے حکومت کو گرا کر دوبارہ انتخاب کروانا چاہتا ہے تاکہ اس کی سیاسی حیثیت مضبوط تر ہو سکے اور وہ متوقع ۱۰ سال کی سزا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ اسرائیلی سیاستدانوں کے بارے میں جو غلط فہمی پائی جاتی تھی وہ اپنے ملک کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اسے وندے ماترم کا کلمہ پڑھنے والے لائبرمن نے دور کر دیا ہے۔

اسرائیل کی بقاء اور استحکام کی بنیادی وجہ اس کی داخلی قوت نہیں بلکہ بیرونی حمایت رہی ہے۔ اس کے قیام کی حمایت کے لئے دو ازلی دشمن امریکہ اور سوویت یونین یکجا ہو گئے تھے اور اس کے بعد سارا مغرب اسرائیل کا ہمنوا بنا رہا اور تو اور اب اسے ہندوستان کی بھی نصرت و مدد حاصل ہو گئی ہے لیکن فی الحال امریکی ریاست اور امریکی صدر دونوں کی حالت بہت پتلی ہے اور وہ دونوں خود اپنی

بقاء کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اسرائیل کے لائبر مین اور زپی لیونی کی طرح امریکہ کی حزب اختلاف جماعت بھی اوبامہ کا بیڑہ غرق کرنے کے لئے قومی مفادات سے کھلواڑ کررہی ہے۔ اوبامہ اپنی مقبولیت میں اضافے کے پیش نظر عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں تاکہ آئندہ انتخاب میں کامیابی حاصل کی جائے لیکن ریپبلکن ان کو اپنے اس ہدف سے محروم کرنے کے لئے ان کاموں میں روڑا اٹکاتے ہیں تاکہ اوبامہ کی ناکامی کا سہارا لے کر خود اپنی سیاسی روٹیاں سینک سکیں۔ اس رسہ کشی میں ری پبلکن پارٹی اپنی کانگریس (پارلیمان) کے اندر اکثریت کے باعث کامیاب ہو جاتی ہے۔ ہاتھی اور گدھے کی اس لڑائی میں ایک طرف جمہوریت مضبوط ہورہی ہے اور دوسری طرف عوام کا نقصان ہورہا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی اس چکی میں عوام پس رہے ہیں۔

اسرائیل کے سر پر جو سب سے مضبوط سائبان امریکہ کا تھا اس میں ہر روز ایک نیا چھید ہورہا ہے۔ اس کے دست و بازو مفلوج ہورہے ہیں۔ یہودیوں نے اللہ کو چھوڑ کر جن کا سہارہ پکڑا تھا ان کی مثال مکڑی کے جال کی سی تھی جیسا فرمان خداوندی ہے ’’جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے‘‘ (۲۹:۴۱) تاریخ شاہد ہے کہ ایسے تمام لوگ جو کمزور سہاروں کی بنیاد پر اپنا گھر بناتے ہیں وہ بالآخر اس آیت کی زندہ تفسیر بنا دیئے جاتے ہیں جس میں فرمایا گیا ’’آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کررہے تھے‘‘۔ (۲۹:۴۰)

اس تباہی و بربادی کی فضا میں حق کا سراپا منتظر شاعر انتظار نعیم امید کی ایک نئی کرن دیکھ لیتا ہے اور کہتا ہے۔

اک نئے عہد کی تعمیر کا موسم آیا
قصرِ طاغوت ہواؤں میں بکھرتا دیکھوں

# شیشہ ہو کے موتی جام کہ در جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

(دوسری قسط)

شیش محل میں رہنے والے دوسروں پر پتھر نہیں اٹھایا کرتے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب محلوں میں رہنے والوں کے اندر شیشے کی نزاکت کا شعور پایا جاتا تھا لیکن دورِ حاضر میں یہ احساس ختم ہو گیا لوگوں نے شیشے کی چادر کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار سمجھ لیا ہے۔ وہ اپنے محلوں سے توپ و تفنگ سے لیس ہو کر اکڑتے ہوئے نکلتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ بقول فیض شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ۔

شیشہ ہو کے موتی جام کہ در جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

صیہونی فتنہ اور صلیبی طاغوت کے ظلم و ستم کی طغیانی نے جب عالمِ انسانیت کو بری طرح لہولہان کر دیا تو اسکے جواب میں معتوبوں نے اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھانے کا فیصلہ کیا اور پھر کیا تھا دیکھتے دیکھتے شیش محل میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ پہلے اس ردِعمل سے قدموں تلے ارتعاش پیدا ہوا اور اب اس کی کرچیں شہ رگ کو کھرچنے لگی ہیں کبر و غرور کا آسمان میں اٹھا ہوا سر زمین کی جانب جھکنے لگا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت گزشتہ ہفتہ ہونے والا کابل کے امریکی سفارتخانے اور ناٹو کے صدر دفتر پر طالبان کا حملہ ہے اور اسی کے ساتھ ترکی کے وزیرِ اعظم طیب اردغان کا یہ اعلان کہ اب آئندہ غزہ کی جانب جانے والی امدادی کشتی کے ساتھ فوجی رسد بھی موجود ہوگی تاکہ اسرائیلی فوج کو منہ توڑ جواب دے سکے۔ یہ تو خیر بیرونی مسائل کی سونامی ہے جن سے اسرائیل جوجھ رہا ہے لیکن اس شیش محل کے اندر ہونے والی عوامی اتھل پتھل نے مسائل کی سنگینی میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے اور اس کے حکمرانوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ مسلم دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات نے اسرائیل کے یہودیوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کر دیا ہے

اور وہ بھی اپنی حکومت اور نظام کے خلاف سڑکوں پر اتر آئے ہیں یہ صدائے احتجاج اس مسلم بیداری کی مرہونِ منت ہے جس کا نقشہ انتظار نعیم کچھ اس طرح کھینچتے ہیں

ملکوں ملکوں شہروں شہروں ایک نئی بیداری ہے
جاء الحق و زھق الباطل سب کی زباں پر جاری ہے

تل ابیب سمیت مختلف شہروں میں ہونے والے ان مظاہروں میں لوگوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ جولائی کے اواخر میں یہ تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی تین ماہ کے اندر اس میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ تل ابیب کا ہبیما چوک اب تحریر چوک کے نام سے مشہور ہوتا جا رہا ہے۔ مظاہرین نعرے لگا رہے ہیں ''استعفیٰ دو مصر یہاں ہے''۔ واجبی قیمت پر گھروں کی خاطر شروع ہونے والی تحریک اب ٹیکس کے نظام میں اصلاح اور فلاحی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مظاہرے میں شامل طلبا رہنما شمولی کا کہنا ہے کہ ہم اپنے ملک کی خاطر جان لڑا سکتے ہیں لیکن وزیر اعظم ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اس ملک میں زندہ رہنے دیں گے۔ اس اعلان میں نوجوان نسل کی جانب سے یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ اگر حالات نہیں بدلے تو ہم ترکِ وطن کر کے باہر نکل جائیں گے۔ جن لوگوں کے لئے فلسطینیوں کو بے وطن کیا گیا تھا اب وہی اپنی نام نہاد مملکتِ خداداد سے فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ستاف شافر جو اس تحریک کے بانیوں میں سے ایک ہے کہتا ہے کہ ''ہمارا مطالبہ وزیر اعظم کی نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی کا ہے۔''

جس نظام کی تبدیلی کے لئے اسرائیلی عوام سڑکوں پر اترے ہیں وہ حسنی مبارک یا معمر قذافی کی مانند کوئی فوجی آمریت نہیں بلکہ مغربی جمہوریت ہے۔ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی واحد جمہوریت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسرائیل کو حاصل ہونے والی مغربی شفقت کی ایک وجہ یہی قدر مشترک ہے اور ہندوستان سے انسیت بھی اسی سبب سے ہے۔ گو کہ اسرائیل مغرب کا حلیف ہے اس کے باوجود وہاں کے صیہونی نظام حکومت اور ہندوستانی براہمنی طرز سلطنت میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسرائیل میں برطانیہ کی طرح نہ تو کوئی ملکہ براجمان ہے اور نہ ہی امریکہ کی مانند صدارتی نظام رائج ہے بلکہ ہندوستان جیسی خالص پارلیمانی جمہوریت کا دور دورہ ہے بلکہ ہندوستان پر بھی اس معنیٰ میں اسے فوقیت حاصل ہے کہ وہاں کسی نہرو خاندان کی اقتدار پر اجارہ داری نہیں پائی جاتی۔ اس سونے پر سہاگہ کا کام مسلم دشمنی ہے۔

اسرائیل میں انتخابات کا سلسلہ کبھی بھی نہیں رکا۔ ہندوستان ہی کی طرح اسرائیل میں بھی بے

شمار سیاسی جماعتیں ہیں جو انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ ان میں لکڈ پارٹی کانگریس کی طرح ہے۔ اس سے الگ ہو کر بننے والی قدیمہ کی حالت جنتا دل کی مانند ہے۔ لائیبر من کی مادر وطن پارٹی کے عزائم اور لب و لہجے میں بھارتیہ جنتا پارٹی سے شباہت صاف نظر آتی ہے اور لیبر پارٹی کا حال نظری و عملی سطح پر کمیونسٹوں جیسا ہے۔ یہ بھی ایک حسنِ اتفاق ہے کہ فی الحال ہندوستان ہی کی طرح وہاں بھی ہر جماعت واضح اکثریت سے محروم ہے اس لئے مخلوط حکومت کی مجبوریاں ہر دو مقام پر لاحق ہیں اور حکومت سازی سے قبل ہونے والی ابن الوقتی اور سودے بازیاں بالکل ایکدوسرے کی ہمزاد ہیں بلکہ اسرائیل کے اڈوانی لائیبر من کو اپنے سارے اختلافات بھلا کر لکڈ سے ہاتھ ملا لینے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی بشرطیکہ اسے وزارتِ خارجہ کا قلمدان تھما دیا جائے۔ لیبر پارٹی جو انتخاب سے قبل حزبِ اختلاف قدیمہ کی حکومت میں شامل تھی اب بڑی بے حیائی کے ساتھ پالہ بدل کر جمہوریت کی بقاء کی خاطر لکڈ کے ساتھ آ کر وزارتِ دفاع پر قبضہ جما لیتی ہے۔ بدعنوانی کے الزامات میں سابق وزیر اعظم یہود اولمرٹ کو ملوث پایا جاتا ہے اور صدرِ مملکت اپنی سکریٹری کے ساتھ دست درازی کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ انتخابی کرتب بازی بھی ملتی جلتی ہی ہے۔ یہاں کانگریس اپنے رائے دہندگان کو خوش کرنے کے لئے میرٹھ اور ملیانہ جیسے فرقہ وارانہ فسادات کرواتی ہے تو وہاں صابرہ اور شتیلہ کے مہاجرین کیمپوں کو بمباری کر کے لالہ زار کیا جاتا ہے۔ بی جے پی کارگل کی جنگ اور گجرات کی نسل کشی کے نام پر ووٹ مانگتی ہے تو قدیمہ غزہ پر حملہ بول کر اپنی مقبولیت میں اضافہ کی کوشش کرتی ہے۔ دونوں ہی ممالک پر جمہوری دیو استبداد کا یکساں رنگ روپ ہے۔

اسرائیل میں جمہوریت نوازوں نے فلسطینیوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا ہے جس کا شکار کشمیر کے مسلمان ہیں۔ اور تو اور پنجاب کے سکھوں اور میزورم کے عیسائیوں کو بھی سرکاری جبر و ظلم کا اسی طرح نشانہ بنایا گیا جیسا کہ غزہ اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں کو بنایا جاتا ہے۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جس طرح اسرائیل اپنے پڑوسی مصر اور شام سے برسر جنگ رہا ہے ویسی ہی جنگیں ہندوستان اور اس کے پڑوسی چین و پاکستان کے درمیان بھی ہو چکی ہیں۔ جس طرح اسرائیل نے لبنان میں عیسائی اقلیت کو مسلح کر کے وہاں خانہ جنگی پھیلائی ایسی ہی سازش ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی مکتی باہنی اور سری لنکا کی تمل ٹائیگرس کی مدد سے کی۔ جس طرح اسرائیل سے اس کے ہم سایہ ممالک نالاں ہیں بالکل وہی صورتحال بھارت کی بھی ہے کہ بشمول نیپال سارے ہی پڑوسی اس سے شاکی اور خوفزدہ ہیں۔ نئی عالمی سیاسی صورتحال نے ہند اور اسرائیل

کے درمیان ایک اور خطرناک مماثلت پیدا کردی ہے۔ جس طرح مسلم دنیا کے خلاف اسرائیل امریکہ کا آلہ کار بنا ہوا ہے اسی طرح کا کردار ہندوستان کی حکومت امریکہ کے لئے چین کے خلاف ادا کرنے جارہی ہے۔ اسرائیل نے جس طرح حسنی مبارک سے تعلقات استوار کر رکھے تھے اسی طرح ہندوستان نے افغانستان کی بدعنوان اور کٹھ پتلی حکومت سے سانٹھ گانٹھ کرلی ہے۔ تبت کے دلائی لامہ جس طرح دلی کے منظورِ نظر ہیں اسی طرح محمود عباس کی تل ابیب میں پذیرائی کی جاتی رہی ہے۔

تہذیب وتمدن کی سطح پر ہندو برہمنیت اور یہودی صیہونیت کے درمیان مطابقت حیرت انگیز ہے۔ دونوں کی بنیاد نسلی تفاوت وامتیاز پر اٹھائی گئی ہے۔ دونوں کو اپنی قدامت کا زعم ہے۔ دونوں اپنے آپ کو مظلومیت کا شکار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ہندو دانشوروں کو بابر اور جناح سے وہی شکایت ہے جو یہودیوں کو ہٹلر سے ہے لیکن جمہوری نظام اس فتنہ پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو گیا ہے اور یہ گٹھ جوڑ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان نے جس زمانے میں انگریزوں سے آزادی حاصل کی اسی دور میں اسرائیلی ریاست نے انگریزی سامراج کے بطن سے جنم لیا گویا دونوں مقامات پر اس فاسد نظام کی داغ بیل ایک ہی وقت میں پڑی۔ آمریت کے آسیب کو اس کی جڑیں کھوکھلا کرنے کا موقع ان دونوں ممالک میں نصیب نہیں ہوا اس لئے وقت کے ساتھ اس کی جڑیں زمین میں گہری اور شاخیں آسمان میں پھیلتی چلی گئیں اور اب جبکہ اس کے پھلنے پھولنے کا وقت آیا ہے تو یہ یکساں پھل دے رہا ہے۔ نظام کوئی بھی ہو جب اس کا بیج زمین میں پڑتا ہے تو لوگوں کو اس سے کچھ امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ جب نازک سی کونپل بیج کے سخت خول سے باہر سر ابھارتی ہے تو معصوم بچے کی مانند خوشنما لگتی ہے۔ جب وہ اپنے تنے پر کھڑی ہوتی ہے لوگوں کا دل لبھاتی ہے۔ جب اس کی شاخیں سایہ دار ہو جاتی ہیں تو عوام کو راحت محسوس ہوتی ہے لیکن پھر جب اس درخت کو پھل لگتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شجر طیب ہے یا خبیث ہے۔

جمہوریت کا شجر خبیثہ فی الحال یوروپ، امریکہ، ہندوستان اور اسرائیل سبھی کو یکساں پھلوں سے نواز رہا ہے، یوروپ کے ممالک یکے بعد دیگرے کنگال ہوتے جارہے ہیں ایسے میں اٹلی کا قلاش صدر اپنا دامن پھیلانے کے لئے امریکہ کے بجائے چین کا رخ کرتا ہے۔ امریکہ میں غربت کی شرح گزشتہ پانچ دہائیوں میں سب سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ۱۵ فی صد عوام غریبی کی سطح سے نیچے پہنچ گئے ہیں جن میں نوجوان ۲۲ فیصد ہیں۔ دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشت ہندوستان میں پٹرول کی قیمت میں اضافے کیخلاف ملک گیر مظاہرے ہو رہے ہیں اس لئے کہ پچھلے دس ماہ میں یہ دسواں اضافہ ہے۔

مہنگائی کے معاملے میں اسرائیل بھی ہندوستان کے شانہ بشانہ کھڑا ہے۔ آٹے کا بھاؤ ۱۹ فی صد بڑھا ہے کھانے کے تیل میں ۲۳ فی صد اضافہ ہوا ہے شکر کی قیمتیں ۴۰ فیصد تو اچھے قسم کے گیہوں کی قیمت میں ۱۰۶ فیصد کی بڑھوتری دیکھنے کو آئی ہے۔ مظلوم فلسطینیوں کو بے گھر کر کے اپنے عوام کو رہائش فراہم کرنے کا دعویٰ کرنے والی صیہونی حکومت کا حال یہ ہے کہ ۹۳ فیصد زمین پر قابض ہونے کے باوجود وہ اس محاذ پر بری طرح ناکام ہے۔ گزشتہ چند سالوں کے اندر گھروں کا کرایہ ۳۵ سے ۴۰ فی صد بڑھا ہے۔ دو یا تین آرامگاہ والے معمولی گھر کی قیمت ۶ لاکھ سے ۱۰ لاکھ امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ ابتدا میں اسی پریشانی نے عوام کو راستوں پر خیمے لگا کر مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل میں معاشی ترقی کی شرح دیگر صنعتی ممالک سے بہتر ہے لیکن اس ترقی کا فائدہ ہندوستان کی مانند ٹاٹا اور امبانی جیسے سرمایہ داروں کو تو ہو رہا ہے لیکن عام آدمی اس سے محروم ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ غربت کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسرائیل میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۵ فی صد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ امریکہ میں ۲۲۰۰ ڈالر ماہانہ کمانے والا غریب کہلاتا ہے جبکہ اسرائیل میں ۹۰۰ ڈالر ماہانہ سے زیادہ کمانے والے خاندان کو غریب شمار نہیں کیا جاتا۔ ۲۰۰۸ء کے مقابلے اس شرح میں ۳۱ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اسرائیل میں ہر تین میں سے ایک بچہ غریب ہے اور جن ملازمین کو کم از کم تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑتا ہے ان میں خواتین کی تعداد ۷۰ فی صد ہے۔ ہٹلر کے مظالم کا شکار ہونے والے جو لوگ اسرائیل میں خوشحالی کے خواب سجا کر آئے تھے ان میں سے ۴۰ فیصد غربت کا شکار ہیں۔ ڈاکٹروں نے اپنی تنخواہ میں اضافے کی خاطر ہڑتال کر رکھی ہے۔

اسرائیل کی حکومت بجٹ کا بڑا حصہ قومی تحفظ پر خرچ کر دیتی ہے اس لئے سماجی فلاح و بہبود کے وسائل سکڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مظاہرین گھروں کی قیمتوں سے آگے بڑھکر پورے معاشی نظام اور معاشرے میں مکمل تبدیلی پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ٹیکس کا نیا نظام چاہتے ہیں بجلی کی نرخ میں اضافے کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، مفت تعلیم، بچوں کی فلاح و بہبود پر زور دیتے ہیں سرکاری کمپنیوں کی نجکاری کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ اگر مصر اسرائیل کو سستے داموں ایندھن کی سپلائی بند کر دیتا ہے جس کا اشارہ مصری وزیر اعظم نے حال میں بلا واسطہ یہ کہہ کر دیا کہ کوئی معاہدہ مقدس نہیں ہے کبھی پر نظر ثانی ہو سکتی ہے تو اس کے نتیجے میں اسرائیلی معیشت کی کمر ٹوٹ سکتی ہے۔ اسرائیل کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً بیس سرمایہ دار خاندانوں نے سارے ملک کی معیشت کو

اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ ان خاندانوں کی ملکیت میں ۲۵ سب سے بڑی کمپنیاں مثلاً بنک، سپر مارکیٹ، ٹیلی فون، زمین جائداد، پٹرول پمپ اور دیگر ہیں اور ۵۰ فی صد اسٹاک مارکیٹ پر ان کا قبضہ ہے۔ سابق وزیر اعظم یہود اولمرٹ کے زمانے میں اعلیٰ ترین عہدے پر فائز افسر یورم ٹربووکز اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ دار حکومت سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مخلوط حکومت میں شامل مادر وطن پارٹی ان سرمایہ داروں کی ایجنٹ ہے وہ حکومت کو عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے سے روکتی ہے اور کبھی عربی کے خلاف تحریک چلانے لگتی ہے تو کبھی فلسطینیوں کی حمایت کرنے والے یہودیوں کو غدار وطن ثابت کر کے ان کے خلاف قانون بنانے میں جٹ جاتی ہے۔ وزیر اعظم نتن یاہو کے ایک جانب اقتدار کی کرسی اور عوام کے مسائل ہیں اور دوسری جانب مادر وطن پارٹی اور سرمایہ دار ہیں ان دونوں کے درمیان جمہوری نظام کی چکی میں عوام پس رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اسرائیل، امریکہ یا ہندوستان کا نہیں بلکہ ان ممالک میں رائج نظام سیاست کا ہے جو بذات خود اپنے متبادل کا مطالبہ کرتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے'' اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اُس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے'' باطل نظام کی سب سے بڑی شناخت اس کی بے ثباتی ہوتی ہے جس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب بادِ مخالف سے اسکی جڑیں ہلنے لگتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ مغربی جمہوریت کے ساتھ شرق و غرب میں ہو رہا ہے۔ اس کا متبادل صرف اور صرف اسلامی خلافت ہے جس کے بارے میں فرمایا'' کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔''

اسرائیلی ریاست مغربی تحفظ کے بل بوتے مسلمانوں کی مخالفت کا مقابلہ کرتی رہی لیکن اب مغرب کے اپنے چل چلاؤ کا دور آن پہنچا ہے اور وہ خود اپنی بقاء کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے ایسے میں بھلا کسی اور کی حفاظت اس کے بس کا روگ نہیں۔ نیز اسلامی تحریک جو کبھی ایک نازک سی کونپل تھی اب ایک تناور پھلدار درخت بن گئی ہے جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں اب باطل کے لئے ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس کا بال بیکا کر سکے۔ گردشِ زمانہ نے امریکہ اور اسرائیل کو جس طرح یک وتنہا کر دیا ہے اس پر غالب کا شعر (مع ترمیم) صادق آتا ہے۔

قیس انڈیا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو  خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

# ادب و مزاح

# گاندھی جی کی عینک

(قسط اول)

ہندوستان کی ریاست مہاراشٹر میں وردھا کے مقام پر ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے اپنا ایک گھر بنایا تھا جو آگے چل کر سیوا گرام نام کے آشرم میں تبدیل ہوگیا۔ جب گاندھی جی حیات تھے تو اس آشرم سے گاؤں والوں کی سیوا کی جاتی تھی اب گاندھی جی کی سیوا بھاونا (خدمتِ خلق کا جذبہ) کی مانند یہ آشرم بھی پرکھوں کی ایک یادگار بن چکا ہے جہاں ہر سال ۳ لاکھ زائرین گاندھی درشن کے لئے آتے ہیں اوران کی نوادرات پر حیرت جتاتے ہیں۔ گاندھی آشرم میں ان کے استعمال کی اشیاء فی زمانہ نمائش کا سامان بنی ہوئی ہیں قوم کے نزدیک اس کی اہمیت اور ضرورت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سال سیوا گرام آشرم کے حکام اپنی ڈائمنڈ جوبلی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک موصوف کی عینک کے چوری ہونے کی خبر منظرِ عام پر آئی ہے اور ذرائع ابلاغ پر چھا گئی۔ چوری کی اس واردات کو چھ ماہ تک صیغہ راز میں رکھا گیا تھا ایسا کیوں ہوا؟ اس کی تحقیق وتفتیش کر کے ناظرین کو حقیقت سے واقف کرانے کی ذمہ داری 'تول کے بول' چینل نے مجھے سونپی اور اس کام کے لئے ہم سب سے پہلے معروف گاندھیائی مفکر اور دانشور شری سنکی لال اگروال کی خدمت میں جا پہنچے۔

گاندھی جی کے چشمے کی چوری کو اس قدر طویل عرصہ کیوں چھپایا گیا؟ یہ سوال جب ہم نے سنکی لال اگروال سے پوچھا تو وہ کہنے لگا

لگتا ہے آپ گاندھیائی فلسفۂ حیات کے بارے میں نہیں جانتے ورنہ یہ سوال نہیں کرتے؟

ہم نے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا یہ بات درست ہے کہ ہم نہیں جانتے لیکن گاندھی جی کے اصول ونظریات کو اس دور میں کون جانتا ہے؟

وہ ناراض ہو کر بولے ہمارے ہوتے ہوئے آپ یہ بات کہہ رہے ہیں یہ تو ہماری توہین ہے
ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ہم نے شرمسار ہو کر معذرت طلب کی اور کہا کہ اچھا تو آپ ہی گاندھیائی فلسفۂ حیات کی روشنی میں اس تاخیر کی وجہ بتلا دیں
وہ بولے گاندھی جی کی چوکی پر تین بندر رکھے ہوتے تھے اور آج تک انہیں کسی نے چرانے کی جرأت نہیں کی، وہی اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔
اچھا یہ چوکی کیا ہوتی ہے؟ ہم نے حیرت سے پوچھا
وہ ہمارے اس سوال پر چونک پڑے اور بولے آپ چوکی نہیں جانتے؟ ارے میز سمجھ لیں ایسی میز جس کے پیچھے کرسی نہ ہو؟
اچھا تو کیا انسان اس کے پیچھے کھڑا ہو کر کام کرتا ہے؟
ارے نہیں بیٹھ کر میرا مطلب زمین پر بیٹھ کر۔ گاندھی جی زمینی آدمی تھے اس لئے زمین پر بیٹھ کر اپنے سارے کام کیا کرتے تھے۔
گویا گاندھی جی انہیں آج کل کے سیاستدانوں کی طرح کرسی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی؟
جی نہیں وہ تو بے غرض مہاتما تھے
لیکن آپ ان نے بندروں کے بارے میں بتلا رہے تھے؟ کیا وہ اب بھی حیات ہیں؟ ان کی عمر کیا ہوگی؟ ہم نے سوال کیا
یہ سن کر سنکی لال اگروال صاحب کا پارہ چڑھ گیا وہ بولے آپ تو بالکل جاہل اور کندۂ ناتراش معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بندر کبھی بھی حیات نہیں تھے وہ تو ان کے مجسمے تھے جو نہ زندہ ہوتے ہیں اور نہ مرتے ہیں اسی لئے اب بھی موجود ہیں
اچھا تو وہ پتھر کے بت چشمے کی چوری کا راز فاش کریں گے؟
ارے بھئی وہ بندر نہیں بولیں گے اور اگر بولیں بھی تو ہم ان کی زبان کیونکر سمجھ سکتے ہیں
تو پھر آخر اس سوال کا جواب کون دے گا؟
میں دوں گا۔
اور وہ بندر کیا کریں گے؟
وہ! وہ کچھ نہ کریں گے میں ان کی مدد سے جواب دوں گا؟
اچھا تو آپ ان سے پوچھ کر جواب دیں گے؟ لیکن ابھی تو آپ نے کہا کہ ان کی زبان آپ

ارے بھئی مدد کا مطلب پوچھنا نہیں ہوتا یہ کہہ کر انہوں نے اپنے میز کی دراز سے تین بندروں کے مجسمے کو نکالا اس پر کافی گرد و غبار چڑھا ہوا تھا اسے صاف کیا اور پوچھا اچھا بتلاؤ کہ یہ کیا ہے؟

یہ! یہ تو وہی تین بندر ہیں جن کا ابھی آپ ذکر کر رہے تھے

اچھا یہ کیا کر رہے ہیں؟

یہ سوال مشکل تھا ہم نے کہا یہ کچھ بھی نہیں کر رہے۔ اصلی بندر ہوتے تو کچھ نہ کچھ کرتے۔ یہ بے جان بندر کیا کر سکتے ہیں بھلا؟

اصل میں تم صرف آنکھوں سے دیکھنے کا کام لیتے ہو دماغ سے سوچنے کا کام نہیں لیتے اسی لئے یہ جواب دے رہے ہو۔

مجھے ان کی بات پر غصہ آیا میں نے کہا صاحب میرا کام سوال کرنا ہے اور جواب دینا آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ پچھلے نصف گھنٹے سے میرے ایک معمولی سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھے الجھائے ہوئے ہیں۔

تم کافی جلد باز اور بے صبر قسم کے انسان ہو مفکر نے متفکر ہو کر کہا۔ یہ پوری قوم گزشتہ نصف صدی سے اس بھول بھلیاں میں الجھی ہوئی ہے اور مطمئن ہے جبکہ تم صرف آدھے گھنٹے کے اندر بے چین ہو گئے۔

میں نے کہا صاحب اس سے پہلے کہ میں ان بندروں میں شامل ہو جاؤں آپ میرے سوال کا جواب دے دیں ورنہ یہ تین کے بجائے چار ہو جائیں گے۔

یہ تم نے پتہ کی بات کہی۔ گاندھی جی یہی چاہتے تھے کہ ساری قوم ان کی مانند ہو جائے۔

ان بندروں کی مانند؟ ہم نے حیرت سے پوچھا

جی ہاں کیا تم نے ان بندروں کو کوئی معمولی چیز سمجھ رکھا ہے کیا؟ اگر گاندھی جی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا تو آج کے سارے مسائل حل ہو چکے ہوتے بلکہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔

لیکن جناب مجھے اس دور کے سارے مسائل سے کیا غرض میرا تو ایک آسان سا مسئلہ ہے۔ اس بات کا پتہ چلانا کہ آخر گاندھی جی کے چشمے کی چوری کی خبر کو اتنے دنوں تک صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب آپ کے یا گاندھی جی کے ان تین بندروں کے پاس موجود ہے؟

کیوں نہیں ایسا کوئی سوال نہیں ہے جس کا جواب ہم چاروں نہیں جانتے۔ دانشور صاحب

نے بڑے فخر سے اپنے آپ کو ان بندروں کے ساتھ شامل فرما دیا۔

آپ لوگ تو سب جانتے ہی لیکن میں نہیں جانتا اس لئے برائے مہربانی مجھے بھی از خود یا ان کے توسط سے بتلا دیجئے۔

کاش کہ تم میں چھٹانک بھر عقل ہوتی اور تم اس کا استعمال کر کے خود بخود اپنے اس سوال کا جواب جان لیتے۔

یہ سن کر ہمارا پارہ چڑھ گیا اور ہم بولے ٹھیک ہے جناب ہم تو آپ جیسے دانشور پرشاد ہیں نہیں اور نہ ان بندروں جیسے عقلمند اس لئے اب اجازت دیجئے ہم اس سوال کا جواب کسی اور سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب ہمیں آپ اجازت دیں۔

یہ سن کر سنگی لال اگروال صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں سے سنتشٹ (مطمئن) ہوئے بغیر چلے جائیں اور ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹتے پھریں کے ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں یہ تو ہماری توہین ہے

لیکن حقیقت بھی ہے۔ ہم نے سر جھکا کر کہا

جی نہیں یہ حقیقت نہیں ہے، ہم ہر سوال کا جواب جانتے ہیں ہم نے گاندھیائی فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر کھپا دی ہے۔

اچھا اگر آپ واقعی جانتے ہیں تو جواب کیوں نہیں دیتے؟

وہ بولے دیکھو یہ پہلا بندر کس حالت میں ہے؟

ہم نے اسے غور سے دیکھا اور کہا یہ تو آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اسے عینک کی کوئی ضرورت نہیں۔

وہ ڈانٹ کر بولے تم سے یہ کس نے پوچھا کہ اسے کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں جس قدر سوال کیا جائے اسی قدر جواب دو کیا سمجھے؟

ہم نے کہا سرکار غلطی ہو گئی کاش کے ان میں سے کسی بندر نے سر پر بھی ہاتھ رکھا ہوتا؟

سر پر؟ سر پر کیا ہے؟

اوپر تو نہیں اندر دماغ ہوتا ہے۔ ہم اس کا استعمال نہیں کرتے اور فاضل جواب نہ دیتے۔

خیر کوئی بات نہیں یہ بتاؤ کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھنا کس بات کی علامت ہے؟

ہم نے جواب دیا کچھ نہ دیکھنے کی علامت ہے صاحب۔ یہ بھی کوئی سوال ہے؟

تمہارا جواب غلط ہے برخوردار۔ اگر یہ تمہاری طرح معمولی بندر ہوتا تو تمہاری بات صحیح ہوتی لیکن یہ گاندھی جی کا تربیت یافتہ بندر ہے اس لئے اس پر یہ اصول صادق نہیں آتا۔

اچھا تو اس بندر کے آنکھوں پر پٹی رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ ہم نے ایک بندرانہ سوال کیا۔

اس کے معنی ہیں برامت دیکھو؟

ہمیں اس جواب پر حیرت ہوئی ہم نے پوچھا کہ صاحب اگر کسی نے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا تو اسے کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے سامنے جو کچھ ہے وہ اچھا ہے یا برا ہے؟

میرے اس سوال پر وہ سنگی لال اگروال کچھ گھبرائے لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھال کر جواب دیا ارے بھئی اس بندر نے اپنی آنکھوں پر ہمیشہ سے ہاتھ نہیں رکھا ہوا ہے بلکہ جب کوئی برائی اس کے سامنے آتی ہے تو وہ ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ اب تم ہی بتلاؤ گاندھی جی کی عینک کا چوری ہونا کوئی اچھی بات تھی یا بری بات؟

وہ تو بہت بری بات تھی جناب اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے بارے بات کرنے کے لئے مجھے آپ تک کیوں بھیجا جاتا؟

تو کیا آپ کا چینل صرف بری باتوں کی اشاعت کے لئے قائم کیا گیا ہے؟

یہ کس نے کہا؟ آپ تو ہمارے چینل پر بیٹھ کر ہمارے ہی چینل پر دشنام طرازی کر رہے ہیں

اچھا تو کیا ایسا کرنے کے لئے میں کسی اور چینل پر جاؤں؟ کیا آپ لوگ اس طرح کا مواد نشر نہیں کرتے؟ انہوں نے معصومانہ سوال کیا۔

جی نہیں جناب ایسی بات نہیں آپ کو پوری آزادی ہے آپ تو بس یہ کریں کہ ہمارے چینل پر دوسروں پر من چاہے الزامات لگائیں۔ بہتان ترازی فرمائیں۔ ہم آپ کے اظہار رائے کی آزادی کا پورا احترام کریں گے لیکن اسی کے ساتھ وہ عینک والا معاملہ۔۔۔۔۔۔۔۔ہم نے انہیں یاد دلایا۔

وہ بولے جی ہاں! جب ہمارے آشرم کے ایک ملازم نے یہ برائی دیکھی تو اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اس طرح دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ پھر اسے کچھ لوگوں نے ڈرایا کہ کہیں تجھ پر چوری کا الزام نہ دھر دیا جائے۔ یہ جان کر وہ ڈر گیا اور اپنی ملازمت بچانے کے لئے یہ بات سربراہ آشرم کے گوش گذار کر دی۔

اچھا تو وہ سربراہ چار ماہ تک کیوں خاموش رہا؟

ارے بھئی وہ بھی گاندھی وادی آدمی ہے اس نے دوسرے بندر کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے کان بند کر دیئے۔ گاندھی جی نے بری بات کو سننے سے منع کر رکھا ہے۔

اچھا تو پھر کیا ہوا؟

دو ماہ کا عرصہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور پھر آشرم کی ڈائمنڈ جوبلی منانے کی خاطر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ میں یہ بات بتلا کر ڈائرکٹر صاحب اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اس لئے کہ وہ صرف اور صرف بورڈ کے سامنے جوابدہ ہیں۔

لیکن بورڈ نے اس سنگین واردات کو سننے کے بعد کیوں چپی سادھ لی؟

سنگی لال اگروال صاحب مسکرائے اور بولے کاش کے تم نے تیسرے بندر کو غور سے دیکھا ہوتا تو یہ سوال نہیں کرتے۔

ہم نے چونک کر تیسرے بندر کی جانب دیکھا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا تھا ہمیں بڑی شرمندگی ہوئی ہم بولے اچھا تو پھر یہ راز فاش کیسے ہوا؟

انہوں نے کہا وہ تو آشرم میں کام کرنے والے ایک گائیڈ نے زائرین کے سامنے اپنی رٹی رٹائی تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ جو آپ لوگ سامنے دیکھ رہے ہیں یہ گاندھی جی کی عینک ہے۔ چونکہ عینک وہاں پر موجود نہیں تھی ایک برطانوی سیاح نے جن کے خلاف گاندھی جی نے آزادی کی تحریک چلائی تھی اسے بھانپ لیا وہ کم بخت تو تھا ہی گاندھی جی کے نظریہ کا دشمن اس نے اخبار والوں کو یہ بات بتلا دی اور تم میرا وقت ضائع کرنے کے لئے چلے آئے

ہم نے کہا صاحب اس بات کا فیصلہ کرنا تو خاصہ مشکل ہے کہ کس نے کس کا وقت ضائع کیا ہے؟ خیر میں اس کے لئے بندروں سے رجوع کروں گا

وہ بولے مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنے سارے سوالات کا جواب گاندھی جی کے فلسفہ کی روشنی میں مل گیا ہوگا؟

ہم بولے جناب گاندھی جی تو کجا ان کے بندر بھی صد فی صد حق بجانب ہیں لیکن آپ کے ایک استنباط سے مجھے اختلاف ہے

اچھا! وہ کیا؟

آپ نے دورانِ گفتگو کہا تھا اگر قوم گاندھی جی کے ان بندروں کی طرح بن جاتی تو نہ مسائل پیدا ہوتے اور نہ ان کے حل کی ضرورت پیش آتی

جی ہاں میں اب بھی یہ کہتا ہوں، سنکی لال اگروال (عرف) سنکیشور جی خوش ہو کر بولے لیکن اس میں غلط کیا ہے؟

میرا خیال یہ ہے آج کے سارے مسائل کی وجہ یہی ہے کہ ساری قوم گاندھی کے بندروں کی طرح بن گئی ہے وہ برائیوں کو دیکھتی ہے تو ان سے چشم پوشی کرتی ہے وہ بری بات کو سن کر اسے روکنے کے بجائے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہے اور اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتی منہ بھی بند ہی ہوتا ہے۔

ہماری اس بات کو سن کر سنکی لال اگروال صاحب نے اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر اور دوسرا منہ پر رکھ لیا۔ ہم نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ ان کے کانوں پر رکھ کر کہا ناظرین اس گفتگو کو اپنے ذہن سے محو کر دیں اور ٹی وی کے سامنے اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے سماج میں پائی جانے والی برائیوں کے خلاف اقدام کریں۔

سنکی لال اگروال صاحب کے چہرے پر ایک خوش گلیں مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اس لئے کہ وہ نہ دیکھ رہے تھے۔ نہ سن رہے اور نہ بول ہی رہے تھے۔

# گاندھی جی کے بندر

(قسط دوم)

معروف گاندھیائی مفکر اور دانشور شری سنگی لال اگروال کے دفتر سے جب ہم نکلے تو ان کی میز پر سے تینوں بندر غائب تھے۔ ہم وہاں سے نکل کر سیدھے وردھا کے سیوا گرام پولس تھانے پہنچ گئے۔ دروازے پر سپاہی عجیب سنگھ بیٹھا اونگھ رہا تھا وہ گویا بیک وقت گاندھی جی کے تینوں بندروں کی ذمہ داری ادا کر رہا تھا۔ نہ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا اور نہ ہی کچھ بول رہا تھا۔ ہم نے سوچا موقع غنیمت ہے ورنہ اس کی سیوا کے بغیر اندر حاضری ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ ویسے ہم لوگوں کو اپنے دفتر اس سرکاری افسران کی خدمت پر ایک محدود رقم خرچ کرنے کی پیشگی اجازت دے رکھی تھی اگر کوئی غیر معمولی مطالبہ کیا جاتا تو اس کی خصوصی اجازت لینی پڑتی تھی۔ پہلے اس کی نوبت کم ہی آتی تھی لیکن اب یہ معمولی بات ہو گئی تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا ہم سیوا گرام آشرم سے گاندھی جی کی عینک کی چوری اور اس شکایت میں تاخیر کی تحقیق و تفتیش کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔

پولس تھانیدار کھڑک سنگھ کا دفتر ویران پڑا تھا۔ ہم نے سوچا کہ تھانیدار صاحب بھی شاید اسی مہم پر کہیں باہر نکلے ہوئے ہیں اس خوش فہمی میں گرفتار ہم واپس لوٹے تو اچانک ہمیں آواز آئی ابے یہ تو اب بھی سو رہا ہے؟ ہم نے چاروں طرف دیکھا ہمارے آس پاس نہ کوئی آدم نہ آدم زاد! ایک سپاہی تھا جو سو رہا تھا پھر یہ آواز کیسی؟ اس سے پہلے کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچتے دوسری آواز آئی اوئے چپ کر ورنہ جاگ جائیگا تو مسئلہ ہو جائیگا۔ اس بار ہم نے کان لگا کر آواز کو سننے کی کوشش کی تو ہمیں محسوس ہوا گویا یہ آوازیں ہمارے جھولے کے اندر سے آ رہی ہیں۔ ہمارے لئے یہ دلچسپ انکشاف تھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جھولے کے اندر وہ

تینوں بندر براجمان تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کو باہر نکالا تو وہ کمبخت اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے کڑک کر پوچھا تم کون ہو؟

وہ بولا صاحب میں۔ میں تان سین ہوں تان سین۔

اور تمہارے ساتھ یہ دونوں کون ہیں؟

ان میں سے ایک تو نین سکھ ہے اور دوسرا مونی بابا؟

اچھا تو یہ اندر باتیں کون کر رہا تھا؟ وہ بولا صاحب یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟ آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں میرے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھسی ہوئی ہیں۔

ہم نے سوچا بندر کی بات درست ہے ہمیں اس سے یہ سوال ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب ہم نے دوسرا ہاتھ جھولے میں ڈالا اور دوسرے بندر کو باہر نکال لیا اس نے اپنی آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا ہم سمجھ گئے یہ نین سکھ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا ہم نے پوچھا کیوں تم نے ابھی ابھی کچھ کہا یا نہیں؟ وہ بولا صاحب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں اس تان سین سے نہیں پوچھتے جو آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے؟

یہ الزام ہمارے لئے بڑا تضحیک آمیز تھا ہمیں بندر کی بات پر بہت غصہ آیا اور ہم اپنا بنیادی سوال بھول گئے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ بھلا یہ ہمیں کیوں کر بے وقوف بنا سکتا ہے ہم تو پہلے ہی سے اچھے خاصے احمق آدمی ہیں۔

نین سکھ بولا اچھا تو آپ اب بھی نہیں سمجھے اس کا مطلب ہے آپ نہ صرف بے وقوف بلکہ بہرے آدمی بھی ہیں۔

ہم نے کہا ہوسکتا ہے لیکن یہ تو تم نے ہمیں دوسری بڑی گالی دے دی خیر یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے؟

کامن سینس صاحب کامن سینس! اگر یہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا تو اس نے آپ کا سوال کیسے سن لیا؟ اور آپ کو جواب کیسے دے دیا؟

ایک معمولی سے بندر نے ہماری عقل کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے اور ہمیں ڈارون کے فلسفے پر یقین آنے لگا تھا لیکن اس سے پہلے کے ہم سنبھلتے تان سین بول پڑا۔ صاحب یہ جھوٹا ہے اول درجے کا ریاکار آپ اس کی ایک نہ سنیں آپ تو نہایت عقلمند آدمی ہیں۔ تان سین کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ہم پسیج گئے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ اس کائنات کی سب سے عقلمند ہستی اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ اس بندر کی ذات ہے جو ہمیں عقلمندی کا سپاس نامہ عطا کر رہی ہے ورنہ اس سے قبل ایسی غلطی کسی سے

سرزد نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے مسکرا کر پہلے بندر کا شکریہ ادا کیا اور کہا تمہاری بات درست ہے لیکن آخر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے؟

تان سین مسکرایا اور بولا آپ عقل کے اندھے تو نہیں ہیں لیکن آپ کی بینائی کے بارے میں میرے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ کہیں آپ گاندھی جی کی عینک خود اپنے لئے تو تلاش نہیں کر رہے؟

اپنے چہیتے بندر کی اس بات نے ہمیں چونکا دیا ہم نے کہا گاندھی جی کی عینک استعمال کریں میرے دشمن۔ میری تو آنکھیں ابھی تک صحیح سلامت ہیں ماشااللہ۔

سو تو میں دیکھ رہا ہوں۔ بڑی خوبصورت غزال آنکھیں ہیں آپ کی لیکن میں اس کے اندر پائی جانے والی قوت بصارت کی بات کر رہا تھا۔

اپنی آنکھوں کی اس تعریف کے بعد ہم یکسر شرما گئے اور لجاتے ہوئے اٹھلا کر بولے کیسی باتیں کرتے ہو؟ میری بصارت کو کیا ہو گیا ہے؟ اچھی بھلی تو ہے۔

اچھا اگر ایسا ہے تو آپ دیکھ نہیں رہے کہ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اب جس کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہو وہ بھلا کیسے دیکھ سکتا ہے کہ کون جھوٹا ہے اور کون سچا؟

نین سکھ بولا جھوٹ اور سچ کے درمیان تمیز کرنے کی خاطر آنکھوں کی نہیں کان کی ضرورت پڑتی ہے میری تو آنکھیں بند ہیں لیکن اس کاذب نے کانوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود سب کچھ سن رہا ہے اور پٹر پٹر بول رہا ہے۔ نین سکھ کی بات نہایت معقول تھی لیکن چونکہ تان سین کے خلاف تھی جو ہماری تعریف اور توصیف بیان کرتا رہا تھا اس لئے اس کی دلیل کو تسلیم کرنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا۔ آخر حق نمک بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟ ہم نے کہا کہ بھائیو میں تم دونوں کے دلائل سے خاصہ کنفیوز ہو چکا ہوں اور فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کون حق پر ہے کون باطل۔

میری یہ بات سن کر تان سین باغ باغ ہو گیا گویا اس کی من مراد پوری ہو گئی ہو۔ وہ بولا آپ واقعی نہایت حق پسند اور صاف گو صحافی ہیں۔ آپ خود اپنے خلاف بھی کسی حقیقت کا اعتراف کرنے سے نہیں کتراتے۔ ہم نے پھر ایک مرتبہ اپنی پیٹھ تھپتھپائی اور دعا کی کہ کاش یہ بندر حکومت کی اعلیٰ سطحی کمیٹی میں موجود ہوتا جو صحافیوں کی تکریم کرتی ہے اور انہیں اعزاز سے نوازتی ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہمیں بھی صحافت کے میدان میں پدم بھوشن نہ سہی پدم شری کا خطاب تو مل ہی جاتا۔ ہم نے شکر و احسان کے جذبات سے سرشار ہو کر اپنے پسندیدہ بندر کی جانب دیکھا اور اس کی زلفوں میں ہاتھ

پھیرنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر نین سکھ جس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا چراغ پا ہو گیا اور بولا جناب یہ آپکو اپنی باتوں میں الجھا رہا ہے آپ کی بیجا تعریف بیان کر کے آپ کو بہلا پھسلا رہا ہے۔

یہ تہمت ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ہم بولے دیکھو تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ ڈارون نے تمہارے بارے میں جو بھی کہا ہو لیکن تم یہ نہ بھولو کہ تم آخر ایک بندر ہو بندر کیا سمجھے۔

میری یہ تضحیک آمیز جھڑکی تان سین پر گراں گزری۔ اس لئے کہ وہ جو بھی تھا تو بالآخر ایک بندر ہی اور یہ اس کی ساری برادری کی توہین تھی۔ اس نے رسوائی کے اس کڑوے گھونٹ کو کسی طرح زہر مار کیا اور بولا جناب آپ اس احمق کے باعث ہماری برادری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں اگر اپنے کنفیوژن کو دور ہی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے تیسرے بھائی مونی بابا کا تعاون لیں جو آپ کے جھولے سے ہنوز بند ہے؟

نین سکھ نے اس تجویز پر زوردار قہقہہ لگا کر کہا لو اس کی سنو یہ اس مونی کو اپنے حق میں گواہ بنا رہا ہے جس نے از خود اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ اس کے ایک منہ پر دو دو ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دلیل بھی معقول تھی۔ نین سکھ ویسے تو ساری باتیں معقول کرتا تھا لیکن اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف ہماری تعریف بیان کرنے سے احتراز کرتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً ہماری تذلیل بھی کر دیتا تھا۔ اس کے باعث ہمارے دل میں اس کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے تھے جو اس کی ہر معقول بات کو جلا کر بھسم کر دیتے تھے۔

اس موقع پر تان سین پھر ہماری مدد کے لئے آگے آیا اور کہنے لگا اس عقل کے اندھے کو دیکھئے۔ کیا صحیح بات کو کہنے کے لئے بھلا زبان لازمی ہے؟

ہمارے پاس اس سوال کا جو جواب تھا وہ اس نین سکھ کے حق میں تھا جو ہمارا دشمن تھا اور تان سین کے خلاف تھا جو ہمارا دوست تھا اس لئے ہم نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ لیکن نین سکھ اس موقع پر خاموش نہیں رہا بلکہ بولا جناب عالی آپ اس کے سوال پر خاموش کیوں ہیں بولتے کیوں نہیں؟ کیا انسان زبان پر تالا لگا کر سچ بات کہہ سکتا ہے؟

اس سے قبل کہ ہم مجبور ہو کر اپنی من بھر بھاری زبان کو جنبش دیتے تان سین بول پڑا۔ دراصل یہ احمق آج بھی اس پتھر کے زمانے میں جی رہا ہے جب اظہار رائے کے لئے زبان کی مجبوری تھی، سائنسی ترقی سے بالکل بے بہرہ ہے بیچارہ۔

نین سکھ نے جب اپنے بارے میں بے بہرہ کا لقب سنا تو وہ بھتے سے اکھڑ گیا اور چیخ کر بولا بہرہ ہو گا تو اور تیرا باپ۔ میری تو سماعت الحمد اللہ سلامت ہے۔

تان سین مسکرایا اور بولا اس بیچارے کو اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ بے بہرہ کسے کہتے ہیں اور بے بہرہ جو بھی ہو کم از کم بہرہ نہیں ہو سکتا۔ بے لگا دینے سے ہر لفظ اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً بے نقاب، بے ایمان، بے ادب، بے عقل، وغیرہ وغیرہ۔ ہم تان سین کی اس دلیل پر جھوم اٹھے اور کہا کیا بات کہی تم نے لاجواب دلیل ہے صاحب۔

ہماری اس تعریف سے کھسیا کر نین سکھ بولا اچھا تو تمہارے اپنے یعنی بے وقوف اور بے فضول کے بارے میں کیا خیال ہے؟

تان سین میری جانب دیکھ کر بولا دراصل بے وقوف کون ہے اور عقلمند کون ہے اس کا فیصلہ کرنے کے حقدار تو ہمارے صاحب ہیں لیکن چونکہ وہ ذرا کنفیوز ہو گئے ہیں اس لئے میں ہمارے بھائی کی مدد لے رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھائی ہے یا قصائی۔ پہلے تو یہ آپ کی توہین کر رہا تھا اب اپنے بزرگ موٹی بابا کا مذاق اڑا رہا ہے۔

نین سکھ بولا اوئے چرب زبان بندر اپنی چاپلوس چونچ کو بند کر اور یہ بتلا کہ وہ جھولے کے اندر بند بیٹھا موٹی کیسے اپنا فیصلہ سنائے گا؟

تان سین بولا اب ہوئی نا کام کی بات اگر کوئی بات معلوم نہ ہو تو سمجھدار لوگوں سے پوچھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کام ادب و تمیز کے ساتھ کیا جاتا ہے خیر کوئی بات نہیں جب تو نے پوچھ ہی لیا تو سن۔ فیصلے نہ صرف سنائے جاتے ہیں بلکہ انہیں تحریری شکل میں تم جیسے ڈھیٹ لوگوں کے منہ پر لکھ کر دے مارا جاتا ہے اور ایسے میں منصف کو فیصلہ لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دینا پڑتا ہے۔

ہم پھر ایک بار پہلے بندر کی شاندار دلیل پر جھوم اٹھے اور کہا کیا بات ہے؟ کیا بات ہے میرے شیر! تمہیں تو بندر کے بجائے لومڑی ہونا چاہئے تھا۔

نین سکھ بولا لومڑی کیوں؟

اس لئے کہ اسی کو سب سے عقلمند جانور مانا جاتا ہے۔

تان سین کے چہرے پر میری اس تعریف سے پھر ایک بار ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے وہ بولا صاحب ویسے آپ آدمی تو بہت نیک طبع ہیں لیکن بے جا مرعوبیت کا شکار ہیں۔

ہم نے پوچھا ارے بھئی ہم نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو تمہارے حسنِ طبع پر گراں گزری؟

تان سین بولا بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے آگے لومڑی اور شیر کس کھیت کی مولی ہیں۔ اس سے پہلے تو ہم بس حضرت انسان کو اپنے سے اعلیٰ وارفع خیال کرتے تھے لیکن آپ سے ملنے کے بعد ہم اپنے اس خیال پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اپنے چہیتے بندر تان سین کی دیگر بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی ہمارے سر کے اوپر سے نکل گئی لیکن ہم نے حسب عادت استفسار کرنے سے گریز کیا اور سوال کیا بھائی فیصلے تو عدالت میں یقیناً لکھے جاتے ہیں لیکن یہ تمہارا بھائی اپنا فیصلہ کیسے لکھے گا؟

یہ تو بڑا عجیب سوال آپ کر رہے ہیں ارے بھئی جیسے کوئی پڑھا لکھا انسان لکھتا ہے اسی طرح لکھے گا۔ ہمارے مونی بھی کوئی کم عالم فاضل تھوڑے ہی ہیں وہ تو اس کی انکساری ہے جو انہوں نے اپنی تھیسس نہیں لکھی ورنہ انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینا آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی درسگاہوں کے لئے اعزاز کی بات ہوتی۔

نین سکھ بولا یار اب تو تم کچھ زیادہ ہی بول گئے کیا کیمبرج وغیرہ کی ڈگری پیڑوں کی شاخوں پر لگی ہوئی ہوتی ہیں جو کوئی لنگور پھدک کر اچک لے؟

تان سین اس بات پر چراغ پا ہو گیا اور بولا تم جیسے احساسِ کمتری کا شکار لوگوں کی وجہ سے اس دنیا میں ہماری نسل عزت وتوقیر سے محروم ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے ساری دنیا کی درسگاہوں پر ہمارا بول بالا ہوتا۔

ان دونوں بندروں کی لڑائی میں ہمیں غور وفکر کرنے کا نادر موقع مل گیا۔ ہم نے کہا تم کیسے گاندھی وادی بندر ہو جو عدم تشدد کا راستہ چھوڑ کر لڑائی جھگڑے پر تلے ہوئے ہو؟ ہم نے بندر بانٹ کا پانسہ ڈالتے ہوئے کہا میں مانتا ہوں کہ تمہارا بھائی لکھنا پڑھنا جانتا ہے لیکن فی الحال میرے پاس قلم قرطاس بھی تو نہیں جو اس پر فیصلہ لکھوایا جا سکے۔

تان سین بولا یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی آج کل لوگ قلم دوات سے لکھتے ہی کب ہیں؟

نین سکھ نے حیرت سے پوچھا۔ اچھا اگر قلم دوات سے نہیں تو کس چیز سے لکھتے ہیں بھلا؟

بھئی زمانہ بدل گیا تان سین اکڑ کر بولا آجکل تو لوگ کمپیوٹر یا فون کے 'کی بورڈ' سے لکھتے ہیں اور کاغذ کے بجائے مانیٹر پر اسے پڑھ لیتے ہیں۔

ہاں ہاں وہ تو مجھے پتہ ہے لیکن کیا تمہارا مونی بابا بھی کمپیوٹر چلانا جانتا ہے؟

آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں کمپیوٹر تو کیا وہ ہوائی جہاز چلانا بھی جانتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے منہ سے بولتے نہیں اس لئے کوئی انکی قدر نہیں کرتا۔

تان سین اور مونی بابا کے آگے ہمیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا ہم نے کمرے میں ایک جانب اپنا لیپ ٹاپ نکال کر کھولا اور جھولے سے مونی بابا کو نکال کر اس کے سامنے بٹھا دیا۔ مونی بابا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لپک کر کمپیوٹر چلا دیا اور ایم ایس ورڈ کا صفحہ کھولا۔ کی بورڈ کی سیٹنگ کو بدل کر اسے اردو فونیٹک میں تبدیل کیا اور فیصلہ لکھنے کی ابتداء کر دی۔ سب سے اوپر درمیان میں لکھا شروع اللہ کے نام سے۔ پھر نیچے بائیں جانب کنارے تمہید لکھا اور اس کے آگے یوں لکھنے لگا۔ ہم سب ریا کار ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں۔ ہم سنتے ہیں مگر وہی جو ہم چاہتے ہیں اور ہم بولتے ہیں مگر وہ نہیں جو ہمیں بولنا چاہئے۔ اس بیچ پہرے پر بیٹھے ہوئے سپاہی کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا سامنے ایک بندر کمپیوٹر پر کچھ لکھ رہا ہے اسے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے بھیانک خواب گھبرا کر اس نے پھر اپنی آنکھیں موند لیں اور خواب خرگوش میں کھو گیا۔

# انسان کے اندر چھپا ہوا بندر

(قسط سوم)

وردھا کے پولس تھانے میں حوالدار عجیب سنگھ نے اپنی آنکھیں بند کیں تو ہم نے عافیت کی سانس لی اور اپنے چہیتے بندروں کی جانب دیکھا۔ نین سکھ (یا مونی بابا؟) بے تکان اپنا فیصلہ ٹائپ کر رہا تھا۔ ہمیں لگا جلد ہی یہ قلم کے بجائے کمپیوٹر کو توڑ دے گا۔ اب ہماری نگاہ نین سکھ کی جانب اٹھی تو دیکھا کہ وہ بھی کنکھیوں میں فیصلے کو پڑھ رہا ہے اور تان سین کے لبوں پر حسب معمول مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔ ہم نے بھی مسکرا کر جواب دیا تو وہ بولا صاحب عجیب سنگھ کے دوبارہ سونے کو غنیمت جانئے اور یہاں سے بھاگ چلئے۔

کیوں کیا ہم کوئی چور ڈکیت ہیں جو تم ہمیں اس طرح سے ڈرا رہے ہو؟ نین سکھ بولا

کیا تم نہیں جانتے کہ جب دو بڑے لوگ بات کر رہے ہوں تو درمیان میں ٹپک پڑنا بد اخلاقی میں شمار ہوتا ہے۔ تان سین نے اپنی لن ترانی جاری رکھی۔

دیکھو تان سین میں نے ایک سیدھا سا سوال کیا تھا جس کا جواب دینے کے بجائے تم کچھ اور ہی بکواس کرنے لگے۔

یہ بکواس نہیں حقیقت ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فی الحال ہم لوگ پولس والوں کے نرغے میں ہیں۔ کسی بھی وقت کھڑک سنگھ وارد ہو سکتا ہے بلکہ دوبارہ عجیب سنگھ بیدار بھی ہو سکتا ہے۔

ہوتا ہے تو ہو جائے اور آتا ہے تو آ جائے، ہمارے یہاں آنے کا مقصد ہی ان سے ملاقات کرنا ہے؟ ہم نے جواب دیا

تان سین بولا صاحب ہمیں احتیاط و ہوشیاری سے کام لینا چاہئے

احتیاط کیسا احتیاط؟ ہم لوگ پولس تھانے میں ہیں یہاں کون سے خطرات ہو سکتے ہیں

اسی لئے تو احتیاط کی ضرورت ہے کہ ہم تھانے میں ہیں اس سے زیادہ خطرناک جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے؟

کیا مطلب ہم نے حیرت سے پوچھا؟

تان سین بولا صاحب آپ صحافی ہیں اخبار لکھتے ضرور ہیں لیکن انہیں پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ورنہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ آپکو پتہ بھی ہے کہ یہ پولس والے عوام کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟

انہیں نہیں پتہ تو میں بتلائے دیتا ہوں نین سکھ بولا حالانکہ نہ میں اخبار پڑھ سکتا اور نہ ہی ٹی وی دیکھ سکتا ہوں

او ہو تم تو بڑے انتریامی ہو گئے؟ تان سین نے فقرہ کسا

اس میں انتریامی ہونے کی کیا بات ہے، اگر انسان اپنے کان کھلے رکھے تو یہی کافی سے زیادہ ہے۔ میں نے سنا ہے پچھلے دنوں پولس والوں نے مدھیہ پردیش کے ضلع ستنا میں بیچ سڑک پر ایک نیم پاگل آدمی کو لاٹھیوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا

اچھا تو گویا پولس والوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ شخص اگر نیم پاگل ہے تو وہ مکمل طور پر پاگل ہیں تان سین نے پھر چٹکی لی

نین سکھ بولا تم عجیب آدمی ہو ایک معصوم انسان کی جان گئی اور تم اس سے مزہ لے رہے ہو۔ تم بندر ہو کر بھی ان انسانوں سے گئے گزرے ہو گئے ہو جو وہاں تماش بین بن کر کھڑے ہوئے تھے

کون کہتا ہے کہ وہ خاموش تماش بین تھے؟ میں نے تو سنا ہے اس ظلم کی ابتدا عوام ہی نے کی تھی پولس نے تو صرف یہ کیا کہ اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ یہ بات موٹی بابا نے اپنے فیصلے کے دوران سرخ رنگ میں لکھی اور ہمیں دکھلا کر مٹا دیا

تان سین بولا لیکن لوگ بیچارے کر ہی کیا سکتے تھے؟

ہم نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو تان سین ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ایک آزاد ملک ہے وہاں انسانی جان و مال کو دستوری تحفظ حاصل ہے بلکہ یہاں جمہوری نظام رائج ہے جو عوام کا اپنا ہے عوام کے ذریعہ قائم ہوتا ہے اور عوام کی خاطر چلایا جاتا ہے۔

یہ آپ کس ملک اور کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا

ہوں کہ گزشتہ دنوں جب چار لوگ آندھرا پردیش کے ایس آنگر میں ایک ایسے ہی قتل کی رپورٹ لکھوانے کے لئے تھانے پہونچے تو پولس والوں نے انہیں کے خلاف مقدمہ درج کرلیا اب بھلا ایسے میں کون پولس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کرسکتا ہے؟

ہم نے کہا یہ سب اس عظیم ملک کو بدنام کرنے کی خاطر اڑائی جانے والی بے بنیاد خبریں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہمارے ملک میں عوام کے سامنے بڑے بڑے رہنماؤں کو ہاتھ پسار کر آنا پڑتا ہے۔

یقیناً انتخاب سے پہلے ایسا ہوتا ہے لیکن اسکے بعد جب یہی عوام ہاتھ پسار کر اپنے حقوق کی خاطر میدان میں آتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ نین سکھ نے پوچھا

تان سین بولا اب تم ہی بتلاؤ کہ کیا ہوتا ہے؟

میں کیا بتلاؤں تم خود ہی یوٹیوب پر نالندہ میں خواتین مظاہرین پر ہونے والی پولس کی بہیمانہ لاٹھی چارج کا مشاہدہ کرلو

اچھا یہ تمہیں کیسے پتہ چل گیا تم بھی ان خواتین کے ساتھ زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے؟ تان سین نے فقرہ کسا

نین سکھ بولا تم بھی انسانوں کی چاپلوسی کرتے کرتے بالکل عقل سے پیدل ہو گئے ہو میں نے خود یوٹیوب پر اس فلم کو دیکھا، نہیں معاف کرنا سنا ہے

فلم دیکھی جاتی ہے یا سنی جاتی ہے؟ تان سین نے پوچھا

دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں مجھ جیسے اندھے اسے سنتے ہیں اور تم جیسے بہرے اسے دیکھتے ہیں یہ کون دیکھنے اور سننے کی باتیں کر رہا ہے؟ عجیب سنگھ نیند ہی میں منمنایا

تینوں بندر پھدک کر پھر جھولے میں پہنچ گئے اور بولے صاحب نکل چلئے اس سے پہلے کہ یہ ہمیں نیند میں خلل کے سبب دہشت گرد بنا کر پوٹا کے تحت گرفتار کر لے۔ اس کے بعد ہم دہشت گرد ہیں یا نہیں یہ ثابت کرنے کی ذمہ داری خود ہمارے ہی سر آن پڑے گی۔ آپکی مدد کے لئے تو صحافیوں کی یونین آجائیگی ہم بندروں کا کیا ہوگا ہمارے لئے تو اس کل یگ میں نہ بجرنگ بلی ہے اور نہ بجرنگی۔ یہ مونی بابا بول رہا تھا گھبراہٹ کے مارے اس نے اپنا مون برت توڑ دیا تھا۔

ہم بھی ان بندروں کے دلائل سے اچھے خاصے مرعوب بلکہ خوفزدہ ہو چکے تھے اس لئے پہلے تو باہر آئے پھر پوچھا اب جانا کہاں ہے؟

تان سین بولا کیوں آپ کا کوئی گھر نہیں ہے کیا؟ اگر نہیں تو گاندھی جی کی طرح کوئی آشرم بنا

لیجئے ورنہ وہیں چلئے۔

ہم نے جھولے کے اندر ہاتھ ڈال کر اندازے سے تان سین کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر آ گئے۔

دوسرے دن صبح جب ہم اپنے مہمان خانے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بندر تو غائب ہیں ان کی جگہ ایک باریش سوامی بھگوا وستر دھارن کئے بیٹھے ہیں۔ سوامی جی کے بغل میں ایک مضحکہ خیز بزرگ سر پر گاندھی ٹوپی لگائے براجمان ہیں اور ایک کونے میں ایک شخص نصف آستین کا ڈیزائنر کرتا پہنے ہوئے اٹالین عینک میں فون پر گودھرا سے سالگرہ کی مبارکباد وصول کر رہا ہے۔ ہم نے سوچا یہ کون لوگ ہیں جو بلا اجازت ہمارے گھر میں گھس آئے اور انہوں نے ہمارے بندروں کو کہاں بھگا دیا؟ ہم نے انہیں پرنام کیا اور پوچھا۔ آپ لوگ کب، کیوں اور کہاں سے یہاں آن پہنچے؟

عینک والے صاحب نے اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تم مجھے نہیں جانتے۔ امریکی انتظامیہ نے مجھے ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کے لئے مناسب ترین امیدوار قرار دیا ہے اور تم تو جانتے ہی ہو ہندوستانی عوام امریکہ سے کس قدر مرعوب ہے۔ اب تو بس انتخاب کا انتظار ہے جب وہ میرے نام پر مہر لگائیں گے اور میں ہندوستان کے تختِ طاؤس کو برطانیہ سے واپس لا کر اس پر براجمان ہو جاؤں گا۔

عوام کو تو خیر بہلایا پھسلایا جا سکتا ہے لیکن تمہاری اپنی جماعت کے خواص کا کیا بنے گا؟ ہم نے سوال کیا

بھئی دیگر خواص کی مانند ہمارے خواص بھی بکاؤ مال ہیں انہیں وزارت اور دولت کی قیمت پر خرید لیا جائے گا

وہ بھی ٹھیک ہے لیکن میرے وہ بندر کہاں چلے گئے؟

حضور آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں ہی تو ہوں آپ کا چہیتا تان سین

اچھا اور یہ دونوں حضرات کون ہیں؟

یہ موٹی بابا ہیں جو یوگا کرنے میں مصروف ہیں اور یہ گاندھی ٹوپی اپنے نین سکھ نے سر پر سجالی ہے اس لئے آپ اسے پہچان نہیں پا رہے ہیں

لیکن راتوں رات میں یہ سب کیا ہو گیا۔ اس قدر انقلاباتِ زمانہ ایسی تیزی کے ساتھ پہلے تو برپا نہیں ہوتے تھے؟ ہم نے استفسار کیا

نین سکھ بولا آپ نے ٹھیک کہا زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ کل یگ ہے کل یگ۔ پہلے جس کام کو کرنے کے لئے صدیاں درکار ہوتی تھیں اب وہ کام منٹوں میں ہو جاتے ہیں زمانہ جمل کے بجائے جیٹ کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن راتوں رات داڑھی وچوٹی کا اگ آنا اور دم کا غائب ہو جانا مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟

ارے بھئی ڈاروِن نے اپنی مرگِ مفاجات کے فلسفے میں یہی تو کہا تھا کہ جس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ جھڑ جاتی ہے اور جس کی ضرورت پیدا ہوتی ہے وہ نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ سب فلسفے کی باتیں ہیں ان کا حقیقت سے کیا تعلق؟ ہم نے اپنی بے یقینی پر اصرار کیا

تعلق کیوں نہیں؟ تان سین بولا پرانے لوگوں کو کتنے پہاڑے یاد ہوتے تھے اب کیلکولیٹر نے ان کی ضرورت کو اس طرح ختم کیا کہ پہاڑ جیسے پہاڑے روئی کے گالے بن کر اڑ گئے۔

نین سکھ نے پہلی مرتبہ تان سین کی تائید کی اور بولا جی ہاں اس میں کیا شک ہے آپ ہی بتلائیے کہ پہلے آپکو اپنے دفتر، گھر اور دوست واحباب تک کے ٹیلی فون نمبر زبانی یاد ہوتے تھے جبکہ اب آپ کو اپنا موبائل کا نمبر بھی یاد نہیں رہتا جو آپ کا حقیقی شریکِ حیات بن گیا ہے۔ گویا یادداشت کی ضرورت کم ہوئی تو اسے مشینوں نے نگل لیا۔

بندروں کے دلائل کا قائل ہونے کے بعد ہم نے پوچھا لیکن یہ یوگی بابا تو بہت بولتے تھے اب انہیں کون سا سانپ سونگھ گیا جو مون برت رکھ لیا۔

تان سین بولا آپ نے صحیح کہا جب آدمی بہت زیادہ بولنے لگتے تو اس کی بولتی بند کر دی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے زمانے میں ہم لوگ بلیوں کو بانٹ کر اپنا کام چلاتے تھے لیکن آجکل ایک اطالوی بلی ہم لوگوں کو ٹھینگی کا ناچ نچا رہی ہے۔ بابا ہندوستان کی سیاہ دولت کا شور مچاتے تھے جو بیرونِ ملک ہے۔ بلی نے یہ کیا کہ ان سے ان کی سفید دولت کا حساب مانگ لیا جو ملک کے اندر ہے۔ پھر کیا تھا ان کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے اور ایسے میں جب ان کا دستِ راست آگے آیا تو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف نیپالی ہے بلکہ غیر قانونی طور پر ان کے آشرم میں عیش کر رہا ہے۔

تان سین کی باتیں سن کر مونی بابا کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ صبر کر گئے اور اپنے یوگ آسن سے باہر نہیں آئے سب کچھ چپ چاپ دیکھتے اور سنتے رہے لیکن کچھ نہیں بولے اب انہیں اس کی عادت ہو چکی تھی انہوں نے از خود اپنی زبان پر قفل لگا لیا تھا لیکن نین سکھ اسے برداشت نہ کر سکا اور بولا تان

سین تم کیسے غدار بندر ہو انسانوں کو خوش کرنے کے لئے خود اپنی برادری کو بدنام کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے

شرم مجھ کو نہیں تم لوگوں کو ان کاموں پر آنی چاہیے جس کے عیاں ہونے سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ تان سین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ تم خود باتیں تو بڑی بڑی کرتے ہو لیکن اپنی آنکھوں پر سے اس زعفرانی پٹی کو نہیں ہٹاتے جو تمہارے حامیوں نے باندھ رکھی ہے۔ وہ لوگ جو تم سے بولتے ہیں وہی تم لوگوں سے بولتے ہو۔

ان الزامات کو سن کر ہمارا دل دہل گیا اس لئے کہ ہم خود نین سکھ کے ساتھ پاکستان اور امریکہ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہم نے پوچھا میرے پیارے تان سین ویسے تو تمہاری ہر بات مجھے صحیح لگتی ہے لیکن پھر بھی ان سنگین الزامات کو میں بغیر ثبوت کے تسلیم نہیں کر سکتا۔

تان سین بولا ویسے تو ثبوت بے شمار ہیں لیکن میں دو مثالیں دیتا ہوں۔ اس نین سکھ نے پہلے حق معلومات کی تحریک چلا کر اپنی شہرت بڑھائی اور پھر بدعنوانی کا محاذ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس دوران خود اس کے ساتھ بدعنوانی کے خلاف شور شرابا کرنے کے بجائے عملاً کام کرنے والی شہلا مسعود کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس بیچاری نے اسی کی شہ پر اپنی معلومات کا حق استعمال کر کے بدعنوانوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے شہلا کے بہیمانہ قتل پر اتنا بھی احتجاج نہیں کیا جتنا کہ کیجریوال پر لگے حقیقی الزامات کی حمایت میں کیا تھا۔ اس لئے کہ شہلا مسعود کے قتل کی سوئی زعفرانی ریاستی سرکار اور سنگھی رہنماؤں کی جانب مڑتی تھی۔ اسے چدمبرم اور چوہان کی ترنگی بدعنوانی دکھلائی دیتی ہے لیکن ریڈی اور امرا اسے نظر نہیں آتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ صرف بولتا اور سنتا ہے مگر دیکھتا اور سوچتا نہیں ہے۔ اپنے دماغ کا استعمال نہیں کرتا یہ تو بس بھوپوں ہے بھوپوں۔

تان سین کی لمبی تان سن کر نین سکھ تو بیچارہ بے ہوش ہو گیا لیکن مونی بابا نے اپنا برت توڑ دیا اور بولے اوئے تان سین میں نے تجھ جیسا نمک حرام نہیں دیکھا تو جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو نے کیشو کے پیر چھوئے اور پھر اسی کے قدم اکھاڑ دئے۔ اس کے بعد تو گاڑیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کا گلا دبا دیا۔ اپنے بچپن کے دوست پنڈیا تک کو موت کے گھاٹ اتارنے سے تو نہیں ہچکچایا۔ اڈوانی کی رتھ کا مہارتھی بنا اور اب اسی کی ہوا نکال دی۔ امیت شاہ کے ذریعہ ونجارہ سے فرضی انکاؤنٹر کرواتا رہا اور پھر دونوں کو بلی کا بکرہ بنا کر ٹھکانے لگا دیا۔ تجھے مسلمانوں کا ووٹ بنک نظر آتا ہے لیکن عشرت جہاں اور سہراب الدین کے خون کے دھبے نہیں

دکھلائی دیتے کل تک تو مسلمانوں کے قتل عام کو جائز قرار دے کر ہندوؤں کے ووٹ مانگتا رہا اور اب ان کی مسیحائی کا دم بھرنے لگا ہے۔ شرم تو تجھے آنی چاہئے بلکہ چلو بھر پانی میں تجھے ڈوب مرنا چاہئے۔ تو صرف اپنے مفادات کو دیکھتا ہے اور اس کے لئے بے تکان بولتا ہے۔ تجھے نہ تو فسادزدگان کی آہ و بکا سنائی دیتی ہے اور نہ ہی سنجیو بھٹ جیسے پولس افسر کے ضمیر کی آواز۔ تو سمجھتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک دے گا لیکن یہ سب اس قدر آسان نہیں جتنا کے تو سمجھتا ہے۔

یوگی بابا کی تقریر سن کر نین سکھ کی آنکھیں کھل گئیں انہوں نے اپنی آنکھوں پر لگی پٹی کو اتارا اور بولے یوگی بابا آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں دراصل ہم نے بنیادی غلطی یہ کی کہ ہم انسانوں سے مرعوب ہو گئے اور انسان بننے کی کوشش کرنے لگے یہی ہماری سب سے بڑی غلطی تھی یہ کہہ کر نین سکھ نے اپنی گاندھی ٹوپی کھڑکی سے باہر ہوا میں اچھال دی موٹی بابا نے کہا تم نے صحیح کہا نین سکھ یہ چوٹی اور یہ چولہ یہ سب کچھ پاکھنڈ (منافقت) ہے۔ یہ ہمیں نہیں انسانوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ یوگی بابا نے جیسے ہی سر پر ہاتھ پھیرا چوٹی غائب ہوگئی اور اندر سے وہی پرانا بندر نمودار ہو گیا جو چولے کی حاجت سے بے نیاز تھا۔ تان سین نے دو دیرینہ ساتھیوں کو اپنی پرانی حالت میں جاتے دیکھا تو اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

دوسرے دن گلی کے نکڑ پر جہاں تان سین کی لاش ملی تھی ہنومان چالیسا کا پاٹھ ہو رہا تھا ماروتی کے نئے مندر کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا اور بے شمار نئے اور پرانے بندر جمع ہو کر جے بجرنگ بلی کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

# تعلیم کی سیاست اور تجارت

ہندوستان میں نافذ ہونے والے تعلیم کے لازمی قانون سے ساری دنیا حیرت زدہ ہے لوگ سوچ رہے ہیں کہ کیا تعلیم کا حصول بھی کوئی ایسا حق ہے جس کو مہیا کرنے کے لئے دستور کی ترمیم واجب ہوتی ہے حالانکہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سانس لینے اور کھانے پینے کا حق یہ بنیادی حقوق کسی دستور کے محتاج نہیں ہیں بلکہ کسی دستور کی ترمیم کے ذریعہ نہ انہیں سلب کیا جا سکتا ہے اور نہ انہیں بحال کیا جا تا ہے۔ مسلم عوام تو اسے اپنے حق سے آگے فرض کے درجے میں رکھتے ہیں لیکن ہندوستان کے عوام کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا اس لئے کہ صدیوں تک یہاں نووارد براہمن اقلیت نے ملک میں بسنے والی عظیم اکثریت کو شودر قرار دیکر تعلیم کے حق سے محروم کر رکھا تھا ہمارے ارباب اقتدار شاید اب بھی رام راجیہ کے سپنوں میں کھوئے رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ رام کا راجیہ صدیوں پہلے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا جس میں علم حاصل کرنے کے جرم کی پاداش میں مریادہ پرشوتم رام نے شمبوکا نام کے شودر کا سر اپنے ہاتھوں سے قلم کر دیا تھا اس رام راجیہ کو کل یگ میں دوبارہ قائم کرنے کا خواب پہلے مہاتما گاندھی نے دیکھا مگر کل یگ کے رام بھکت ناتھورام گوڈسے نے انہیں گولیوں سے بھون دیا اسکے بعد راجیو گاندھی نے ایودھیا میں جا کر اس عزم کا اعادہ کیا تو راون کے ونشجوں نے ان کا کام تمام کر دیا اڈوانی جی بڑے لاؤلشکر کے ساتھ اپنا رام رتھ لیکر سومناتھ سے نکلے لیکن ان کا سیاسی رتھ قائداعظم کے مزار پر پہونچ کر پنچر ہو گیا حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے جو تحفہ اس خطہ ارض کو ملا وہ تاج محل یا لال قلعہ نہیں بلکہ ذات پات کے غیر منصفانہ تفریق کا خاتمہ اور سارے عوام کے لئے تعلیم اور عزت نفس کے حق کی بحالی تھا انگریزوں نے تمام تر ظلم و ستم کے باوجود اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی بلکہ گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر تعلیم کے فروغ میں مدد کی لیکن اب

انگریز جا چکے ہیں ہم آزاد ہو گئے ہیں اس کے باوجود تعلیم کا بنیادی حق ہمیں ۶۴ سال بعد ایک دستوری ترمیم کی بدولت حاصل ہو رہا ہے یہ ہماری جمہوری سیاست کا ایک طرہ امتیاز ہے۔

جمہوریت میں سیاست ایک تجارت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے اس کاروبار میں دوکاندار امیر سیاستدان ہیں اور گاہک غریب عوام ہوتے ہیں چونکہ یہ ایک سوداگری ہے اس لئے اس میں بھی لین دین لازمی ہے سووہ بھی ہوتا ہے عوام کو وعدے اور سپنے دیئے جاتے ہیں کچھ خیالی تحفظات انکی جھولی میں ڈال دیئے جاتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی مثلاً انسداد فرقہ واریت کا بل کچھ بلا وجہ کی پابندیاں ان پر تھوپ دی جاتی ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی مثلاً خاندانی منصوبہ بندی کا شوشہ یا کچھ ایسے حقوق سے انہیں نواز دیا جاتا ہے جو ان کے پاس پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں اس کی تازہ مثال حکومت ہند کا نیا احسان لازمی بنیادی تعلیم کا حق ہے جس کا چرچا بہت زور وشور کے ساتھ ذرائع ابلاغ میں کیا جا رہا ہے لیکن یہ سب مفت میں نہیں ہوتا سیاسی ٹھیکیداران بے قیمت اشیاء کے بدلے عوام سے ان کا ووٹ مانگتے ہیں اور جب وہ اپنی اس جعل سازی میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو خوب جی بھر کے نوٹ چھاپتے ہیں اس حقیقی دولت اور عیش وعشرت پر کوئی زبان نہیں کھولتا جو لوگ اس کی جرأت کرتے ہیں انہیں یہ اژدہا اپنے بل سے باہر آکر نگل جاتا ہے اس طرح اپنے سیاسی ظلمت کدے میں حکمران سرکاری خزانے کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتے رہتے ہیں اور سوئس بنک کے اپنے ذاتی خزانے بھرتے رہتے ہیں اسی طرز عمل نے ہندوستانی سیاستدانوں کو کالے دھن والوں کی فہرست میں اول نمبر پر پہونچا دیا ہے۔

بنیادی تعلیم کے حق کی دستوری ترمیم گذشتہ سال اگست کے اندر عمل میں آئی لیکن اسکے نفاذ میں آٹھ ماہ کی تاخیر کی گئی حالانکہ ممبران پارلیمان کے مہنگائی بھتہ میں ہونے والا اضافہ اس طرح کے التوا کا شکار نہیں ہوتا اور اب اس پر خوشی کے ایسے تازیانے بجائے جارہے ہیں گویا ساری قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قانون تو اس شرمناک تلخ حقیقت کا اعتراف ہے کہ نام نہاد آزادی کے ۶۴ سال بعد بھی بچوں کی ایک تہائی تعداد اسکول نہیں جا پاتی اور ایسا اس لئے نہیں ہے کہ وہ بچے کے حق سے محروم ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ماں باپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں اور ہر بچہ پڑھنا بھی چاہتا تو پھر آخر یہ کروڑوں بچے اسکول کیوں نہیں جاتے؟ اس سوال کا جواب ہے مجبوریاں؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بل سے کوئی چراغ کا جن نمودار ہوگا اور وہ پلک جھپکتے ا ب ساری مجبوریوں کو نگل جائیگا؟ اگر کوئی اس طرح کی خام خیالی میں گرفتار ہے تو وہ احمقوں کی جنت

میں رہتا ہے۔

جمہوریت میں چونکہ ایوان حکومت حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں تقسیم ہوتا ہے اور حزب اختلاف کا فرض منصبی مخالفت کرنا ہوتا ہے اس لئے بحث ومباحثہ کو مخالفت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے کئی بار ارباب اقتدار اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرتے ہیں مثلاً جب کبھی عوامی فلاح و بہبود کا کوئی ناٹک رچایا جاتا ہے حزب اختلاف مشکل میں پھنس جاتا ہے ایسے موقع پر حمایت اور مخالفت دونوں ہی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اس لئے اپوزیشن والے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اقتدار والے مجبوریوں پر بحث کرنے سے اس لئے کتراتے ہیں کہ ان مجبوریوں کے لئے وہ ذمہ دار ہوتے ہیں ویسے کبھی کبھار انہیں عوام کی مجبوریوں کا شعور تک نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی ہے تو اسے دور کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اس لئے نہ ہی خاطر خواہ بحث ہوتی اور نہ ہی ان قوانین سے حقیقی فائدہ حاصل ہو پاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے ان رکاوٹوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے جن کے باعث ماں باپ اپنے بچوں کو خواہش کے باوجود اسکول روانہ نہیں کر پاتے مثلاً:

- غربت، بیروزگاری اور مہنگائی
- تعلیم کی خاطر ناکافی سرکاری بجٹ
- علم کے بجٹ کی غلط ترجیحات
- بدعنوانی کی لوٹ مار
- ناقص نصاب غیر معیاری وسائل
- سرکاری مدارس کا معیار تعلیم
- تعلیم کی تجارت کا فروغ
- مقصدیت واخلاقی اقدار کا فقدان

**غربت، بیروزگاری اور مہنگائی**: وزیراعظم من موہن سنگھ نے پارلیمان کے اندر اس بل کے نفاذ کا اعلان کرتے ہوئے ایک نہایت جذباتی تقریر کی اور اس میں اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے ان مشکل حالات کو بیان فرمایا جن میں انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم سے آراستہ کیا تھا اور اعتراف کیا کہ آج وہ جو کچھ بھی ہیں اسی تعلیم کی بدولت ہیں ویسے یہ آدھا سچ ہے اس لئے کہ بہت سے دوسرے بچوں نے بھی انہیں حالات میں اسی طرح کی جدوجہد کر کے تعلیم حاصل کی لیکن وہ بیچارے ملک کے وزیر تو کجا سفیر بھی نہ بن سکے اس لئے کہ انہیں عالمی بنک کے گورنر بننے کا موقع نہ مل

سکا جسکی بدولت من موہن پہلے وزیر خزانہ اور پھر وزیر اعظم کے عہدے تک پہونچ گئے۔ ویسے یہ من موہن کے نصیب ہیں کہ ان کے زمانے میں ہندوستان نے امریکی سامراجیت کے آگے سپر ڈال دی امریکہ بہادر کو ان کے اندر اپنے مفادات کے تحفظ کا بہترین محافظ نظر آ گیا اور گاندھی خاندان کی وراثت ایک غیر ملکی خاتون سونیا کے پاس چلی گئی نیز ان کا بیٹا راہل جو کانگریس پارٹی کی نگاہ میں دہلی کے تخت کا اصلی حقدار ہے ابھی سن بلوغ کو نہیں پہونچا ایسی بہت ساری وجوہات ہیں جن کے باعث من موہن سنگھ جو کچھ آج ہیں سو ہیں خیر ان سب سے قطع نظر من موہن کے بچپن میں دو اہم اسباق ہیں اول تو یہ انگریزی سامراج کے اس دور غلامی میں بھی ہندوستان کے عام شہریوں کو تعلیم کا حق حاصل تھا دوسرے یہ کہ جن شدید حالات کا انہوں نے ذکر کیا وہ آزادی کے بعد نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اب بھی جوں کے توں ہیں بلکہ بہت سوں کے لئے شدید تر ہو گئے ہیں اس افسوس ناک صورتحال کی ذمہ داری ویسے تو ساری سیاسی جماعتوں پر مشترک ہے لیکن بڑا حصہ کانگریس کے سر آتا ہے اس لئے اسے سب سے زیادہ عرصہ ملک پر حکومت کرنے کا شرف حاصل ہوا یہ ایک حقیقت ہے کہ کانگریس نے اپنے دور اقتدار میں حالات کو بہتر بنانے کے بجائے ان کا استحصال کر کے اپنے انتخابی مفاد کو حاصل کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کیا۔ کبھی غریبی ہٹاؤ کے نام پر عوام کو رجھایا تو کبھی عام آدمی کے نام پر خاص لوگوں کے مفادات کی حفاظت کی۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ گلوبلائزیشن کے فتنے کے بعد ملک میں بیروزگاری بڑھی ہے کانگریس کی حکومتوں کے دوران مہنگائی میں بے دریغ اضافہ ہوا ہے۔ کسان کا بیٹا من موہن جب وزیر اعظم بنا تو کسانوں کی خودکشی کے واقعات عام ہو گئے۔ عوام کی غربت و افلاس انہیں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے سے روکتی ہیں۔ گذشتہ اگست میں جب سے یہ بل پاس ہوا سوقت سے ضروری اشیا کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اگر وزیر اعظم اس کو قابو میں کرتے تو شاید اس قانون کے نفاذ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی لیکن اگر ان خوبصورت نعروں کے پس پردہ مہنگائی کا عفریت پھلتا پھولتا رہے گا تو اس جیسے قوانین پاس ہوتے رہیں گے لیکن جہالت کا اندھیرا کبھی بھی دور نہ ہوگا مفلسی کی آندھیاں تعلیم کے چراغ کو پنپنے نہیں دیں گی اس کے لئے کم از کم خوشحالی کا ایندھن ضروری ہے اس لئے کہ خالی پیٹ حروف تہجی سے نہیں دو وقت کی روٹی سے بھرتا ہے اور فاقہ کش کے دماغ کا روشن دان تعلیم کی کنجی سے نہیں کھلتا۔

**تعلیم کی خاطر ناکافی بجٹ:** تعلیم کے فروغ میں محض عوام کی مفلسی نہیں بلکہ حکومت کی بخیلی بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارے بجٹ میں تعلیم کی مد میں خرچ ہونے والی رقم کا

تناسب افریقہ کے کئی پسماندہ ممالک سے بھی کم ہے یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں خواندگی کی شرح ہندوستان سے بہتر ہے ہمارے یہاں باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن ان پر عملدرآمد کم ہی ہوتا ہے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بہت سارے پسماندہ سمجھے جانے والے مسلم ممالک مثلاً اردن اور لبنان تک میں خواندگی کی شرح ہندوستان سے کہیں زیادہ بہتر ہے حالانکہ وہ بھی ہماری طرح تیل کی دولت سے مالامال نہیں ہیں۔ خود ہندوستان کے اندر بھی کیرالہ جیسی ننھی سی ریاست نے کئی سال قبل صد فی صد خواندگی کے ہدف کو حاصل کرلیا اس کے لئے ان لوگوں نے دکھاوے قوانین بنانے کے بجائے ٹھوس اقدامات کئے حالانکہ قدرتی وسائل کے لحاظ سے کیرالہ بہت زیادہ خوشحال نہیں ہے لیکن وہاں کی اکثریت متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، بہت امیر اور نہایت غریب لوگ اس ریاست میں نہیں پائے جاتے نیز ریاستی حکومتوں نے تعلیم کی جانب خاص توجہ دی ہے۔ تمل ناڈو کی ریاستی حکومتوں نے تعلیم کے فروغ کی خاطر اسکولوں میں دوپہر کے مفت کھانے کا اہتمام کیا اور اس کے باعث وہاں خواندگی کی شرح میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ جب تک کہ حکومت اس طرح کے منصوبوں پر رقم خرچ نہیں کرتی اسوقت تک محض اعلانات سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ من موہن حکومت مفت تعلیم کی بات ایسے کررہی ہے جیسے یہ کوئی نیا وردان ہو حالانکہ ہماری نسل کی اکثریت نے سرکاری اسکولوں میں مفت تعلیم حاصل کی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ وہی پرانی شراب ہے جسے ایک نئی بوتل میں بھر کے پھر سے پروسنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

**تعلیم کے بجٹ کی غلط ترجیحات:** تعلیم کے بجٹ کو غیر موثر بنانے والی ایک شئے غیر معقول ترجیحات ہیں۔ بنیادی تعلیم کے مقابلے اعلیٰ تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم کا تناسب بھی مناسب حال نہیں ہوتا۔ اعلیٰ تعلیم کے چند ادارے بجٹ کا بڑا حصہ نگل لیتے ہیں جن سے مٹھی بھر خوشحال طبقے کا فائدہ ہوتا ہے لیکن غریب عوام کی اکثریت اس سے محروم رہتی ہے عام اسکولوں کی عمارتوں کو مرمت نصیب نہیں ہوتی، وہاں پر تختہ سیاہ تک موجود نہیں ہوتا اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں لایعنی موضوعات پر تحقیق ہوتی رہتی ہے مہنگے سے مہنگے آلات کو درآمد کرکے نصب کیا جاتا ہے تاکہ بیرونی ممالک سے آنے والے آقاؤں کو خوش کرکے ان سے مزید مدد حاصل کی جاسکے نیز دیگر مہمانوں کو مرعوب کرکے اپنی ترقی کا لوہا منوایا جاسکے۔ چونکہ قوم کے اصحاب حل وعقد کے طبقہ کا مفاد اس بیجا ترجیح سے وابستہ ہوگیا ہے اس لئے وہ جانتے بوجھتے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

مجھے یاد ہے دہلی میں جامعہ ملیہ سے چند فرلانگ پر واقع ایک شامیانے میں لگے سرکاری اسکول کو دیکھ کر میں نے اپنے دوست سے پوچھا تھا کہ کیا یہاں پڑھنے والا کوئی طالبعلم کبھی جامعہ میں داخل ہو سکے گا؟ اس کا جواب تھا جامعہ میں داخل ہونا تو دور کیا ان میں سے کوئی ہائی اسکول تک بھی پہونچے گا اسمیں مجھے شک ہے؟ یہ صورتحال راجدھانی دہلی کی ہے تو اس ملک کے دیہاتوں میں پائے جانے والے اسکولوں کی حالت کا اندازہ مشکل نہیں ہے۔

**بدعنوانی کی لوٹ مار:** بدعنوانی ہمارا قومی شعار بن گیا ہے۔ سرکاری بلکہ نجی اداروں میں اکثر کاموں کے لئے رشوت کا سہارہ لینا پڑتا ہے بوفورس معاملے میں دلالی سے اپنے ہاتھ کالے کرنے سے قبل راجیو گاندھی نے اس بات کا اعتراف کیا تھا ہمارے بجٹ کا پندرہ فی صد اپنا حق ادا کرتا ہے بقیہ درمیان میں غائب ہو جاتا ہے گذشتہ بیس سالوں میں بدعنوانی کے اضافہ کا تصور کریں اور اندازہ لگائیں کہ جو رقم بنیادی تعلیم کی فراہمی کے لئے حکومت مختص کر رہی ہے اس کا کتنا فیصد اس پر خرچ ہوگا اور اسکے کیا نتائج نکلیں گے؟ بدعنوانی کے مرض نے سرکاری مشنری کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اس لئے اس شاخ نازک پر نہ کوئی آشیانہ تعمیر ہو پاتا اور نہ اسے پائیداری نصیب ہوتی ہے۔

**ناقص نصاب غیر معیاری وسائل:** لارڈ میکاولی نے ہندوستانی غلاموں سے اپنے سامراج کی خدمت کروانے کے لئے جو نصاب تیار کیا تھا اس کی خطوط کار سے قوم کے دانشور اور ماہرین تعلیم ابھی تک آزادی حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں ان کو لگتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو سب کچھ ختم ہو جائیگا آزادی فکر وعمل کا فقدان ہے کسی متبادل پر غور کرنے کا حوصلہ نہیں پایا جاتا اپنی ضرورتوں کا جائزہ لیکر مناسب حال تبدیلیوں سے خوف محسوس ہوتا ہے اس لئے نصاب کے اندر ضروری تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں۔ آئین نو سے ڈرنے اور طرز کہن پہ اڑنے کی روش ہمارے پیروں کی زنجیر بن گئی ہے .ایک مسئلہ معیاری وسائل تعلیم کا بھی ہے سرکاری اسکولوں کے طلبا کو آگے چل کر نجی مدارس کے جن طلبا سے مسابقت کرنی ہوتی ہے وہ جدید ترین وسائل کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں ایسے میں سرکاری اسکولوں کے طلبا کے اندر احساس کمتری اور مایوسی کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے اگر کسی خاندان کا ایک بچہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مسابقت میں پیچھے رہ جاتا ہے تو اس کا منفی اثر سارے خاندان پر پڑتا انہیں یہ سب تضیع اوقات محسوس ہونے لگتا ہے۔ مختلف اداروں کے درمیان تعلیم کے معیار کا فرق پہلے بھی تھا لیکن اب یہ کھائی کافی وسیع ہوگئی اور فوری توجہ کی طلبگار ہے۔

**سرکاری مدارس کا معیار تعلیم:** تعلیم کا سب سے اہم وسیلہ اساتذہ ہوتے ہیں لیکن سرکاری اساتذہ کے اندر (الا ماشاءاللہ چند ایک استثنائی لوگوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو) جذبہ عمل کا فقدان پایا جاتا ہے جس کے لئے کلی طور پر انہیں قصوروار ٹھہرایا نہیں جاسکتا عمومی ماحول سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے خاص لوازمات کی ضرورت ہوتی جو ہر استاد کو مہیا نہیں ہوتے اس لئے جو بھی اس نمک کی کان میں داخل ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ نمک بن جاتا ہے۔ احساس جوابدہی کا دفتری تصور سرکاری دفتر میں جہاں ملازمت کو ایک خاص تحفظ حاصل ہو کارآمد ثابت نہیں ہو پاتا۔ کارکردگی کو جانچنے کے موثر وسائل اور اس پر اقدامات کے مواقع اکثر و بیشتر مہیا نہیں ہوتے ایسے میں جن کے دلوں میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا عقیدہ جاگزیں ہے وہ تو اپنی ذمہ داری ادا کر پاتے ہیں لیکن باقی لوگوں کے لئے یہ خاصہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سرکاری اسکولوں میں تعلیم کا معیار اچھا نہیں ہوتا اور طلبا کے ساتھ ساتھ والدین کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

**تعلیم کی تجارت کا فروغ:** کسی زمانے میں دو طرح تعلیمی ادارے ہوا کرتے تھے ایک سرکاری اور دوسرے نجی۔ نجی تعلیمی ادارے بھی نیم سرکاری ہی ہوتے تھے ان میں نصاب تعلیم اور اساتذہ کی تنخواہ تک حکومت سے آتی۔ صرف عمارت اور انتظامی امور کسی فلاحی ادارے کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ان اداروں کو مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ چلاتے تھے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر اعزازی طور پر اپنی خدمات کو پیش کرتے تھے ان کا اپنا ذریعہ معاش ہوتا تھا تعلیمی ادارے سے معاشی فائدہ اٹھانے کو معیوب سمجھا جاتا تھا اس نظام کے بھی بہت سارے مسائل تھے لیکن کم از کم ایک بات ضرور تھی کہ وہاں خدمت کا پہلو کسی نہ کسی طور کارفرما ہوتا تھا غریب امیر کی تفریق نہیں تھی بلکہ میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ غریب طلبا خصوصی توجہ اور احترام کے حقدار ہوتے تھے لیکن جب سے تعلیم کی دوکانیں کھل گئیں طلبا اور اساتذہ نیز تعلیم گاہ کا تعلق خالص مادی ہو کر رہ گیا طالبعلم ایک گاہک میں تبدیل ہو گیا اساتذہ پیشہ ور ماہرین تعلیم یا علم کے سوداگر اور تعلیم گاہ ایک سپر مارکیٹ بن گئی جہاں سے استفادہ کے لئے اولین شرط جیب میں پایا جانے والا فلوس بن گیا مفلس کے لئے اس کے دروازے بڑے پیار سے بند کر دیئے گئے۔ یہ وبا کچھ اس تیزی کیساتھ پھیلی کہ اسکے منفی اثرات کو وہ لوگ بھی محسوس نہ کر سکے جن کو اس خلاف علم بغاوت بلند کرنا تھا۔ اس رجحان کے چلتے کل تک من موہن سنگھ جیسے عام آدمی کے بچوں کے لئے جو ترقی کے دروازے کھلے تھے وہ بند ہو گئے اب اگر اس نے من موہن کی مہربانی سے بنیادی تعلیم حاصل کر بھی لے تو آگے کچھ زیادہ نہیں کر سکتا اور اگر کچھ خاص نہیں کر سکتا تو

بنیادی تعلیم حاصل کرنے پر اپنے نو سال ضائع کرنے کے بجائے کسی ایسے فن میں مہارت کیوں نہ حاصل کرے جو ساری عمر اسکے کام آنے والی ہے اس قسم کی سوچ پروان چڑھ سکتی ہے۔

**مقصدیت و اخلاقی اقدار کا فقدان:** مادہ پرستی کا نظریہ اور اس پر سرمایہ دارانہ نظام نے ملکر فی الحال دنیا کے بڑے حصہ پر 'کریلا اور نیم چڑھا' کی صورتحال پیدا کر دی ہے انسانی زندگی اعلیٰ مقاصد سے بے بہرہ ہوگئی اور اس کا سب سے اولین شکار اخلاقی اقدار ہوئے ہیں معیار زندگی کو بہتر بنانے کی دوڑ میں انسان تمام اخلاقی حدود و قیود سے آزاد ہو چکا ہے بدقسمتی سے جن تعلیمی اداروں کو اس معاملے میں ایک دیوار بن کر کھڑا ہو جانا چاہئے تھا وہ اس کی خاطر دروازہ بن گئے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو مادہ پرست جانور بنانے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ یہ بات عام تعلیمی اداروں کی ہے جو لوگ ہنوز اس بیماری سے محفوظ ہیں وہ یقیناً قابل قدر ہیں۔

اس نئے رجحان کے چلتے عام لوگوں کے نزدیک تعلیم یافتہ افراد کا احترام مجروح ہوا ہے اس لئے کہ عام آدمی کسی پڑھے لکھے شخص سے کسی خیر کی توقع نہیں کرتا۔ وہ اپنے استحصال کرنے والوں کے شانہ بشانہ تعلیم یافتہ ماہرین کو کھڑا پاتا ہے سیاستدانوں کی منصوبہ بندی کرنے والے آئی اے ایس آفیسرس ہوں یا سرمایہ داروں کی جھولی بھرنے والے ماہرین معاشیات سب کے سب اعلیٰ تعلیم گاہوں سے نکل کر آنے والے فارغین ہوتے ہیں اس مفاد پرست طبقہ کے خلاف ساری دنیا میں ایک ردعمل پیدا ہو رہا ہے۔ امریکہ جیسے مادہ پرست سرمایہ دار ملک میں ماہر یا پیشہ ورصلاح کار ایک گالی بنتا جا رہا ہے لوگ ان کی جانب پہلے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اب نفرت سے دیکھنے لگے ہیں ایک عام رجحان یہ ہے کہ گذشتہ بیس سالوں میں یعنی بش سینئر کے بعد سے ان ماہرین نے مل کر ملک کا بھٹا بٹھا دیا پہلے خارجہ پالیسی کا ستیاناس کر کے بلاوجہ کی جنگوں میں قوم کو جھونک دیا اور پھر اندرون ملک کساد بازاری پھیلا کر معاشی بحران کا شکار کر دیا ان آفات انسانی سے عام آدمی کا جینا دشوار ہو گیا لیکن ان کا بال بیکا نہیں ہوا۔ تعلیم کے آب حیات میں مادہ پرستی کا زہر نہ صرف مغرب بلکہ مشرق میں بھی شامل ہو گیا اور جب تک کہ اس زہر کا تریاق نہ ملے محض پارلیمان میں ایک بل پاس کر کے اپنی پیٹھ تھپتھپانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔

ویسے ملک کے عوام فی الحال خوش ہیں کہ تعلیم کی بابت حکومت وقت استاد شاعر قمر جلالوی کی مصداق 'وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا' کے مرحلے سے تو گذر گئی لیکن ارباب حکومت پریشان ہیں کہ تعلیم کا حق بھی دے دیا (تعلیم ملے نہ ملے) مگر انتخاب کو کافی وقت باقی ہے عوام ہماری دیگر

کوتاہیوں کی طرح اس احسان عظیم کو بھی فراموش کردیں گے اس لئے انہیں آگے چل کر مزید کون سا حق فراہم کیا جائے؟ تا کہ ووٹوں کا بازار گرم ہو اس مسئلہ کا ایک حل ہم تجویز کئے دیتے ہیں 'ذرائع ابلاغ سے لازمی استفادہ کا حق' اس معاملے میں کچھ مشکلات ضرور ہیں لیکن ان کا آسان حل بھی موجود ہے اور جو فائدے ہیں ان کا کیا کہنا!

ذرائع ابلاغ کا لازمی بل جب بن جائیگا تو لوگ طرح طرح کے اعتراضات کریں گے مثلاً روزی روٹی کمانے کی فرصت نہیں ہے یا ہمارے پاس وقت نہیں؟ تو اس کے جواب میں کام کے مقامات مثلاً دفاتر اور دوکانوں پر ٹی وی کا لگانا لازمی قرار دیا جائیگا اور اس کے لئے کم سود پر قرض مہیا کیا جائیگا۔ جو گھر پر ٹی وی خریدنے کی سکت نہیں رکھتا اس کو سرکاری دفاتر سے نکالے ہوئے پرانے ٹی وی سیٹ مفت فراہم کئے جائیں گے جو اپنی بینائی کی شکایت کرے گا اسے انشورنس کمپنی کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیا جائیگا اور اگر وہ پریمیم ادا کرنے سے قاصر ہو تو اسے سننے پر اکتفا کرنے کی تلقین کی جائیگی جو یہ کہے گا کہ ذرائع ابلاغ پر پھیلائے جانے والے جھوٹ پر وہ اعتبار نہیں کرتا تو اس کا علاج کروانے کے لئے ماہرین نفسیات کے پاس پاگل خانے میں بھیج دیا جائیگا تا کہ پاگل ہو کر واپس آئے اور اس کا اعتماد بحال ہو جائے جو اس بل کے خلاف احتجاج کرے گا اسے بین الاقوامی دہشت گرد قرار دیکر گوئنٹے نامو بھیج دیا جائے اس طرح حزب اختلاف سے نجات حاصل ہو جائیگی اور اس حق کے یقینی بنائے جانے پر انتخاب میں کامیابی یقینی ہو جائیگی گویا کہ تعلیم کے بل کو یہ ذرائع ابلاغ کا حق مات دے دے گا۔

# بچوں کو بچوں کی نظر سے دیکھو

ایک بچے کی تعلیم وتربیت میں جس قدر بڑا حصہ حکومت اور دوستور ساز اداروں کا ہوتا ہے، نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا ہوتا ہے، اساتذہ، نصاب اور کتابوں کا ہوتا ہے اسی قدر بلکہ اس سے کچھ زیادہ اہم کردار والدین کا ہوتا ہے۔ اسی لئے شاید تعلیمی میدان سے وابستہ ایک دوست نے گذشتہ مضمون سے ناراض ہو کر مجھے برا بھلا سناتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہی، وہ بولے سرکاری بل کے بارے میں تو تم نے بہت کچھ لکھ مارا لیکن اس بل کا کیا جس میں بچہ رہتا ہے؟ بل میں بچہ رہتا ہے؟ میں نے حیرت سے سوال کیا تو وہ بولے میری مراد گھر ہے اور والدین کا کیا؟ تم نے انکا کوئی ذکر نہیں کیا اس لئے کہ تمہارا اپنا تعلق اسی طبقے سے ہے گویا تعلیم کی تجارت بتلاتے ہوئے بھی تم خود سیاست کر گئے۔ فون پر تو نہایت معصومیت کے ساتھ میں ان کے تمام الزامات کی تردید کرتا رہا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ ان کی بات صحیح ہے یہ کوتاہی یقیناً مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ اس لئے یہ مضمون اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اس مضمون میں بل کے بجائے دل کی بات ہوگی انشاللہ۔

انسان کا تمدنی سفر ارتقار ہنمائی اور آزادی کے دو پہیوں پر آگے بڑھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنی تمام مخلوقات کو ہدایت سے نوازہ اور ان سب کو اس رہنمائی کا پابند کر دیا۔ چاند ستارے، چرند پرند بلکہ فرشتوں تک کو اس بات کی اجازت نہیں کی وہ ان ہدایات سے سر مو انحراف کر سکیں وہ سب کی اپنی تمام قوت وعظمت کے باوجود آزادی کی بیش بہا نعمت سے یکسر محروم ہیں اس لئے کہ اس نعمت کے عوض عائد ہونے والی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی ہمت وسکت وہ اپنے اندر نہیں جٹا سکے قرآن مجید میں پہاڑوں کے حوالے سے یہ بات تمثیل کے طور پر کہی گئی ہے اس لئے انکی تعمیل

واطاعت قابل صد احترام ضرور ہے لیکن چونکہ وہ اس پر مجبور ہیں اس لئے اس کی تعریف وتوصیف بیان نہیں کی جاتی ساتھ ہی اس فرمانبرداری کے باوجود ان کے اندر کوئی تمدنی ارتقا عمل میں نہیں آتا ہے۔ ہزار ہا سال سے شمس وقمر اسی محور میں گردش کر رہے ہیں جن میں انہیں محصور کر دیا گیا ہے، شیر اور ہرن اسی طرز پر زندگی گذار رہے ہیں جن پر صدیوں پہلے زندگی گذارا کرتے تھے ان کا رہن سہن ایک خاص نہج پر منجمد کر دیا گیا ہے وہ اس سے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کے بارے میں سوچنے تک کے سزاوار نہیں۔ آپ سوچ رہے ہونگے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا اس فلسفہ سے کیا تعلق؟ دراصل آگے جو بات میں کہنے جا رہا ہوں اسکو سمجھنے کے لئے شخصیت کے ارتقا کے ساتھ رہنمائی اور آزادی کے تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔

ہدایت ورہنمائی: کائنات کی ساری مخلوقات کو انکے خالق ومالک نے جبلی ہدایت سے معمور فرمایا اسکے باوجود بکروں کے ریوڑ میں کوئی شریف یا بدمعاش بکرہ نہیں پایا جاتا انکا تقویٰ اور پرہیزگاری انہیں بلند تر روحانی مدارج پر فائز نہیں کرتی انکی ہدایت کے لئے کتابیں نازل نہیں کی جاتیں اور پیغامبر مبعوث نہیں کئے جاتے ان کے لئے حساب کتاب حشر ونشر اور جنت ودوزخ نہیں سجائی جاتی لیکن حضرت انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ تو جنت سے آنے اور جانے کے درمیان عرصہ حیات میں اپنے خالقِ حقیقی سے یہ کہنے کی جرات رندانہ تک کر جاتا ہے کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

علامہ اقبال کے اس شعر میں کار جہاں سے مراد انسانی ارتقا کی بلند تر مراحل ہیں جن کو سر کرنے کی غرض سے رب کائنات نے انسان کو دنیا میں بھیجا ہے تعلیم وتربیت کا اصلی ہدف اسی ارتقا کے عمل میں اعانت وتعاون ہونا چاہئے۔

آزادی وحریت: فرد کی آزمائش کے لئے فکر وعمل کی محدود سہی لیکن آزادی اولین شرط ہے اجتماعی سطح پر انسانی معاشرہ ان قوموں کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ اس ارتقائی عمل میں دوسروں سے مسابقت کر کے آگے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مسابقت میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ایک فطری خواہش ہے جو زمان ومکان کی محدودیت سے ماورا ہے ہر دور اور ہر خطہ ارضی کے انسانوں نے جمود کو زندگی کی نہیں بلکہ موت کی علامت گردانا ہے ارتقا سے محرومیت کو انسانی ضمیر اپنی تمدنی ہلاکت قرار دیتا ہے اور انسان اپنی تہذیبی ہلاکت پر طبعی موت کو قابل

ترجیح سمجھتا ہے وہ آزادی وحریت کی بقا کے لئے اپنی جان نچھاور کرنے کو سعادت جانتا ہے اس لئے کہ جب کسی قوم کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے تو اس کا انفرادی اور اجتماعی ارتقا رک جاتا ہے اور وہ بستی ایک چلتی پھرتی لاش کے قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ رب کائنات کی حکمت یہ ہے کہ جس مخلوق سے ارتقا مطلوب تھا اسے ہدایت سے سرفراز کرنے کے بعد آزادی کے جوہر سے بھی ہم کنار کیا تا کہ وہ اخلاقی اور مادی ترقی سے بہرہ ور ہو سکے۔

والدین کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنی اولاد سے بڑی حد تک لاپرواہ ہوتے ہیں وہ انہیں خس وخاشاک کی طرح پوری طرح آزاد چھوڑ دیتے ہیں ان کی رہنمائی کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے یا اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہیں پاتے ان والدین کے بچے رہنمائی کے نہ ہونے کے باعث بہت ساری ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن پھر بھی گرتے سنبھلتے چل پڑتے ہیں کبھی کبھار سنبھل نہیں پاتے تو تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے بھٹک جانے کا بھی اندیشہ باقی رہتا ہے اسکے برعکس دوسری قسم ایسے والدین کی ہوتی ہے جو اپنے بچوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فکر مند ہوتے ہیں وہ انکی فکری وعملی رہنمائی کی ذمہ داری تو کما حقہ ادا کر دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ بچے کی آزادیٔ فکر وعمل کو پوری طرح کچل کر رکھ دیتے ہیں بظاہر دوسری قسم کے والدین کو معاشرے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے انہیں اپنی اولاد کا بڑا خیر خواہ سمجھا جاتا ہے لیکن نادانستہ طور پر ان سے ہونے والی غلطی بچہ کے اندر جدت وندرت کا خاتمہ کر دیتی ہے اکثر اسطرح کے بچوں میں خود اعتمادی کی بھی کمی پائی جاتی ہے ان کے اندر عزم وحوصلہ اور قوت فیصلہ کا فقدان ہوتا ہے اس لئے کہ والدین ان کے سارے فیصلے خود کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ نوجوانی کی دہلیز میں داخل ہو جاتے ہیں یہ دونوں طرح کی انتہا پسندی بچے کی شخصیت کے ارتقا کے لئے مضر ہے ان دونوں کے درمیان ایک الٰہی اسلوب جس میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ آزادی ہے نگرانی کے باوجود دھونس اور زبردستی نہیں ہے جو والدین اس حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہوتے ہیں ان کے بچے بہترین شخصیت کے حامل ہوتے ہیں ان کے اندر صلاحیت اور صالحیت یہ دونوں عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، صلاحیت اس آزادی کے باعث پروان چڑھتی ہے جو اسے اپنے ماں باپ سے ملتی ہے اور صالحیت کا تعلق اس رہنمائی اور نگرانی سے ہوتا ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بچپن کی کلی کھلتی ہے مندرجہ بالا گفتگو کا تعلق والدین کے طرز فکر سے تھا اب آیئے کچھ عملی مسائل پر بھی غور کیا جائے۔

بچوں اور بڑوں کی نفسیات میں ایک بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت کم سوچتے ہیں بس

ضرورت بھر سوچتے اور جو ٹھیک لگتا ہے کر گذرتے ہیں اس کے علاوہ بچوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ لوگ کیا سوچیں گے اوروں کی پسند اور ناپسند سے ان کے فیصلے متاثر نہیں ہوتے اس لئے وہ بروقت فیصلے کرتے ہیں بچے اپنی خوشی اور ناراضگی کا اظہار فوراً اور بلا تکلف کر دیتے ہیں وہ اداکاری یا مکاری نہیں کرتے منافقت کے مرض سے محفوظ ہوتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی ان کے اندر یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ بہت جلدی بھول جاتے ہیں اس لئے کسی غیر معمولی کیفیت (abnormal phase) میں زیادہ عرصہ نہیں رہتے بہت جلد نارمل ہو جاتے ہیں۔

والدین کا معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے وہ بہت زیادہ سوچتے ہیں اور اکثر غیر ضروری اندیشوں کا شکار ہو جاتے ہیں یہ تذبذب کی کیفیت انہیں کسی نتیجے پر پہونچنے نہیں دیتی۔ والدین کو اس بات کی فکر بھی لاحق رہتی ہے کہ اگرچہ بات صحیح ہے لیکن لوگ کیا کہیں گے؟ والدین گوں ناگوں وجوہات کی بنا پر اپنے جذبات واحساسات کے اظہار سے گریز فرماتے ہیں اور تلخیوں کو آسانی سے بھلا نہیں پاتے اس بنیادی فرق کے باوجود والدین بچوں سے یہ بیجا توقع کرتے ہیں کہ وہ انکی طرح سوچیں۔ ہم بچوں سے تو انکی فطرت کے خلاف توقع کرتے ہیں لیکن خود اپنے مزاج کے خلاف بچہ بن کر نہیں سوچتے۔ بڑے اگر چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن نہیں کرتے اور بچہ اگر چاہے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا اس کے باوجود ہماری یہ شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اس لئے بچوں کی اس ہیئت کو سمجھنے کے لئے بڑوں کو بچہ بن کر سوچنا پڑے گا تب جا کر بات بنے گی۔

بچہ اپنی ضرورتوں کو اصرار کے ساتھ طلب کرتا ہے لیکن وہ اپنے مسائل کی فہرست بنا کر اپنے والدین کے سامنے پیش نہیں کر سکتا اس لئے کہ ایسا کرنے کے لئے جس غور وفکر کی ضرورت ہے وہ اس کے بس کے باہر کی بات ہے والدین کو اس بات کا احساس ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ بچہ کی طرح نہیں سوچتے اس لئے اس کے حقیقی مسائل تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے اور اس لئے مرض کی تشخیص میں غلطی کر جاتے ہیں نتیجتاً والدین کی ان مخلصانہ کوششوں کے باوجود بچوں کے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ ان میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے دانا حکیم اپنے مریض کی تکلیف سمجھنے کی خاطر پہلے اس کی سطح پر جاتا اور پھر واپس آ کر علاج تجویز کرتا ہے اس معاملے میں اگر وہ نسخہ لکھنے میں جلد بازی کرے تو مریض کو علاج کے بجائے غالب کی غزل "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

بچوں کی ضرورتیں نہ تو پوری طرح مشترک ہوتی ہیں اور نہ بالکل مختلف اس لئے والدین کے

لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر بچہ کی ضرورت کا انفرادی سطح پر اندازہ کریں یہ کام قومی سطح پر مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن خاندان کے اندر نہایت سہل اور آسان ہے خاندانی منصوبہ بندی کے عذاب نے اسے آسان تر بنا دیا ہے ضرورتوں ہی کی طرح ہر بچے کی ذہنی و جسمانی نشو ونما میں پائی جانے والی رکاوٹیں بھی مختلف ہوتی ہیں ان کا بھی درست اندازہ لگانا نہایت ضروری ہے۔ ضرورتوں کو سہولتوں سے پورا کیا جاسکتا ہے جیسی ضرورت ہو ویسی سہولت ہو مثلاً اگر کوئی مادی ضرورت ہے تو اسے مسلکری تربیت پورا نہیں کر سکتی اسی طرح علمی وفکری ضرورتوں کی بھرپائی مادی وسائل سے ممکن نہیں ہے ۔ بچوں کے ارتقا میں پائی جانے والی رکاوٹوں کی نوعیت اکثر و بیشتر نفسیاتی ہوتی ہے اور یہ زیادہ لطیف اور نازک مراحل ہوتے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ضرورتوں اور رکاوٹوں کے معاملے میں ترجیحات کا تعین نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اس لئے یہ بات مناسب حال معلوم ہوتی ہے کہ والدین ہر دو فہرست کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیں اول تو وہ ضرورتیں جو بچے کی نشو ونما کے لئے ناگزیر ہوں اور ثانیاً وہ جن کے نہ ہونے سے کچھ مشکلات کے باوجود کام چل سکتا ہو ایسا کرنے سے وسائل کے استعمال کو موثر بنایا جاسکتا ہے ورنہ اکثر و بیشتر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ فروعی ضرورتوں پر ساری توانائی صرف ہو جاتی ہے اور ناگزیر ضرورتیں تشنہ کام رہ جاتی ہیں اس خرابی کا واحد علاج ترجیحات کا مناسب تعین ہے۔ رکاوٹوں کے حوالے سے بھی اس طرح کی تقسیم لازمی ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ والدین ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر اپنا سارا زور صرف کر دیتے ہیں جن کے باوجود بچہ تھوڑی بہت محنت و وقت کیساتھ آگے بڑھ سکتا ہے لیکن ان رکاوٹوں کی جانب سے صرف نظر ہو جاتا ہے جو ناگزیر ہوتی ہیں اور آگے چل کر بیروں کی زنجیر بن جاتی ہے ایسی صورتحال میں والدین کے ساتھ ساتھ خود بچے کی ساری محنتیں اور کاوشیں بے ثمر ہو جاتی ہیں ایسے میں ہر دو فریق پریشان ہوتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود متوقع نتائج کا ظہور کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ ان حالات میں اکثر غیر متعلق چیزوں کو مورد الزام ٹھہرا کر اپنے دل کی بھڑاس اتاری جاتی ہے حالانکہ یہ کوئی حل نہیں بلکہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے اور اسکے لئے صرف اور صرف والدین ذمہ دار ہیں۔

بچہ ایک نرم نازک کونپل کی مانند ہوتا ہے جس طرح ایک کسان یا باغ کا مالی پودے کی نشو ونما کے لئے مناسب کھاد پانی کا بندوبست کرتا ہے اسی طرح والدین کو اپنے بچوں کی ضرورتوں کو بہم پہونچانا چاہئے اسی کے ساتھ کسان اپنی فصل کی مضر کیڑوں مکوڑوں سے حفاظت کے لئے جراثیم کش

ادویات کا استعمال بھی کرتا ہے والدین کو بھی چاہئے کہ وہ بچے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ایسی ہی فکر کریں۔ایسا کرتے وقت باغبان ان اشیا کی مقدارِ ضرورت کا خاص پاس ولحاظ رکھتا ہے اس لئے کہ وہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ انکی کثرت وقلت دونوں ہی پودوں کے لئے یکساں طور پر مضر ہیں۔اگر اس معاملے میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو کسان کی ساری محنت ومشقت رائیگاں چلی جاتی ہے یہ قانونِ فطرت آفاقی نوعیت کا ہے۔

شوق اور خوف دو ایسے عوامل ہیں جو نفسیاتی سطح پر کسی بھی کام کو انجام دینے میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں تقویٰ دراصل اسی خوف اور شوق کا حسین ترین امتزاج ہے جس میں ایکطرف انسان کو اللہ کی ناراضگی کا ڈر ہوتا ہے اور دوسری جانب اللہ کی محبت اس کے اندر ذوق وشوق پیدا کرتی ہے۔دیگر دنیوی معاملات میں انسان کو نقصان کا خوف ہوتا ہے اور فائدے کا لالچ گویا ایک قوت پیچھے سے دھکا دیتی ہے تو دوسری آگے کی جانب کھینچتی ہے۔ان دونوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ خوف خارجی اشیا سے ہوتا ہے اور کشش داخلی جذبۂ عمل ہے۔لیکن یہ سارا ماجرا پختہ کار ذہنیت کا ہے بچے کے اندر عام طور پر ان دونوں کے اثرات بہت کم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ 'فریب سود و زیاں' سے محفوظ و مامون ہوتا ہے۔بچہ تو اس کام کو کرتا جس میں اسکو مزہ آتا ہے اور اس کام کو نہیں کرتا جو اسکے دل کو نہیں بھاتا۔اس پر فائدے کی لالچ اور نقصان کا اندیشہ اثر انداز نہیں ہو پاتا اس لئے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ بچوں کے سامنے اچھے کام مزیدار بنا کر پیش کئے جائیں اور ڈرا دھمکا کر ان سے کام لینے کی کوشش نہ کی جائے اس لئے کہ اگر کسی کام میں بچوں کو مزہ آنے لگے تو منع کرنے کے باوجود وہ اسے کر گذرتے ہیں اور جس کام میں ان کا دل نہ لگے لاکھ جتن کے باوجود وہ کام ان سے کرایا نہیں جا سکتا۔

بچے کی ایک بہت بڑی ضرورت اس کی مصروفیت ہے وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتا اس کو کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام چاہئے اب یہ بڑوں کا کام ہے کہ وہ اس کے سامنے ایسی مصروفیات رکھیں جن سے اس کا فکری وجسمانی ارتقا عمل میں آئے اکثر والدین ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے ان کو ایسے مشاغل میں مصروف کر دیتے ہیں جو ان کے نازک ذہن پر دیرپا منفی اثرات مرتب کرنے کا سبب بنتے ہیں یہ سب غیر شعوری طور پر ہوتا ہے مثلاً مختلف کمپیوٹر کھیل انہیں پکڑا دئے جاتے ہیں یا کارٹون فلموں میں انہیں الجھا دیا جاتا ہے۔بچہ ان کے اثرات کے حوالے سے کوئی تمیز وتفریق نہیں کر سکتا وہ بصد شوق ان میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن جو والدین ان اثرات کا ادراک کر سکتے ہیں وہ بھی ایسا

کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے یا تو انہیں اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی یا وہ اس کے لئے وقت نہیں نکال پاتے۔ مختلف تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بظاہر ان بے ضرر نظر آنے والے کھیلوں اور فلموں سے بچوں کے اندر تشدد کے رجحان میں اضافہ ہوتا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ جن دینی درسگاہوں کو مغرب کے مفکرین اور دانشور تشدد کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ان کے طلبا اس بیماری سے محفوظ ہیں یہ پر تشدد مواد مغرب کے کارخانے سے ڈھل کر ساری دنیا میں تباہی و بربادی برپا کر رہا ہے اور آئندہ نسل کے ذہن میں بارود بھر رہا ہے جو کارٹون فلمیں تشدد کو ہوا نہیں دیتیں ان کے بھی دو مضر اثرات ہوتے ہیں ایک تو بچہ جسمانی محنت و مشقت سے محروم کر دیا جاتا نتیجے میں وہ پھول تو جاتا ہے لیکن مضبوط نہیں ہوتا لیکن اس سے بھی بڑا نقصان فکری سطح پر ہوتا ہے یہ مغرب میں بننے والی کارٹون فلمیں اکثر و بیشتر بچوں کو مغربی تہذیب سے مرعوب و مغلوب کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آجکل دیندار اور وضعدار گھروں کے بچوں میں بھی امی، ابو، بھیا، آپا، چاچا، چاچی کے بجائے ڈیڈی، ممی، انکل، آنٹی کی اصطلاحات رائج ہو گئی ہیں جب سے والدین اپنے بچوں سے انگریزی میں بات کرنے کو قابل فخر سمجھنے لگے ہیں بچوں نے اپنی مادری زبان اور آبائی تہذیب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف خاصہ مشکل ہوتا ہے اور اس معاملے میں بچے صدفی صد بے قصور ہیں۔

بچے کی نفسیات نہایت سادہ و آسان ہوتی ہے وہ جو سنتا ہے وہ بولتا ہے اور جو دیکھتا ہے سو کرتا ہے۔ بچے کے سامنے بہترین نمونہ اس کے والدین کا اخلاق و کردار ہوتا ہے وہ انکو جیسا کرتا ہو دیکھتا ہے ویسا ہی خود کرتا ہے اس پر والدین کے پند و نصائح کا کوئی زیادہ اثر نہیں ہوتا لیکن ان کی حرکات و سکنات اس پر غیر معمولی اثرات مرتب کرتی ہے۔ کسی بچہ کے لئے اس بات کو تسلیم کرنا نہایت دشوار ہے کہ جو بات اس کے والدین کے لئے مفید ہے تو اسکے لئے مضر کیونکر ہے گویا والدین کو پہلے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے بچے کو کیسا انسان بنانا چاہتے ہیں اور پھر خود ویسا بننا پڑے گا باقی کام اپنے آپ ہو جائیگا عام طور پر والدین ایک ایسی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں ہوتی مثلاً مجھے اپنے بچے کو ڈاکٹر بنانا ہے یا کرنل بنانا ہے وغیرہ اور روپیوں کے زور سے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کارردارد ہوتا ہے کئی بار خود بچے کے مزاج سے والدین کی توقعات میل نہیں کھاتیں ایسے میں بچہ جو نہیں کر سکتا وہ کرنے کے لئے اسے مجبور کیا جاتا ہے اور جو کچھ کر سکتا ہے اس سے اسے روک دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا ظلم ہے جو ان لوگوں کے ذریعہ کیا جاتا جو اس کے

سب سے بڑے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ ویسے اگر والدین چاہیں تو وہ اپنے بچے کو اچھا انسان بنا سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس اچھائی کو بازار سے خریدا نہیں جا سکتا اس کے لئے ماں باپ کو خود اچھا بننا پڑتا ہے جو خاصہ مشکل کام ہے۔ دوسروں کو اچھا بنانے کی خواہش جس قدر آسان ہے اپنے آپ کو صالح بنانا اسی قدر مشکل کام ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ جن کے والدین صالح نہیں ہوتے ان کی اولاد لازماً بگڑ جاتی ہے لیکن ایسے بچوں کو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اس کے مقابلے اگر والدین خود اپنے آپکو سدھار لیں تو بچوں کے لئے ایک غیر معمولی آسانی فراہم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں والدین کو اپنے گریبان میں جھانک کر اس بات کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہئے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اپنی اولاد کو احسن الخالقین بنانا چاہتے ہیں یا اسفل السافلین؟ اس فیصلے میں خود انکا اپنا مفاد بھی پوشیدہ ہے اس لئے کہ یہ فرشتہ صفت پھول اس دنیا کی زندگی میں بھی اپنے والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لئے راحتِ جاں بن جاتے ہیں بصورتِ دیگر ابلیس صفت کانٹے اس دنیا میں بھی چبھتے ہیں اور آخرت میں بھی عذابِ جاریہ کی وجہ بن سکتے ہیں۔

# جرأتِ انحراف

(یعقوب تصور کی کتاب انحراف پر تاثراتی اظہار خیال)

یعقوب تصور کون ہیں؟ وہ کیسے ہیں؟ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جیسے بھی ہیں ویسے کیوں ہیں؟ اگر آپ ان پیچیدہ سوالات کا جواب جاننا چاہتے ہیں تو تصورِ خیال کو زحمت دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ تو بس یہ کریں کہ یعقوب تصور صاحب کے قطعات کا مجموعہ خریدیں اور اس کا مطالعہ کرلیں ساری تشنگی فی الفور کافور ہوجائیگی۔ میں نے لفظ ''خریدیں'' سہواً نہیں بلکہ قصداً استعمال کیا ہے اس لئے کہ اچھی کتابوں کی اشاعت کے لئے نہ صرف اچھے قلمکار کی بلکہ اچھے خریدار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جب سے اردو قاری میں مفت خوری کی بیماری در آئی ہے اچھی کتابوں کا فقدان بڑھتا جارہا ہے۔ اردو جیسی زرخیز زمین پر قحط سالی کا جو دور دورہ دکھلائی دیتا ہے اس کا بنیادی سبب اچھے فنکاروں کی کمی نہیں بلکہ پروقار قاری کی غیر موجودگی ہے جس کا نتیجہ بقول غالب یہ ہے کہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دوکان اپنی اٹھا گئے

تصور صاحب کے قطعات کا مجموعہ اس عمومی زبوں حالی سے خوشگوار انحراف ہے۔ اگر یقین نہیں آتا ہو تو یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

وفا کی نہج پہ خطرات جب نظر آئے
بہت سے چاہنے والوں نے انحراف کیا
بس اک چراغ شب امتحان گل کر کے
ہوا کی لہر نے کیا کیا نہ انکشاف کیا

ان چار مصرعوں میں کس قدر تنوع ہے کہ ابتدا رومانیت کے پیرائے میں ہوتی ہے اور دوسرے مصرعے میں بات انسانی نفسیات کی جانب گھوم جاتی ہے۔ تیسرا مصرعہ اسلامی تاریخ کا ایک ایسا لازوال واقعہ یاد دلاتا ہے جو اپنے اندر حکمت و تواضع کی لاثانی مثال ہے لیکن آخری مصرعہ اس رویہ کو ماضی کے حصار سے نکال کر عمومیت عطا کر دیتا ہے اور ایک ایسی آفاقی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد ہے۔ شاعر ہمیں ابن آدم کے اس رویہ سے روشناس کرواتا ہے کہ جس کا اظہار کل ہوا تھا آج پھر ہو سکتا ہے اور آنے والے کل میں بھی اس کا امکان بدستور موجود رہے گا۔ اس کے انکشاف کی خاطر کسی بڑی آزمائش کے بجائے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل ایک اور قطعہ دیکھتے چلیں یعقوب صاحب فرماتے ہیں۔

مہر آئے نہ ماہتاب آئے
کاش جگنو ہی وسط خواب آئے
خار آئے جو شاخ ویراں پر
ہے اشارہ کہ بس گلاب آئے

یہ قطعہ شاعر کے اندرون کا تعارف کرواتا ہے اس کے اندر پائی جانے والی شانِ قلندری جو قناعت کی صفت پیدا کرتی ہے اس کی بدولت وہ مہر و ماہ کی توقع نہیں کرتا بلکہ جگنو پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر اگر حقیقی جگنو سے بھی محروم رہ جائے تب بھی مجازی جگنو کا خواب سجاتا ہے اس کے باوجود رجائیت کا یہ عالم کہ وہ پھول کے بجائے خار کے نمودار ہونے پر بھی کسی قسم کے حزن و ملال کا شکار نہیں ہوتا بلکہ پر امید ہو جاتا ہے کہ یہ کانٹا در حقیقت گلاب کے پھول کی آمد کا شاخسانہ ہے۔ میرے خیال میں یہ قطعہ یعقوب تصور کی معرفت ذات کا نمائندہ ہے جس میں حسن و جمال کے ساتھ ساتھ نیرنگئ خیال کی خوشبو اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ اسے پڑھ کر قاری کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔

معرفتِ ذات کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس طرح چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اسی طرح کا معاملہ انسان کا بھی ہے کہ وہ اپنے سر کی آنکھوں سے اپنے خارج کا جہاں تسخیر کرتا رہتا اپنے پرائے سبھی سے دست و گریباں ہوتا ہے لیکن اپنے آپ سے دو بدو نہیں ہوتا۔ زندگی بھر خواہشوں کے ہجوم میں کچھ ایسا کھویا رہتا ہے کہ اسے خود اپنی ذات کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی۔

زندگی کا یہ گھماؤ پھیر اپنے آپ سے

لگ گیا ہے خواہشوں کا ڈھیر اپنے آپ سے

بس یہی حسرت کبھی اتنی تو تنہائی ملے

گفتگو کر لوں ذرا سی دیر اپنے آپ سے

ظاہر بینی کا گناہ بے لذت ناظر کو دوسروں کے متعلق کبھی غلط فہمی تو کبھی خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ویسے اگر غیروں کے بارے میں انسان حقیقت تک پہنچ بھی جائے تب بھی چونکہ ان پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اس لئے اس کی ساری سعی وجد وجہد تعلیم وتلقین کے دائرے میں محصور ہوتی ہے۔ اس باب میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے خالق حقیقی کے سامنے سوائے اپنی ذات کے کسی اور کے لئے جوابدہ نہیں ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ حضرت انسان ان کی فکر زیادہ کرتا ہے جن کے بارے میں وہ مسئول نہیں ہے اور خود اپنے آپ سے غافل رہتا ہے جس پر اسے اختیار عمل حاصل ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہماری ہر حرکت میزان عمل میں رکھی جاتی ہے اور نہ صرف عبادات بلکہ معاملات کی بھی بازپرس ہوتی ہے اس باب میں یعقوب تصور کی تذکیر ملاحظہ فرمائیں۔

ہر تخیل کو عمل بھی چاہئے

قصر بردوش ہوا بنتا نہیں

بندگی کی ہیں شرائط اور بھی

صرف سجدوں سے خدا ملتا نہیں

انسان اگر دنیا کی رنگ رلیوں میں کھو جائے اور خدا کی معرفت کو گنوا بیٹھے تو اسکے نتیجے میں خود فراموشی کے تاریک سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ گمراہی کے اس بحر ظلمات میں اسے خدا کے بجائے بندوں کا خوف ستانے لگتا ہے۔

یوں اندھیرے ہوئے جزو حیات

ہر بشر روشنی سے ڈرتا ہے

اب خدا سے نہ کوئی کھائے خوف

آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

فرد بشر ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا اسے کرب خود آگاہی سے دوچار کر دیتا ہے۔ اوروں کی عیب جوئی انسان کے لئے جس قدر خوش کن مشغلہ ہے اپنی خود احتسابی وعیب شناسی اسی قدر تکلیف دہ تجربہ ہے اس لئے انسان اپنے من کی آنکھیں موند

لیتا ہے اور مادی تشنگی کے تعاقب میں خوابوں کے سراب کا پیچھا کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ بے حسی اسے کس عذاب میں گرفتار کر دیتی ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بے حسی کا عذاب دیکھے جا
بے عمل صرف خواب دیکھے جا
ریت میں فصل تشنگی کی اگا
پھل کی صورت سراب دیکھے جا

اعتراف ذات بجائے خود ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن اظہار ذات کی منزل مشکل تر ہے۔ جہاں لوگ دوسروں کے بارے میں سچ بولنے سے کتراتے ہوں وہاں خود اپنے بارے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا جوئے شیر لانے سے آسان نہیں ہوتا اس کے لئے فنکار کو فرہاد کا تیشہ درکار ہوتا ہے اپنے آپ کو بغیر کسی بناؤ سنگھار کے اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دینا اکثر لوگوں کے لئے خاصہ مشکل ہوتا ہے لیکن یعقوب تصور کا معاملہ ان سے برعکس ہے۔

دل جو روتا ہو تو چہرے پر سجالوں خوشیاں
درد سینے میں سہ ہو آنکھ میں آنسو پالوں
میں مثل تو نہیں ہوں کہ بہ رنگ تمثیل
اپنا کردار کہانی کے مطابق ڈھالوں

انسان چونکہ سماجی مخلوق ہے وہ اپنے خارج سے کسی صورت منقطع نہیں ہوسکتا۔ ہر فرد کے ساتھ پیش آنے والے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر کسی کو غریب الوطنی کا درد نہیں سہنا پڑتا ویسے یہ اس خود ساختہ مصیبت میں انسان اپنے آپ کو برضا و رغبت مبتلا کر لیتا ہے بظاہر کوئی زور زبردستی نہیں ہوتی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو اس پر کیوں آمادہ کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب وہ نہیں دے سکتے جو وطن سے دوری کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے بلکہ یعقوب تصور جیسے لوگ ہی دے سکتے ہیں جو اس امتحان سخت جاں سے گذر چکے ہوتے ہیں۔

ہوا کے دوش پہ آئے شجر کو چھوڑ دیا
فضائے غیر میں آئے نگر کو چھوڑ دیا
تلاش رزق و سکوں، امن کی ضرورت نے
کیا کچھ ایسا پریشان گھر کو چھوڑ دیا

عام طور پر لوگ کن توقعات کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور پھر اس صعوبت میں عمر عزیز کھپا دینے کے بعد کیا پاتے ہیں اس کا بھی نہایت خوبصورت بیان ملاحظہ فرمائیں ۔

تلاش رزق کے ارماں نکالتے گذری
حیات ریت کے سکے ہی ڈھالتے گذری
مسافرت کی صعوبت میں عمر بیت گئی
بچی تو پاؤں سے کانٹے نکالتی گذری

یہ تو اس فرد کا حال ہے جو صحرا نشینی کو اپنا مقدر بنالیتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مساعی بالکل ہی رایگاں جاتی ہوں ۔

لمحہ لمحہ صرف فن تدبیر کیا
سامان تزئین رخ تدبیر کیا
صحراؤں میں عمر ہماری ریت ہوئی
گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیا

یعقوب تصور جیسا رجائیت پسند شاعر اس صورتحال پر ملول و غمگین نہیں ہوتا بلکہ وہ مشیت ایزدی کی اس کارفرمائی پر راضی بہ رضا نظر آتا ہے اور کہتا ہے ۔

نصیب گردش ماہ منیر رکھتے ہیں
دلوں میں ہجر کے پیوست تیر رکھتے ہیں
ہم اس کٹے ہوئے صحرا کی وسعتوں کے اسیر
ہتھیلیوں پہ سفر کی لکیر رکھتے ہیں

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مختلف لوگ جو یکساں حالات سے نبرد آزما ہوتے ہیں یکساں اثرات قبول نہیں کرتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مختلف افراد ایک ہی صورتحال سے متضاد نتائج اخذ کریں حالات و واقعات کے پس پردہ مختلف وجوہات و اسباب کا گمان کرنے لگیں ۔ ایسا ہونا عین قرین قیاس ہے اور اس کی وجہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے علیحدہ طرز فکر ہوتا ہے جو انہیں منفرد طرز زندگی سے ہمکنار کرتا ہے ۔ زندگی کی معرفت اور اس سے منسلک آزمائش کا بیان انحراف میں یوں ہوتا ہے کہ ۔

اس نے تو زندگی کا یہ معیار رکھ دیا
روشن دیا کیا سر دیوار رکھ دیا

بازی گہ جہاں میں کی روشن شمعِ حیات
پھر سرپھری ہوا کا بھی کردار رکھ دیا

ہجرتِ مکانی کو لوگ اپنی ذات اور اپنے حالات کے آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن یعقوب تصور اسے وسعت دے کر ایک ازلی واقعہ سے جوڑ دیتے ہیں جو ان کی وسعت فکر کی غمازی کرتا ہے۔

عرش سے فرش زمین تک کا سفر
عین فطرت تھا فسانہ بن گیا
اپنی منزل تو تصور تھی یہی
دانۂ گندم بہانہ بن گیا

ہجرت اور اس کا فلسفہ جب تصور خیال سے نکل کر حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے تو اپنی مانوس دھرتی سے دور کسی اجنبی دیس میں آن بسنے والا اولاً کیسا محسوس کرتا ہے اس کی منظر نگاری بھی دیکھیں۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس سے وہ تمام لوگ گذر چکے ہیں جنھوں نے ہجرت مکانی کی ہے لیکن کسی شئے کو محسوس کرنا اور بات ہے اور مگر اسے حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دینا جہانِ دیگر ہے۔

چہرہ چہرہ بھانپ رہے ہیں
خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں
اس جنگل میں آن بسے ہیں
جس میں صدیوں سانپ رہے ہیں

کسی نئے ملک میں آنے کے بعد انسان سب سے پہلے وہاں کے آداب و اطوار سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ امن وسکون سے دن کاٹ سکے اور اس کوشش میں جو انکشافات اسے ہوتے ہیں سو یوں ہیں۔

الفاظ کو جذبات کا غماز نہ کرنا
اس شہر کا دستور ہے آواز نہ کرنا
جسکی نہ کوئی قدر ہو بازارِ طلب میں
سکہ کوئی بھی ایسا پس انداز نہ کرنا

ایک عام آدمی کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ حالات سے مصالحت کر کے خود ساختہ طور پر اپنے آپ کو دستورِ زباں بندی پر راضی کر لے اور ان قصیدہ خوانوں کی بھیڑ میں شامل ہو جائے جن پر یہ

قطعہ صادق آتا ہے کہ۔

ہمہ تن گوش ہیں یہاں کے لوگ
پھر بھی خاموش ہیں یہاں کے لوگ
گوش و چشم و زباں تو رکھتے ہیں
مصلحت کوش ہیں یہاں کے لوگ

شہرِ غریباں میں پائے جانے والے مصنوعی امن وامان کا قصیدہ پڑھنے والے مصلحت پسندوں سے یعقوب تصور کیا خوب سوال کرتے ہیں بلکہ سوال بھی ایسا کہ جس میں جواب پنہاں ہو۔

چمن میں اپنی خوشی کا سماں رہے کیسے
حنوط ہوں جو پرندے تو چہچہے کیسے
نظام امن ہے ہر سمت کارفرما اگر
تو ہر درخت سے لپٹے ہیں اژدہے کیسے

اس قطعہ کو کہنے کے لئے ضروری تھا کہ یعقوب صاحب ابوظہبی آتے اس لئے کہ پاکستان میں رہ کر اس کا تصور محال تھا۔ یہ اژدہے اتنی دور تو کیا اپنے آس پاس بھی دکھلائی نہیں دیتے لیکن ہاں ان کی سرسراہٹ ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ اس احساسِ خوف نے شہر کی فضا میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

محبت ہی کسی رخ پر نہ بیزاری نظر آئے
عجب اک کیفیت انسان پر طاری نظر آئے
محض احکام کی تعمیل بے رد و قدح ہر دم
یہ سارا شہر ہی جذبات سے عاری نظر آئے

اس شہر میں رہنے والے سبھی حضرات کو ان حالات سے کبھی کو سابقہ پیش آتا ہے لیکن کم لوگ ہوتے ہیں جو اس پر لب کشائی کی ہمت اپنے اندر پاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان حقائق کا پردہ فاش کرنے والوں کو اس کے ساتھ وابستہ خطرات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔

یہ مانا جھوٹ سے بے زار بھی ہے
صداقت کا اسے اقرار بھی ہے
اگر وہ آئینہ بردار بھی ہے
تو کیا مرنے کو وہ تیار بھی ہے

حق گوئی کی جرأت رندانہ شاعر کے اندر کردار کی یہ خوبی پیدا کرتی ہے کہ بلا خوف خطر اپنے انجام کی پرواہ کئے بغیر سچ بولتا چلا جاتا ہے۔ کسی کا جاہ وجلال اس کی آئینہ برداری کو مرعوب نہیں کر پاتا۔

جرأت کا تقاضہ ہے یہ کردار کی خوبی
اظہار صداقت میں نہ خاموش رہا جائے
پتھر نہ کہا جائے زر وسیم وگہر کو
خشت وخس وخاشاک کو سونا نہ کہا جائے

حق کے لئے سر کٹانے سے پس وپیش نہ کرنا بلکہ اسے اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھنا یعقوب تصور کو اپنے ہم عصروں کے درمیان فائق وممتاز کر دیتا ہے۔

حق وصفا کبھی باطل میں ضم نہیں کرتے
شکست وصدق کے سامان بہم نہیں کرتے
ہمارا سلسلہ کرب وبلا سے ملتا ہے
سو ہم سروں کو کٹاتے ہیں خم نہیں کرتے

وطن عزیز سے دوری کے باوجود یعقوب تصور اپنی دھرتی سے قریب نظر آتا ہے۔ اپنی مٹی سے فاصلے بڑھ بھی جائیں تب بھی اس کی خوشبو انسان کے آس پاس رچی بسی رہتی ہے۔ وہ اپنے ملک کے حالات سے بے بہرہ نہیں ہو پاتا اسی لئے کہتا ہے۔

جیسے ہی باہر گیا گھبرا کے اندر آگیا
خوف کا طوفان کیسا یہ نگر میں آگیا
سمجھو اس کو مل گئی اک اور دن کی زندگی
جو پرندہ شام سے پہلے شجر میں آگیا

مندرجہ بالا قطعہ میں جس بے یقینی کا اظہار کیا گیا ہے اس کا احساس کراچی میں نہایت سہل ہے لیکن یعقوب تصور اسے بڑی آسانی سے ابوظہبی کے اندر محسوس کرتے ہیں۔ ملک وملت کی اس دگرگوں حالت کے اسباب اگر آپ یعقوب تصور سے جاننا چاہتے ہیں تو سنئے۔

طے مسافت زیست کی کرنا کڑی اک شرط ہے
حاصل منزل سفر تو ہے، سفر کیسے کریں

رہبروں میں راستے کے علم کا فقدان ہے
رہزنوں کو کارواں کا راہبر کیسے کریں

یعقوب صاحب جیسے لوگوں نے تو راہبر اور راہزن میں فرق کر کے اپنے آپ کو باز رکھا لیکن بھولے بھالے عوام اپنے تئیں یہ تفریق نہیں کر پاتے اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں ایسے میں ذرائع ابلاغ مونس و غمخوار بن کر آگے آتے ہیں اور جور و استبداد کو اس قدر خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں کہ عوام و خواص دونوں اس طوقِ سلاسل کو اپنے گلے کا ہار سمجھنے لگتے ہیں۔

خبر ہوتی نہیں ہرگز کسی کو
یہ استبداد کا انداز کیا ہے
وہی جانے جو اس محشر سے گزرے
شکستِ قلب کی آواز کیا ہے

ملک و قوم کی رہنمائی اگر رہزنوں کے ہاتھ آجائے اور اگر یہ سلسلہ طویل ہو جائے تو اک گونہ بے حسی چہار جانب چھا جاتی ہے اور عوام مظالم کے اس قدر خوگر ہو جاتے ہیں کہ سماج سے ظالم و مظلوم کی تمیز مٹ جاتی ہے اور شاعر کو یہ کہنا پڑتا ہے۔

اب یہ معاشرہ کسی قابل نہیں رہا
منصف نہیں رہا کوئی عادل نہیں رہا
جو ظلم سہہ رہا ہے وہ مظلوم اب نہیں
جو قتل کر رہا ہے وہ قاتل نہیں رہا

اس سنگین صورتحال کے باوجود انحراف کے قطعات میں نہ ہی خوف اور نہ مایوسی نظر آتی ہے بلکہ اس کے برعکس امید اور حوصلہ کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر موجزن دکھلائی دیتا ہے۔ اس لئے شاعر شکوہ شکایت کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اس کے پاس غمِ دنیا کا ماتم کرنے کے لئے فرصت نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اپنے قاری کو فطرت کے مظاہر کی عکاسی کر کے روشن مستقبل کا یقین دلاتا ہے۔

آکے ہر صبح یہ دیتا ہے دلاسے سورج
ہے اندھیروں کے تعاقب میں سدا سے سورج
روشنی ہوگی ہر اک سمت یقیں ہے لیکن
سر نکالے ذرا بادل کی ردا سے سورج

یہی مثبت سوچ اور رجائیت پسندی انحراف کی روح ہے جسے الفاظ کے نہایت خوشنما پیراہن میں یعقوب تصور صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ یہ ان کا اپنا حصہ بلکہ خاصہ ہے۔ میں امید کے ان روشن چراغوں کو سلام کرتا ہوں جو شریر ہوا کے جھونکوں سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور جب ہوا ان کی جانب ہاتھ بڑھاتی ہے تو روشنی تیز تر ہو جاتی ہے۔

آئینہ برسرِ حیات رکھا
عکسِ مخفی درونِ ذات رکھا
روشنی اور بڑھ گئی اس کی
جب ہوا نے دیئے پہ ہاتھ رکھا

ہم دعا کرتے ہیں کہ ان چراغوں کی روشنی سے ظلمات کے اندھیرے دور ہوں تیز در بدر کی ٹھوکر کھانے والے انسانی قافلے کو اس کے ذریعہ راہ ہدایت کا سراغ ملے۔ یعقوب تصور صاحب جس طرح اپنے آپ سے پر امید ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے مستقبل میں اسی طرح کے بہترین امکانات کی توقع رکھتے ہیں۔

مصائب جھیلنے سے میں نہیں ڈرتا محبت میں
جوان عزم مصمم ہے بدن میں جان باقی ہے
بہت کچھ کر چکا ہوں میں تصور زندگانی میں
بہت کچھ کر گزرنے کا ابھی امکان باقی ہے

# احسانِ غزل اصل میں عرفانِ غزل ہے

ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی معرفت، رومانیت اور علامت کی منفرد آواز ہے اگر یقین نہ آتا ہوتو انکی نئی کتاب ''ترا احسان غزل ہے'' دیکھیں۔ عرفان اگر اعلیٰ وارفع نہ ہوتو وہ معرفت کہلانے کا حقدار نہیں ہوتا اور اگر رومانیت سے لطافت نکل جائے تو وہ مختلف قسم کی کثافتوں سے آلودہ ہوجاتی ہے۔ علامت وتمثیل کا مقصد ہی سہل نگاری ہے اگر وہ افہام کے بجائے ابہام کا سبب بن جائے تو اپنی افادیت کھودیتی ہے۔ عاصم واسطی کی شاعری میں ان تینوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ کسی ایک تحریر میں تینوں اوصاف کا احاطہ طوالت کا باعث ہوجائیگا اس لئے اس بار میں اپنے موضوع کو معرفت کے دائرے میں محدود رکھوں گا۔ اپنی بات کے آغاز کے لئے میں نے اس غزل کا انتخاب کیا جسکو عاصم صاحب نے کتاب کے اختتام پر رکھا، یہ غزل بھی ہے اور دعا بھی ہے۔ حسنِ ترتیب کا تقاضہ ہے کہ ابتداء حمد سے ہو اور اسکے بعد نعتیہ اشعار ہوں [عاصم بھائی کے لئے حمد ونعت بھی غزل کے پیراہن میں الہام ہوتی ہے] لیکن خاتمہ بہر حال دعا پر ہو کہ اس میں شکر وطلب دونوں موجود ہوتا ہے۔ دعا کون نہیں کرتا؟ لیکن سبھی کی دعا یکساں نہیں ہوتی اور اس فرق کی وجہ طالب ومطلوب کے درمیان پایا جانے والا تعلق ہے دراصل یہی تعلق معرفت کی سنگِ بنیاد ہے عاصم کا اپنے رب سے تعلق ملاحظہ فرمائیں۔

بے ارادہ بھی کوئی حرفِ دعا یاد آجائے
کوئی تکلیف نہ ہو اور خدا یاد آجائے

اردو غزل کا دامن غمِ جاناں کے پہلو بہ پہلو غمِ دوراں سے تار تار ہے لیکن اس نیرنگی کے باوجود محبوب کے خانے میں مجازی بت کے علاوہ کسی اور کا گذر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے حالانکہ جب تک

عشق مجازی کی جگہ عشقِ حقیقی مزین نہ ہو حسن کی احسان کے مقامِ بلند و بالا تک رسائی ممکن نہیں ہے اس مرحلہ میں شاعر خالقِ نطق و بیان کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے شکر و نیاز مندی سے جھک جاتا ہے اس کی نگاہِ بلند اپنے معبود کی حقانیت و رحمانیت کی جانب سے جب پلٹ کر واپس آتی ہے تو اسے اپنے گریبان کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا وہ اس میں جھانک کر دیکھتا ہے اور اپنے گناہوں پر کچھ اسطرح شرمسار ہوتا ہے۔

یوں بھی ہو، یوں ہی خیال آئے کہ رحمٰن ہے تو
اور پھر کوئی گناہ کوئی خطا یاد آجائے

عاصم واسطی کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو کہ جس میں وہ خدا سے یکسر غافل ہو، کسی نہ کسی بہانے، بلواسطہ یا بلاواسطہ اپنے رب کو یاد نہ کرے اور جس میں ربِّ ذوالجلال کی تعریف و توصیف بیان نہ ہو لیکن عاصم کی غزلوں میں جہاں ایک طرف خدا کی ذاتِ والاصفات موجود و مشہود ہے وہیں کسی نہ کسی کونے اس کا معصوم سایہ بندہ بھی حاضر و شاہد ہے۔ نہ تنہا خدا ہے اور نہ بندہ تنہا ہے یہی غزل کا امتیاز ہے جس میں عاشق و معشوق دور ہوں یا پاس ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ بلندیٔ افکار کے ساتھ اندازِ بیان اور لب و لہجہ نے عاصم واسطی کی غزلوں کے حسن کو احسان کے درجہ پر فائز کر دیا ہے عاصم کی شاعری میں محبوب کی جگہ معبود کا وجود بہت نمایاں ہے تقریباً ہر غزل میں ذکرِ الٰہی کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص ہمیشہ اپنے رب کی معیت میں رہتا ہے اسے یاد کرتا ہے اسے یاد رکھتا اور انتظارِ دید سے محظوظ ہوتا رہتا ہے اگر یہ کیفیت نہ ہو تو ممکن نہیں کہ یہ شعر ہو جائے۔

بتا کتنے برس کا فاصلہ ہے؟
مری آنکھوں سے تیری روشنی تک

آگے چل کر عاصم واسطی کی خود کلامی ملاحظہ فرمائیں کہتے ہیں ''تیرے ہر اک گمان سے ہے ما وراء خدا''، لیکن اک حدیثِ قدسی میں یہ بھی ہے کہ ''میں اپنے بندے کے گمان و خیال کے ساتھ ہوں۔ جیسا بھی وہ میرے ساتھ گمان رکھے'' عاصم چونکہ ہر ہر موقع پر خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اس لئے موقع اور محل کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے متعلق نت نئے گمان نت نیا خیال کلامِ سخن میں جھلکتا رہتا ہے۔ خدائے واحد کے یہ دھنک رنگ خیال ایسے منفرد اور انوکھے کہ بس خدا جیسے۔ ان کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن چھو کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ رعنائی خیال کی ندرت ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ایسا لگتا ہے گویا ہر لمحہ عاشق اپنے محبوبِ حقیقی کے ساتھ ہے ان دونوں کے درمیان فاصلے کی چلمن اٹھ چکی ہے قربت کا اندازہ لگائے

کے لئے اس شعر میں ''تھپک تھپک'' کے اندر پائی جانے والی محبت وشفقت پر توجہ دیں ۔

ہر اک تڑپ کو سلایا تھپک تھپک اس نے
ہر اضطراب کے اندر قرار اُس کا ہے

احسان غزل کی اس حمدیہ غزل میں تڑپ واضطراب کے شانہ بشانہ قرار بھی ہے بندے کا اضطراب اور آقا کا قرار جب یکجا ہوتے ہیں تو ایسا شعر اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ حدیث کا اگلا حصہ یوں ہے کہ" میں اسکے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے"۔ انسان اگر اس سعادت کا اندازہ کرلے کہ وہ کس کے ساتھ ہوتا جب وہ اسے یاد کرتا ہے تو پھر وہ ہر کسی کی یاد اور ساتھ سے بے نیاز ہو جائے وہ اس دنیائے فانی میں سود وزیاں کے جھگڑے سے آزاد ہو جائے جیسا کہ عاصم کہتا ہے ۔

ہے آسماں کے خزانوں پہ اب نظر میری
زمین کا تو بہت مال وزر سمیٹ لیا

حدیث آگے بڑھتی ہے'' جب وہ مجھے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے آپ میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی اجتماع یا محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر ایک ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے۔'' اس حدیثِ پاک کی روشنی میں جب میں سوچتا ہوں کہ اگر کسی انسان پر'' الہام کے مالک کا احسان غزل'' ہو اور وہ شخص اعتراف نعمت سے سر بسجود ہو شکر کے جذبات سے سرشار اپنے اشعار میں رحمان ورحیم کا ذکر تنہائی میں اور محفلوں میں یوں کرتا ہو کہ ۔

کسی کو اٹھ کے یہاں سے کہیں نہیں جانا
سجی ہے بزم کہ موضوعِ گفتگو تو ہے

تو ربِّ کریم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا وہ یقیناً اسے یاد کرے گا، لیکن کیسے؟ اس کا گمان ہم نہیں کر سکتے لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ صدقِ دل سے اشعار کے پیرائے میں اپنے رب کو یاد کرنے والے کو اس کا رب بھی اشعار میں یاد کرتا ہو گا اور جب عاصم ہماری محفل میں مالک الملک کو یاد کرتے ہیں تو ربِّ ذوالجلال بھی بہترین محفلوں میں ان کا ذکر اچھے اچھے اشعار میں کرتا ہو گا کاش کے ایسی کسی محفل میں شریک ہونے کا موقع خالقِ کائنات ہمیں بھی عطا فرمائے ۔۔ آمین

مندرجہ بالا شعر میں'' تو'' کے حوالے سے اگر کسی کے ذہن میں کوئی خلجان ہو تو وہ غزل کا مطلع دیکھ کر اطمینان کرلے ۔

کہاں تلاش میں جاوں کہ جستجو تو ہے

کہیں نہیں ہے، یہاں اور چارسو تو ہے

جولوگ عاصم واسطی کو نہیں جانتے وہ سوچ رہے ہونگے کہ یہ کسی صوفی سنت کا ذکر ہورہا ہے جو کسی جنگل بیابان میں دھنی رمائے ہوئے ہے جی نہیں وہ بھی ہمارے آپ کی طرح ہنسنے بولنے والا ایک عام سا آدمی ہے لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کی مصداق وہ دنیا کے اندر ضرور رہتا ہے دنیا اسکے اندر نہیں رہتی اس لئے کہ یہ پانی جس جہاز میں داخل ہوجاتا ہے اسے لے ڈوبتا ہے لیکن بہر حال کشتی کا مقصدِ وجود پانی میں تیرنا ہے اسی لئے تمام تر خطرات کا ادراک کرتے ہوئے عاصم پانی میں قدم رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

جابر مچھلی، تند بھنور، سفاک مگر مچھ، گہرائی

سب معلوم تھا پھر بھی ہم نے پاوں رکھا ہے پانی میں

حیاتِ دنیا اس طرح کی آزمائشوں میں گھری ہوئی ہے کہ جب دنیا کا ادنٰی پانی دل کے نہاں خانے میں داخل ہوجاتا ہے تو اعلٰی وارفع لاشریک کی یاد وہاں سے نکل جاتی ہے فرمانِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ایسا دل کسی کھنڈر کی مانند ہوجاتا ہے اور سمندر کی تہہ میں اترنا اس تاریک و ویران جہاز کے لئے مقدر کردیا جاتا ہے۔ ایسے میں کشتئ دل کے لئے حفظ وامان کا سب سے مضبوط حصار یادِ الٰہی ہے اسی لئے عاصم کہتا ہے۔

اسی کے ہاتھ ہے ساری حفاظتوں کا نظام

کسی بھی اور کو اپنا حصار مت کرنا

انسان اس قدر ظاہر بین اور خود سر واقع ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں سے جن چیزوں کو نہیں دیکھ پاتا ان کے وجود کا انکار کردیتا ہے حالانکہ یہ ایک عام حقیقت ہے کہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں ان سے کہیں زیادہ ایسی چیزیں ہمارے آس پاس موجود تو ہوتی ہیں مگر ہماری نگاہ سے اوجھل ہوتی ہیں ڈاکٹر حضرات آلات کی مدد سے چند پوشیدہ اشیاء کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن آلات کی بھی اپنی محدودیت ہے، شاعر اپنے چشمِ تصور سے ظاہر کا پردہ اٹھا کر باطن کی معرفت حاصل کرلیتا ہے اگرچہ کے اسکے پاس روشن دل ہو۔ ڈاکٹر روح پر پڑی جسم کی چادر کو دیکھتے ہیں اور شاعر روح میں لپٹے ہوئے جسم کا مشاہدہ کرتا ہے انسان پر یہ حقیقت اس وقت بھی نہیں کھلتی جب موت کی آندھی اس روحانی چادر کو اڑا لے جاتی ہے اور ہیرے موتی کی طرح چمکنے والی روشن آنکھیں چشمِ

زدن میں پتھرا جاتی ہیں۔غیر محسوس روحانی قبا کا ادراک ڈاکٹر عاصم واسطی کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔

اوڑھ لیتا ہے بدن روح کی چادر عاصم
اور ہوتی ہے مرے تن پہ قبارات کے وقت

خدا ہر وقت ہر جگہ موجود تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا معرفت کی حقیقت اسکے سوا کچھ اور نہیں کہ انسان ہر وقت خدائے برحق کو اپنے ہمراہ محسوس کرے ہر دکھ سکھ میں اس کی آہٹ کو سنے کچھ مل جانے پر یا کھو جانے کی صورت میں اسکو اپنے آس پاس پائے بظاہر یہ سب مشکل نظر آتا ہے لیکن جو شخص ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال ہو جس کا دل زندہ ہو ضمیر روشن ہو اس کے لئے تاریکیوں کے سارے بادل چھٹ جاتے ہیں اور وہ اعتماد کے ساتھ کہتا ہے۔

اس قدر اپنے خدا پر ہے بھروسہ مجھ کو
جب ضرورت کوئی ہوگی وہ مدد کر دے گا

مادیت کا شکار ذہن معرفت کو اپنی ضرورت نہیں سمجھتا حالانکہ انسان کی سب پہلی ضرورت اور سب سے بڑی سعادت ،معرفت ہی ہے اس اولین ضرورت کو بھی وہی مہیا کرتا ہے جو انسان کی ساری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اس لئے عاصم اس ضرورت کے لئے بھی یکسو ہو کر اسی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

وہ جو کرے سو کرے اختیار اسی کا ہے
مری تو نوکری ہے کاروبار اسی کا ہے

شاعری بھی انسان کی طرح جسم وروح کا مرکب ہے شاعری کا جسم حسن بیان ہے اور روح حسن خیال ہے اگر بیان میں غنائیت ورعنائی موجود نہ ہو تو اشعار بدصورت ہو جاتے ہیں اور اگر خیال سے نزاکت وگہرائی ندارد ہو جائے تو شعر بے جان ہو جاتا ہے جسمانی اعضاء کی طرح الفاظ کا توازن شعر کا حسن ہے اور روح کی مانند خیال کی گہرائی وگیرائی اشعار کا عروج ہے اچھا شعر ان دو پہلوؤں کے درمیان ایک حسین امتزاج وتوازن سے جنم لیتا ہے مثلاً

دل اور مرے خون کا دوران غزل ہے
ہر سانس توازن ہے کہ میزان غزل ہے

شعر وشاعری کے بازار حسن میں لب ورخسار کا چرچا تو خوب پایا جاتا ہے لیکن فکر وخیال کی

جدت وندرت کم ہی دکھائی دیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک کون ومکاں نے اس کائنات ہستی کو حضرتِ انسان کے لئے مسخر کردیا ہے اس لئے جب کوئی فنکار اپنے افکار وادراک کی پرواز کو کائنات کے حصار میں محدود کرلیتا ہے تو لازماً تنگیٔ دامانی کے کرب میں مبتلا ہوجاتا ہے بقول عاصم ؎

پھیلا ہوا ہے مرے ادراک سے پیدا
وسعت مرے اندر ہے سمندر میں نہیں ہے

وسعتِ فکر تو لامحدود جستجو کا تقاضہ کرتی ہے جو انسان کی حدِ پرواز سے پرے ہو اور جسکی خاطر فنکار بلند سے بلند تر منزلوں کو سر کرتا چلا جائے اسکے ارتقاء کا سفر کبھی بھی ختم نہ ہو اور اس کے تکمیل فن کی پیاس سے کبھی بھی نہ بجھے اس حقیقت کا اعتراف اس شعر میں دیکھیں ؎

صدیوں سے ہو رہا ہے مرا ارتقاء مگر
اپنی نظر میں اب بھی مکمل نہیں ہوں میں

دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے نامکمل ہونے پر عاصم نہ پریشان ہے اور نہ پشیمان بلکہ وہ اس کیفیت کو اپنے لئے غنیمت جانتا ہے اور کہتا ہے ؎

جستجو، شوق، لگن، عشق، تجسس، محنت
مجھ میں کچھ بھی نہ رہیگا مری تکمیل کے بعد

بفضلِ تعالیٰ ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی بڑے زور وشور کیساتھ اپنی ذات وفن کی تکمیل کی جانب رواں دواں ہیں زور تو اشعار کے اندر ہے اور شور ہے سو باہر سنائی دیتا ہے وہ اپنی انتہاؤں سے بے نیاز نہایت سکون واطمینان کے ساتھ محوِ سفر ہیں اس کے لئے انہوں نے برضا ورغبت اپنی سواری کی باگیں کسی اور کے حوالے کر رکھی ہیں اور اپنے اس فیصلے پر نازاں وفرحاں، مالک وپروردگار پر کامل توکل کا اظہار کرتے ہوئے وہ چلے جارہے ہیں۔ عاصم بھائی کے پہلے شعر میں اقبال کا رنگ تھا اور اولین مجموعہ میں فیض کا آہنگ دوسرا مجموعہ جسے میں دیکھ نہ سکا ہوسکتا ہے فراز کا سا ہو لیکن یہ تیسری کتاب یقیناً خالصتاً عاصم واسطی کی اپنی انفرادیت کی حامل ہے اسے پڑھتے ہوئے کسی شاعر کا خیال نہیں آتا "ترا احسان غزل" میں صرف اور صرف عاصم واسطی کی چھاپ ہے ایک ایسی منفرد پہچان کہ نہ وہ کسی کے جیسے اور نہ کوئی ان جیسا خود ان کے اپنے الفاظ میں ؎

ویسے تو کئی اور تعارف بھی ہیں عاصم
ہر بزم میں اب میری پہچان غزل ہے

ڈاکٹر سلیم خان کی دیگر تصانیف